

پتوں، جھاڑیوں، جنگلی بیلوں اور گھاس پھوس میں اپنی روپوشی شکل بھرتی ہوئی نمایاں ہوتی تھی۔ میں نے طلوع آفتاب کا ایک منظر ہرات میں، ملکہ گوہر شاد کے مقبرے سے پرے ایک ٹیلے پر ایک چری جرمن سیاح کے پہلو میں بیٹھے دیکھا تھا جب شعاعوں کے تیرہم پر سے شاں شاں کرتے گزرتے تھے۔ اور اب اسی۔ کسی عام فرد کے تجربے میں نہ آنے والی اسی کیفیت کو یہاں برج کے ایک جنگل میں اپنے آپ پر وارد ہوتے محسوس کر رہا تھا۔

جب وہ پورے کا پورا جنگل عیاں ہو گیا۔ دُھند کا لہادہ اٹھ گیا اور وہ عریاں ہو گیا۔ تو اس کا سرریزہ وریزہ ہو گیا۔

چونکہ میں بھی اب تک اس سفید پوشیدگی میں تھا اس لیے دھوپ نے مجھے بھی برہنہ کر دیا اور بے آرام کر دیا۔

اب یہ محض ایک اور جنگل تھا۔

اور میں محض ایک اور انسان۔

اب یہاں نہ کوئی ونڈر لینڈ تھی اور نہ کوئی سنڈریلا۔

چراگاہ کی جانب سے پورٹروں کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ جاگ چکے تھے اور ناشتہ تیار کرنے کے لیے جنگل میں سے لکڑیاں جمع کرنے کے لیے آرہے تھے۔

ہوں۔ بھٹکتا ہوں۔ ٹھوکریں کھاتا ہوں۔ کہ ہر سو دُھند راج کرتی ہے۔ اس کی شناخت چھین لیتی ہے۔ میں فارغ ہو کر اگلے قدموں خیمہ گاہ میں واپس بھی آ سکتا تھا لیکن یوں بھٹکتا۔ ایک بھید بھرے جنگل میں ٹھوکریں کھاتا مجھے اچھا لگ رہا تھا۔ نیند رخصت ہو چکی تھی۔ آنکھیں کھلی تھیں لیکن ان کے سامنے دُھند کی سفیدی کے سوا کچھ نہ تھا۔ ہاں کبھی کوئی ٹہنی۔ ایک شاخ ایک شجر۔ اور پھر دُھند کے حرکت کرتے سفید لہاوے۔

البتہ ایک غلطی ہو گئی تھی۔ میں اپنے تئیں صرف چند لمحوں کے لیے خیمے سے باہر آ یا تھا تاکہ اپنے آپ کو ہلکا کروں اور واپس چلا جاؤں۔ اور صرف ایک سو میٹر میں آ یا تھا چنانچہ اب میں ٹھٹھرتا تھا۔ درہ و طرز سے اترتی تمام ہوائیں اسی وادی میں شوکتی اترتی تھیں اور یہاں اپنے سامنے برج کا ایک گھٹا جنگل پا کر الجھ الجھ جاتی تھیں جیسے موسم بہار میں مرغان چمن کے پاؤں پھولوں میں الجھ الجھ جاتے ہیں۔ اس رکاوٹ کے باوجود سردی اپنا نیلا منجمد رنگ دکھاتی تھی اور میں ٹھٹھرتا تھا۔

میں نے کچھ دیر اپنے آپ کو ہنری مور کے شاہکار مجسمے ”دی ٹھنڈ“ کے سائل میں ایک ٹیلے پر براہمان ہونا چاہا۔ کچھ سوچ بچار میں گم ہونا چاہا لیکن گھاس بھی اتنی بخت تھی کہ اس پر بیٹھے رہنا برداشت میں نہ آتا تھا۔ اس نے لمحوں میں میری نشست خاص کو بھیرہ منجمد شمالی کر دیا اور میں اسے سہلاتا ہوا پھر سے جنگل میں بھٹکنے لگا۔

دُھند کی سفیدی اب گھٹتی جاتی تھی۔ اس کا گھٹنا پن چھدر اور ہلکا ہونے لگا تھا جیسے گاڑھی نسی میں پانی ملانے سے اس کی کھنی سفیدی ہلکی ہونے لگتی ہے۔ وہی کے ڈرے الگ الگ دکھائی دینے لگتے ہیں۔ یہ اس لیے ہو رہا تھا کہ دُھند کی رخصتی کا لمحہ آن پہنچا تھا۔ اور سویر ہونے کو تھی۔

برف کے اندھے کنویں میں گرنے والے پانی کے مرغولے روشن ہونے کو تھے۔ گھاس کے ٹکڑوں میں کہیں کہیں جو اکا دکا پھول پوشیدہ تھے ان کے رنگ نظر آنے لگے تھے۔ دُھند اگلے قدموں لوٹ رہی تھی۔ جنگل کو خالی کر رہی تھی۔

اور میں نہیں جانتا کہ وہ کونسا لمحہ تھا جب سورج کی پہلی شعاعیں برج کے اس سفید جنگل میں نقب لگا کر داخل ہوئیں اور دُھند کو چیرتی ہر بونے ہر شاخ اور ہر ٹہنی کو منور کرتی چلی گئیں۔

یہ ایک معجزہ نما تبدیلی تھی۔ کرنوں کے زرد برچھوں کے آگے دُھند کی سفید کشیدگی اور تاریکی ہتھیار ڈالتی جاتی تھی اور دھوپ غالب آتی جاتی تھی۔

دھوپ ہر شجر کے پہلو میں سے ہو کر نکلتی تھی۔

ہیں یا اس صنم کے سچے چہرہ ہیں۔۔۔
 دراصل بے لہاسی ہی سرمد منصور کا لباس ہوتی ہے۔ جب عریانی اصل ہو جاتی ہے اور
 اس کو ڈھکنے والا پیراہن دکھاوا ہو جاتا ہے۔۔۔
 عشق محض پوشیدگی سے مکمل نہیں ہوتا جب تک کہ عریانی اس کا امتحان نہ لے۔۔۔ میں نے
 اس جنگل کو آج سویرے پردہ پوش دیکھا تھا اور اب اسے برہنہ دیکھ رہا تھا تو اس کے باوجود اس
 کے سحر میں کمی نہ ہوئی تھی۔۔۔ بلکہ اس کی کشش بڑھ گئی تھی اس لیے کہ میں ہوس گزیدہ نہ تھا۔۔۔
 ہم اپنی خیمہ گاہ ٹرخ پتھر سے رخصت ہو چکے تھے۔ شیخ بابا کے جھونپڑے کے برابر میں
 سے گزر کر برج کے ایک اور جنگل میں داخل ہو چکے تھے اور خوش تھے کہ یہ آخری دن ان جنگلوں کی
 چھاؤں چھاؤں گزر جائے گا۔۔۔

تقریباً دو گھنٹے کی مسافت کے بعد برج کی چھدری چھاؤں میں۔۔۔ ایسے منج بھی تھے جو
 گھنے اور پُر فریب تھے۔۔۔ تالاب تھے۔۔۔ چھوٹی ندیاں تھیں اور چڑیاں اڑان کرتی تھیں۔ ہم جنگل کے
 کناروں تک آئے جن کے نیچے پھورا نالہ بہتا تھا۔ شور کرتا تھا۔۔۔ جھاگ اڑاتا تھا۔ ایک گلڈ ڈی
 نیچے پانیوں اور پتھروں تک جاتی تھی۔ ہم احتیاط سے اترتے نالے تک پہنچے جس پر ایک پل تھا۔۔۔
 خوش نصیبی تھی کہ یہ ایک محفوظ پل تھا لیکن جب ہم اس کے پار گئے تو گویا خوش نصیبی پل پر ہی رہ گئی
 کہ اس کے پار ایک نہایت تنگ اور بھری اونچائی شروع ہو رہی تھی۔ اور اس کے تیور اچھے نہیں
 تھے۔ ہمیں اس مقام کی اس چڑھائی کے بارے میں گلگت میں ہی خبردار کر دیا گیا تھا کہ یہاں تو بے
 تائب ہو کر قدم رکھنے گا۔ یعنی ہو سکتا ہے یہ آپ کا آخری سفر ہو۔۔۔

دوسرے کنارے پر کوئی کنارہ نہ تھا۔

محض کنارے کا ایک اشارہ تھا۔

ہم پار ہو کر اس کے نیچے کھڑے ہو گئے اور منہ اٹھا کر اسے دیکھنے لگے۔ اس پر ایک
 راستے کے نشان تو تھے لیکن مجھے یقین تھا کہ اسے آج تک کسی بکری نے بھی پار نہیں کیا ہوگا۔
 میں نے اپنے آپ کو خوب بڑا بھلا کہا کہ شریف آدمی کچھلی شب تم نے ضرور یہ بڑھ
 مارنی تھی کہ اس ٹریک میں تسلی نہ ہوئی۔ قربت مرگ کے کوئی واضح آثار پیدا نہیں ہوئے۔ اب
 کرلو تسلی۔۔۔

”میاں صاحب۔۔۔“ میں نے فرزند علی کو پکارا جو اس راستے کو دیکھ کر بار بار اپنی ٹینک

”جنگل کے پار ایک اور جنگل اور پیاس بھرا ایک خشک صحرا۔“

ایک اور جنگل تھا۔

جنگل کے پار ایک اور جنگل تھا۔

لیکن یہاں ہر شے عیاں تھی۔ کوئی بھید کوئی پوشیدگی نہ تھی۔

ہم اپنے پہاڑوں کے سفر کے آخری دن میں تھے۔

آج کی شب کے بعد ہم نے پھر پانچ ہو جانا تھا۔ جیپوں۔۔۔ کاروں۔۔۔ موٹر سائیکلوں اور
 سائیکلوں پر زندگی گزارنی تھی۔ اگر چلنا بھی تھا تو مجبوراً چلنا تھا خوشی سے نہیں چلنا تھا۔

ہم اپنی آخری منزل پھورا گاؤں کی جانب سفر کرتے تھے۔

اگرچہ اس لمحے ہم نہیں جانتے تھے کہ آج کا سفر کتنا طویل کتنا پیاس بھرا اور بدنی

اذیت سے بھرپور ہوگا۔

ہم اپنی خیمہ گاہ سے۔۔۔ رخصت ہو چکے تھے اور پھر سے ایک اور جنگل میں آ گئے تھے۔

بے شک اس جنگل میں کوئی بھید نہ تھا لیکن اس کے باوجود وہ مجھے اس عریانی میں بھی

اپنے آپ پر فریفتہ کرتا تھا۔

ایک مفروضہ ہے کہ خُسن اور کشش صرف پردہ پوشی اور پوشیدگی میں ہے۔ عریانی

اور بے لہاسی میں یہ سب کچھ زائل ہو جاتا ہے۔

لیکن ایسا صرف وہ کہتے ہیں جنہوں نے محض ہوس میں مبتلا ہو کر پوشیدگی کو دیکھا

ہوتا ہے۔

عریانی اور بے لہاسی ہی تو آپ کا امتحان ہوتی ہے۔ کہ آپ محض ایک ہوس گزیدہ شخص

اتارنا تھا اور اسے چند حیا کی ہوئی آنکھوں سے چیک کرتا تھا ”اپنی روح میں بالیدگی پیدا کر لیجیے۔“
”میں نے جناب عالی جھک ماری تھی۔“ میاں مذاق کے موڈ میں نہ تھا ”آپ نے ضرور یاد دلانا تھا۔“

اس راستے کو بھی کسی برا الذہور یا پر معلق ہی سمجھ لیجیے۔ صرف اس فرق کے ساتھ وہاں آپ گرتے ہیں تو ذرا دیر کے بعد پانی میں گرتے ہیں اور یہاں آپ پھسلنے ہیں تو فوراً ہی کچھورا نالے کے پانی آپ کو قبول کر لیتے ہیں۔

پہلے تو متعدد ہاتھوں نے ہمیں کنارے سے گھسیٹ کر اوپر راستے پر ڈھیر کیا۔ جب ہم اٹھے تو اٹھنا نہ گیا۔ ہم نے پھر مدد کے لیے ہاتھ کھڑے کر دیے۔ کیونکہ اٹھتے تھے تو پکرا جاتے تھے۔ پورٹروں کے ہاتھ تمام کر۔ ان کے بدنوں پر بوجھ ہوتے۔ ایک دوسرے کے سہارے لیتے۔ تھوک نکتے۔ ناگوں میں سے جان کب کی زائل ہو چکی تھی۔ انہیں گھسیٹتے۔ گرتے پڑتے۔ پکھورا نالے کے پانیوں سے نظریں چراتے اور دل ہی دل میں ان سے درخواست گزارتے کہ بڑے بھائی ہمیں یاد نہ کر لینا۔ اپنے پاس نہ بلا لینا۔ اور جب اس راستے کا یکدم اختتام ہوا تو ہم ظاہر ہے حیران ہوئے کہ آگے تو ایک عرش مقام بلند ہے تو ہم نے اب کہاں جانا ہے۔ لیکن ہم نے انہی بلند یوں پر فائز ہونا تھا۔ اسی عرش تک پہنچنا تھا جہاں غالباً فرشتوں کے پر بھی جل سکتے تھے لیکن ہمارے پورٹرایے باکمال تھے کہ وہ وہاں پہنچ رہے تھے اور ان کا کچھ بھی نہیں جلاتھا۔

عرش پر پہنچتے ہوئے پورٹروں نے جب ہمیں نیچے فرش پر دیکھا تو جان گئے کہ ہم کوئی ایسی پاکیزہ ارواح نہیں ہیں کہ وہاں تک پہنچ پائیں چنانچہ ان میں سے کچھ نیچے اترے۔ ایک زنجیر بنائی اور پھر باری باری ہمارے ہاتھ پکڑ کر ہمیں بے جان بوریوں کی مانند گھسیٹتے ہوئے اوپر لے گئے۔ لیکن وہ ہمیں ایک خاص مقام تک ہی لے جاسکتے تھے اور وہاں عرش دس بارہ فٹ اونچا تھا۔ اس اونچائی پر صرف ایک شخص کے چڑھنے کی گنجائش تھی۔ تو اب تصویر کچھ یوں بنتی تھی کہ عرش پر کچھ پورٹر لیٹے ہوئے ہیں اور ہاتھ نیچے کئے ہوئے ہیں کہ دس بارہ فٹ کا فاصلہ بلکہ بلندی طے کر کے جو کوئی بھی آسکتا ہے آجائے ہم اسے دبوچ لیں گے۔

میں اس مرگ صفت مقام کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا کہ یہ کیا تھا۔ کسی آزمائش تھی۔ نہ کوئی واضح راستہ تھا۔ نہ کہیں پاؤں رکھنے کی جگہ تھی۔ نوے درجے کے زاویے پر ایک اٹھان تھی جس پر محض پرواز کر کے بلند ہوا جاسکتا تھا۔ چڑھائیں جاسکتا تھا۔

پورٹروں کے متعدد ہاتھ تھے۔ مٹی میں ناک رگڑتے۔ اپنا دایاں ہاتھ ہوا میں اور ”پکڑ لو۔ پکڑ لو“ کی فریاد کرتے ہم ایک ایک کر کے اونچے ہوئے اور جانے کس نے کسے گھسیٹ کر اوپر کھینچ لیا۔

یہ ایک نہایت واہیات مقام تھا۔ جہاں موت واقع ہو سکتی تھی۔ پر نہ ہوئی۔ اس عبرت ناک مقام پر ہم کچھ دیر اپنے حواس اور قوت گویائی بحال کرتے رہے۔ بہت نیچے رہ گئے پکھورا نالے کو دیکھتے رہے۔ رکے ہوئے سانس کو قدرے رواں کیا اور جب یہاں سے چلے تو سب کے سب ساتھی خوشحال اور خوش مزاج ہو گئے۔ ہم بچ گئے ہیں۔ برج کا ایک اور جنگل ہمارا منتظر تھا۔

ایک اور گھنا شجر اور علاقہ سامنے آ گیا اور ہم اس میں داخل ہو گئے۔ اور داخل ہوتے ہوئے بھول گئے کہ ہم ابھی ابھی کسی موت آور بلندی کو چڑھتے تھے کہ یہ جنگل بھی قدرت کے عجائبات سے آٹا پڑا تھا۔ ایک مقام پر ایک نہایت خوش نما شکل والا درخت جنگل کی گھاس پر اوندھا پڑا تھا۔ اس کی جڑوں نے زمین کا ساتھ چھوڑ دیا تھا اور وہ گھاس کے سبزے پر ایک سفید تصویر کی مانند جڑا ہوا تھا۔ سفید ٹہنیاں بل کھاتی اٹھتی تھیں اور ہم ان کے درمیان میں سے گزر رہے تھے جب میں نے بے دھیانی میں ایک چھوٹی سی ٹہنی کو توڑ کر اپنے ٹک سیک میں رکھ لیا۔

آج یہ چھوٹی سی ٹہنی۔ میری سٹڈی بیورو کے اوپر ایک گلدان میں لگی ہے۔ اور میں نے ابھی تک برج کے جنگلوں کا جو بیان کیا ہے۔ جتنی تفصیل اور کیفیت لکھی ہے وہ سب۔ کہ میرے پاس نوٹس نہیں ہیں صرف اس ایک ٹہنی کو سامنے رکھ کر لکھی ہے کہ یہ ایک ٹہنی برج کے تمام جنگلوں کو بیان کرتی ہے۔ خود ایک جنگل ہے۔

اور ہاں کبھی بکھار جب میں صبح سویرے اپنی پڑھنے کی عینک لینے کے لیے اپنی سٹڈی میں آتا ہوں تو ایک چڑیا اس پر براجمان ہوتی ہے جو مجھے دیکھ کر اڑ جاتی ہے۔ وہ بھی شاید اس میں برج کا پورا جنگل دیکھتی ہے۔

ہم اس جنگل کی چھاؤں میں سے باہر آئے تو ایک ایسی کھلی فضا میں آئے جہاں ڈھلوان پر ایک مختصر بہتی تھی۔

اوپر پتھروں کی چند چارو پواریاں اور جھونپڑے تھے جو برج کے درختوں کے تھے اور نیچے جہاں ہم نکلے تھے کچھ نیچے تھے۔ چند نو جوان اور دو بوڑھے تھے۔

انہوں نے اول اول ہمیں تشویش سے دیکھا۔ ہمیں جنگل میں سے برآمد ہوتے دیکھ کر چپ رہے۔ ہمیں قریب آنے دیا۔ ہم نڈھال ہو چکے تھے۔ اپنے اپنے رک سیک کاندھوں سے اتارے اور گھاس پر ڈھیر ہو گئے۔

وہ سب ہمارے قریب ہوئے کہ کیا یہ مر گئے ہیں۔ ہم اگرچہ مشقت اور اذیت سے اور موت کے خوف سے مر گئے تھے، لیکن مکمل طور پر نہیں مرے تھے۔ یہ ایک گوجر بستی تھی۔

انہوں نے ہمیں زندہ کرنے کے لیے دبی اور لٹی پیش کی اور پھر ہمیں گھیرے میں لے لیا۔ ہماری پوشاکوں اور رک سیکوں کو ٹٹولنے لگے۔ ہنستے گئے۔ آپس میں ہمارے بارے میں ہماری حالت زار کے بارے میں باتیں کرتے گئے اور ہنستے گئے اور تب ہڈے گوجر کا نزول ہوا۔ وہ جو اوپر دو چار پتھریلی آماجگاہیں تھیں۔ جھونپڑے تھے ان میں سے یکدم ظاہر ہوا۔ اور یکدم نیچے آیا۔

وہ اس بستی کا بابا آدم تھا۔ یہ جو ہمیں گھیرے میں لیے ہوئے تھے۔ بچے۔ نوجوان۔ دو بوڑھے۔ سب کے سب اس کی آل اولاد تھے۔

چنانچہ جب وہ نیچے آیا۔ کوہ طور سے اترتے ہارلش موسے کی مانند نیچے آیا تو وہ سب کے سب چپ ہو گئے۔ اس کے احترام میں خاموش ہو گئے۔

یہ بڑھا اگر لاہور میں ہوتا تو یقیناً ”جشی گوجر“ اور ”گوجر داویر“ نامی فلموں کا پروڈیوسر ہوتا۔ لیکن وہ لاہور میں نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ دوران گفتگو کھلا کہ موصوف زندگی میں صرف ایک بار ٹکٹ گئے ہیں۔ اور اس سے پرے جو بھی لاہور پشور وغیرہ تھے ان کے بارے میں لاعلم تھے۔ انہوں نے کچھ شاہ کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے، علموں بس کریں اوپار۔ بس کر دیا تھا۔ اور یہیں پکھور اداوی میں بس کر دیا تھا۔

عمران بڑے شوق سے گوجر بابا اور اس کی آل اولاد کے پگ پگ کلوز بنا تار ہا۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ وہ اوپر ان پتھریلے جھونپڑوں کی جانب کیمرے کی بوٹی کر کے زوم لینز سے زوم

ان کر کے کسی کھڑکی میں سے جھانکتی گوجر حسینہ کا کلوز اپ بنائے۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ اگر وہاں کچھ گوجر حسینا نہیں تھیں تو وہ بڑھے گوجر کے ڈر کے مارے کہیں کونوں کھدروں میں دبی ہوئی تھیں اور ان کی جرأت نہ تھی کہ وہ کسی کھڑکی میں سے جھانک کر ہم پر دیکھیں۔ چنانچہ عمران کا زوم لینز پتھروں پر زوم ان ہو کر سر ٹکراتا رہا۔

اس گوجر گڑھ میں ایک مختصر قیام کے بعد ہم پھر کمر بستہ ہوئے اور برج کے درختوں کے ایک مختصر ذخیرے میں آ گئے۔ یہ برج کی سفیدی کی آخری جھلک تھی۔

وہ ہم پر یوں اتری کہ ہمارے بدنوں کو جلا کر رکھ دیا۔

تاجہ نظر ایک تنگ وادی چلی جاتی تھی۔

نہ کوئی شجر تھا اور نہ کوئی سایہ۔ بس دھوپ تھی۔ چٹیل بلندی تھی اور نیچے کچھورا نالہ تھا جو کہیں نیچے تھا۔ گہرائی میں۔ کبھی دکھائی دے جاتا اور کبھی ڈھلوان کی اوٹ میں غائب ہو جاتا اور صرف اس کا شور باقی رہ جاتا۔ گنڈنڈی پر خطر نہ تھی۔ لیکن احتیاط پھر بھی لازم تھی کہ دائیں جانب جو ڈھلوان تھی اس پر اتنا قائل کرنے سے۔ یقیناً کچھورا نالے تک گرتے ہی چلا جاتا تھا۔

بعض مقامات پر وادی تنگ ہو جاتی۔ نالے کے پار کی چٹانیں اتنی قریب ہو جاتیں کہ ہم انہیں سنگسار کر سکتے تھے۔ ان پر پتھر پھینک سکتے تھے۔ وہ اتنی نزدیک آ جاتیں۔ اتنی کہ ہمارے اور ان کے درمیان کسی نالے کا وجود ممکن نہ لگتا۔

جہاں تک ہم دیکھ سکتے تھے ایک خشک اور ویران گھاؤ نظر آتا تھا جس کے ایک جانب خشک چٹانوں میں ایک گنڈنڈی بل کھاتی کبھی نہ ختم ہونے والی بے جان کیفیت میں چلی جا رہی تھی۔ کبھی اس کی سائیت میں کوئی سخت مقام بھی آ جاتا۔ گنڈنڈی غائب ہو جاتی اور اس کی بجائے گہرائیوں پر ایک گیلری معلق ہوتی۔ چند ٹہنیاں۔ کچھ پتھر۔ اور ہم سانس روکے کچھ نہ کچھ پڑھتے سانس روکے اس پر سے پھونک پھونک کر قدم رکھتے گزر جاتے۔ اور پھونک بھی آہستہ سے مارتے کہ کہیں وہ گیلری بل نہ جائے۔

جہاں ہم وادی کا اختتام دیکھتے وہاں مارو مار کر کے بھوکے پیاسے پہنچتے تو ایک اور ویران وادی سامنے آ جاتی جس پر وہی لامتناہی گنڈنڈی بے تھکان بل کھاتی چلی جاتی۔ اگرچہ یہ ایک پہاڑی سفر تھا لیکن یہاں ایک صحرا کی مسافت ایسی پیاس تھی۔ ہماری فلائسکس میں جتنا پانی تھا وہ ہم پی چکے تھے۔

سورج سوانیزے سے بھی نیچے ہو کر تقریباً آدھے نیزے تک آ گیا تھا اور ہم سے برج کے جنگلوں میں پوشیدگی کا بدلہ لے رہا تھا۔

گدا اور گرد آ میز کا فرقہ ہم سے الگ ہو کر آگے چلا گیا تھا اور اب نظروں سے روپوش ہو چکا تھا۔ صرف ہم قدیمی تھے جو ایک دوسرے کا ساتھ دے رہے تھے۔

عجیب لالینی اور نر آ زار گرم مسافت تھی۔ نہ آس پاس کوئی منظر تھا اور نہ کسی ہریا دل کا کوئی شائبہ یا نشان۔ ہم اس تنگ وادی میں قید تھے اور دھوپ کا کڑا پہرہ تھا۔ ہم پیاس اور پسینے

”پیاس کے صحرا میں ایک آبشاری شلیمار“

ہم ایک مرتبہ پھر ایک کبری گنڈنڈی پر کبری ہوتے اترے اور کچھورا نالے کے پاس آ گئے۔ یہاں اس نالے کے اوپر ایک ایسا شاندار پل تھا کہ کہیں تھا اور کہیں بالکل نہیں تھا۔ برج کے دو چار شہتیر۔ جو جن بھر ٹہنیاں جو شاندار کسی انسان نے نہیں چند کبریوں نے وہاں رکھ دی تھیں۔ یعنی اسے مرد مجاہد جاگ ذرا اب وقت شہادت ہے آیا کا بورڈ وہاں نصب ہونا چاہیے تھا۔ لیکن مرد مجاہد کی زندگی میں یہ پہلا وقت شہادت تو آیا نہیں تھا جو گھبرا جاتا۔ تو بے خطر کو پڑا آتش نرو د میں عشق۔ یعنی ہم پار ہو گئے۔

پار ہوئے تو دوسری جانب ذرا ویرانی تھی۔ بیابانی تھی۔ چٹیل چٹانوں کی خشکی تھی جس پر گھاس اگر کہیں تھی تو بے روح اور چلی ہوئی۔ کسی ایک جھاڑی کا نشان بھی نہ ملتا تھا۔

ایک مختصر گنڈنڈی اس خشک چٹانی بلندی پر اٹھتی تھی جس پر ہم کبڑے عاشقوں کی مانند جھکے جھکے اٹھنے لگے۔

جب ہم پوری طرح اٹھ چکے۔ یعنی کچھورا نالے سے اٹھ کر اس ویران بلندی پر پہنچ گئے تو وہاں تیز تپتی سُلکٹی دھوپ ہماری منتظر تھی۔

یہ تیز دھوپ گمات لگائے بیٹھی تھی۔ ہمیں بہت دیر سے کھوجتی رہی تھی لیکن ہم برج کے جنگلوں میں پوشیدہ چلتے تھے اور وہ ہمارا سراغ نہ لگا سکی تھی کہ وہاں کی گھناوٹ میں چھید کر کے ہم تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ اور اب جب ہم ایک چٹیل ڈھلوان پر چڑھ کر اوپر ایک گنڈنڈی پر آ گئے تھے تو اس کے گرم جال میں آ گئے تھے۔

اُس نے بہت دیر ہمارا انتظار کیا تھا اس لیے غصیلی ہو چکی تھی۔ غضب ناک ہو چکی تھی۔

ہیں... ہماری پگڈنڈی کے قریب ہو کر فردوس بہ روئے زمیں ہو کر ایک اور تالاب میں اترتے ہیں... اور پھر اُسے لبالب بھر کر پگڈنڈی پر سے ایک سیلاب کی طرح رواں ہو کر کہیں نیچے گر جاتے ہیں... ہم اس آبشار کے وعدے پر اگر جے تو یہ جان جھوٹ جانا... کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا...
ہم نے اُس کے قریب پہنچ کر بے اعتباری میں اپنے رُک سیک اتار چھینکے... مجھ رہا ہوں اور اس کے سرد پانیوں میں ناکیں ڈبو کر کہ بے شک ہم بھی ڈوب جاتے... اس کے پانی پیتے رہے تا آنکہ اس کی آبی خشکی سے ہمارے پیٹ مشکیزے جو پیاس سے پچک چکے تھے... پھول گئے اور ان میں گنجائش باقی نہ رہی اور وہ پھینٹے کو آئے... تب ہم نے مجبوراً اپنی ناکیں اٹھائیں... پھر ہم نے چٹابی سے اپنے کپڑے اتارے اور ایسے اتارے جیسے ”جٹا ہے بدن“ گاتے ہوئے فلم کی ہیروئن اُتارتی ہے... اور اگر کسی نے انڈرونیر پکین رکھا ہے تو خیر ہے نہیں پکین رکھا تو بھی خیر ہے ہم اس کے پہلے تالاب میں کود کر رنگ رلیاں منانے لگے... کبھی شفاف اور نیلے پانیوں میں اوندھے ہو جاتے کبھی چھینٹے اُڑانے لگتے اور کبھی پتھروں میں سے نیچے گرتے پانی کے نیچے بیٹھ جاتے... کبھی ایک مختصر آبشار تلے نہاتے اور کبھی دوسری آبشار تلے سانس روک کر بیٹھ جاتے...
میاں صاحب چونکہ سنگل پہلی کے ہیں... پھر چلے ہیں اس لیے وہ کدڑے مارتے ہوئے پتھروں پر چڑھتے ذرا بلندی پر جو تالاب تخلیق ہو رہا تھا اس میں جا کر اشان کرنے لگے... کوشش تو میں نے بھی کی کہ اس آبی شایہار کے دوسرے تختے تک پہنچ کر فرزند کے ساتھ ڈبکیاں لگاؤں! لیکن میرا وجود بھاری اور ناہنجار تھا... خدشہ تھا کہ میں اوپر جاتے ہوئے پانی میں بھیکے ہوئے پتھروں پر پھسل نہ جاؤں اس لیے میں نے پگڈنڈی کے برابر میں پہلے والے تالاب کو ہی غنیمت جانا اور اوپر سے چھینٹے اُڑاتے آتے پانیوں کی بریلی آغوش میں سرد وصال کے مزے لوٹا رہا... جب کچھ زیادہ ہی مزے لوٹے گئے تو ہمارے بدن نیلے پڑنے لگے... جھینگیں آنے لگیں... ہم بے اختیار کپکانے لگے... ٹھٹھرنے لگے... ہماری بتسیاں بجنے لگیں... ابھی تھوڑی دیر پہلے ہم سن سڑوک سے ہلاک ہونے کو تھے اور اب نمویہ سے انتقال کر جانے کا خدشہ پیدا ہو گیا... چنانچہ ہم نہ چاہتے ہوئے بھی آبشار سے الگ ہوئے... ٹھٹھرتے ہوئے کپڑے پہنے... رُک سیک اٹھائے اور پھر سے چلنے لگے...

سے نچڑتے تھے... خیال تھا کہ کہیں پیٹ پُوجا کے لیے رُکیں گے... لیکن آج تو صرف مشقت... تھکاوٹ اور پیاس کی پوجا کا دن تھا...
دو پہر ڈھلنے لگی... لیکن یاد رہے کہ صرف دو پہر... سورج نہیں... وہ بدستور آدھے نیزے پر تھا... اُس کی تمازت اور کرنوں کی آتش نہیں ڈھلی تھی... کبھی کوئی ایسا موڑ آتا جب ہم ہل بھر کے لیے سائے میں چلے جاتے تو وہاں اپنے رُک سیک اتار کر گرم چٹانوں کے ساتھ ٹیک لگا کر باہنے لگتے...
ہمیں یقین ہو گیا تھا کہ اس تنگ وادی کا کوئی اخیر نہیں... کوئی انجام نہیں... ہم چلتے ہی رہیں گے اور یہ یونہی ہمیں ایک لامتناہی بل کھاتی پگڈنڈی دکھاتی... جو کہ ایک آتش برساتے سورج کی مسابگت میں ہے... بس جاری رہے گی... یہ دیوار چین کے پار ہو جائے گی... اہرام مصر تاج محل اور مسجد قرطبہ کو دائیں بائیں چھوڑتی دنیا کے... یا شاید کائنات کے کسی ایسے کنارے پر جا پہنچے گی جہاں سے ہم ایک قدم آگے اٹھائیں گے تو خلا میں گر جائیں گے...
کوہ نور دوں کے لیے اگر چہ انعام بھی بہت ہیں لیکن مزا کیں کہیں زیادہ ہیں...
ایک یونانی فلسفی کا کہنا ہے کہ آپ کو زندگی میں جتنی بھی مسرت حاصل ہوتی ہے آپ کو اس کے عوض اتنی ہی اذیت بھی ملتی ہے... شاید ہمیں طرز جمیلوں... اور شاہنی... برف کے کنویں اور برج کے جنگلوں کی قیمت ادا کرنی پڑ رہی تھی...
اور جب ہم گرمیوں کی آگ برساتی... کڑکتی اور لُوتی دو پہروں میں گاؤں کی سنسان گلیوں میں کسی گندی نالی میں لوٹ کر بدن کو اس کی غلاظت میں بھگو کر تھوڑی سی آسودگی حاصل کرنے کی خواہش کرنے والے ٹٹے کی مانند پانیوں سے لکائے چلتے تھے تو ایک موڑ پر مڑتے ہی چٹانوں کے خشک گھاؤں میں سے ایک آبشار اتر رہی تھی...
اس کے نیگلوں پانی ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک ہوئے لیکن ہم بے یقین بھی ہوئے کہ پیاس کے اس صحرا میں یہ کیسے ممکن ہے... ہر اب ہوگا...
اور وہ آبشار ایک آبی شایہار کی مانند چٹانوں سے تختہ بہ تختہ اتر رہی تھی... اوپر سے گرتی آتی ہے تو چٹانوں میں ایک تالاب بناتی ہے... اور پھر اُس تالاب میں سے رُک کے شفاف سرد پانی چھلکتے ہیں تو ایک دھارے کی صورت چٹانوں کی کوکھ کو بھرتے... انہیں لہریز کر کے پھر نیچے آتے

کاشت کر کے پھر نیچے آ جاتے ہیں وہاں قیام نہیں کرتے۔
اس ہرے بھرے نظارے سے ہم آگے چلے گئے۔ وہ پیچھے رہ گیا اور پھر سے ویرانی اور
خشکی کی کائنات شروع ہو گئی۔
سورج کی حدت قدرے کم ہوئی کہ دو پہر ڈھلتی جا رہی تھی لیکن کچھورا کا کوئی نشان نظر
نہ آتا تھا۔ درّہ فرماوا دی پہلے سے بھی تنگ ہونے لگی۔ بکریوں کے اس راستے پر چلتے چلتے ہم بکری ہو
گئے۔ نہایت ہی لعنتی راستہ تھا۔

جب ہماری جان بدن سے رخصتی چاہ رہی تھی اور ہماری نظر میں فرق آنے لگا تھا۔ ایک
کی بجائے تین تین پتھر نظر آنے لگے۔ کچھورا نالے کے پانی دھندلانے لگے تو پگھلندی یکدم نیچے
ہونے لگی اور نالے کے کنارے پر پہنچ گئی۔ بے حد شور تھا۔ ہم بات نہیں کر سکتے تھے۔ ظاہر ہے اگر
پگھلندی نیچے اتری تھی تو بلا وجہ نہیں اتری تھی اس نے ہمیں نالے کے پار لے جانا تھا۔ سو ہم چلے گئے
... پانیوں میں سے گزر کر نہیں بلکہ ایک پل پر سے گرتے پڑتے گزر گئے۔ دوسری جانب یہی پگھلندی
پھر سے اوپر ہوئی لیکن اس نے مہربانی کی کہ زیادہ اوپر نہیں ہوئی۔ نالے کی قربت میں ہی رہی۔
شام ہونے کو تھی اور شور تھا۔

ہم نے کسی گاؤں تک میں پڑھا تھا کہ اس پل کے پار کچھورا آ جاتا ہے۔
ہم چلتے گئے۔ لیکن کچھورائے آنا نہ چاہا۔

ہمارے ٹھٹھے آپس میں بھرنے لگے۔ ہم گرنے لگے۔ گرنے لگتے تو پتھروں پر ہاتھ رکھ
کر اپنے آپ کو سنبھالتے۔ ہتھیلیاں بھی چھل گئیں۔ ہماری نظر میں کچھ زیادہ ہی فرق آنے لگا۔ کبھی
دھند چھا جاتی اور کبھی اس میں آبشاریں گرنے لگتیں اور کبھی پیاس کے صحرا بچھیل جاتے۔ ہمارا جی
چاہا کہ ہم سفر ترک کر دیں اور قہقہے لگانے لگیں۔ تب ہمیں اس دھند میں.. وادی کے آخر میں
ہریادول کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا نظر آیا۔ قریب ہوتے گئے تو وہ پاپلر کے چند درخت ہوتے گئے۔ اور
قریب ہوئے تو وہ تیز ہوا سے جھول رہے تھے۔ یہ تیز ہوا ہم ساتھ لے کر آئے تھے۔ یہ طرز درّے
سے کچھورا کے نالے کے اوپر تنگ وادی میں تیز ہوتی شرانے بھرتی آتی تھی اور وادی کے اختتام
پر اپنے راستے میں ان درختوں کو پا کر غضب ناک ہوتی ان کے بدن دوہرے کرتی تھی۔

کچھورا کا پہلا گھر آ گیا۔

اب کچھورا نالہ ذرا پرے بہتا تھا اور ہم انسانی ہاتھوں کی بنائی ہوئی ایک برفانی پانیوں

”وادی اشکومن میں اترتے ہیں۔ اور سفر تمام کرتے ہیں“

پھر سے چلنے لگے تو تنگ وادی نے پھر سے اپنے آپ کو ایکشن ری پلے کی صورت میں
دوہرایا اور لامتناہی ہو گئی۔ کوئی انجام نہ تھا۔ مشقت پھر سے شروع ہو گئی۔

ہاں کچھ دیر کے لیے ہم ان بلند اور خشک چٹانوں سے اتر کر نیچے آئے تو ہمیں نالے کے
پار ایک گاؤں نظر آیا۔ ہریادول کا ایک ایسا جنت نظیر ٹکڑا نظر آیا کہ اسے دیکھتے ہوئے آنکھیں ہری
ہو جاتی تھیں۔ بدن کے درو دیوار پر سبز و آگے لگتا تھا۔ اسے گاؤں تو میں نے یونہی کہہ دیا کہ وہاں گھر
نہ تھے۔ بس سبز چارے کے کھیت تھے اور کہیں ایک آدھ چھوٹا اور خشک چارے کے ڈھیر تھے۔
یہ ”اتر“ تھا۔ کھوار زبان میں ”چشمہ“۔

شاید اس پر سایہ لگن چٹانوں میں سے کوئی بڑا چشمہ نکلتا تھا اور نیچے آ کر اس کے کھیتوں
اور کھلیاؤں کو سیراب کرتا تھا۔

یہ علاقہ ہریادول کا ایک سمندر تھا جو ارد گرد کی خشک چٹانوں کے بیچ ایک نیلم کی مانند
دھکتا تھا۔

اگرچہ ہم ابھی ابھی نہائے تھے۔ سردی نے بدن غیے کر دیئے تھے لیکن یہاں تک آتے
آتے حالات پھر سے دگرگوں ہو گئے تھے۔ ہم نے جیسے کبھی کسی آبشار میں اپنے آپ کو بھگوایا ہی نہ
ہو ایسے خشک اور پیاسے ہو گئے تھے اور ہمارا جی چاہتا تھا کہ نالے کے اوپر گنبدیں ڈال کر اس
ہرے بھرے مگر کی آغوش میں پہنچ جائیں۔

نہ صرف یہ کہ وہاں کوئی گھر نہ تھا بلکہ کوئی ذی روح بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہاں
کوئی بھی نہ تھا۔ اشکومن پہنچنے پر ہمیں بتایا گیا کہ لوگ یہاں سے اوپر ”چشمہ“ کو جاتے ہیں اور چارہ

والی قل یا چھوٹی سی نہر کے کنارے چلتے تھے۔ چلتے تھے یا اپنے آپ کو پا بجوں کی مانند گھسیٹتے تھے۔
قل میں سے ریت نکالنے والے چند مقامی افراد نے ہمیں اپنی جانب آتے دیکھا تو
اُن کے سپید چہروں پر مسکراہٹ پھیل گئی کہ اچھا کچھ اور بیوقوف دڑھلے کو عبور کر کے ادھر آتے ہیں
اور پریشان حالوں میں ہیں۔ اُنہیں کس حکیم نے کہا تھا کہ یہ حماقت کریں۔ ہمیں اُن کی یہ مسکراہٹ
زہر لگی اور ہم نے ان سے کلام تک نہ کیا۔

پگڈنڈی جس پر ہم چلتے تھے پہلے آزاد تھی اب آہستہ آہستہ قید ہونے لگی۔ اس کے
دونوں جانب گھروں اور کھیتوں کی دیواریں ابھرنے لگیں۔ کھیت میں ٹھکا ایک نوجوان ہمیں دیکھ کر
کدال اٹھائے راستے پر آ کھڑا ہوا جیسے روکنے کے لیے آیا ہو۔ اُس کا منہ کھلا تھا اور چہرہ
فاتر الحش لوگوں کی مخصوص ڈھیلی بناوٹ لیے ہوا تھا۔ ہنستا ہوا۔ وہ ہمیں دیکھ کر اور زیادہ ہنسا کہ مجھے
تو رب نے اسی طور تخلیق کیا تھا اس میں مرا تو کوئی دوش نہیں لیکن تم جو ہو۔ سمجھو بوجھو کہتے ہوئے بھی
ان راستوں پر آئے ہو تو ہم میں سے پاگل کون ہوا۔

اس نوجوان سے ہم نے مختصر ذانیلاگ کئے اور آگے بڑھ گئے۔

دائیں جانب ایک قبرستان کے آثار تھے۔

آثار اس لیے کہ ان بلند وادیوں میں باقاعدہ قبریں نہیں ہوتیں۔ بنائی باقاعدہ جاتی
ہیں لیکن برفباری اور بارشوں سے ان کے ذخیر ڈھے جاتے ہیں اور بس کتبے رہ جاتے ہیں۔ یہ پتہ
نہیں چلتا کہ کونسا کتبہ کس قبر پر تھا۔ تارڑ کا کتبہ شیخ صاحب کی قبر کے سر ہانے اوندھا پڑا ہے اور شیخ
صاحب پتہ نہیں کہاں پڑے ہیں۔ اکثر قبریں گڑھوں میں بدل جاتی ہیں کبھی شیخ صاحب کی ہڈیاں
بھی دکھائی دے لگتی ہیں۔

ہمیں بتایا گیا تھا کہ کچھوڑا کی کمپننگ سائٹ کو ای قبرستان سے راستہ ہو کر جاتا ہے۔ چنانچہ
ہم اہل قبور سے معذرت کرتے ان کے لیے فاتحہ پڑھتے ان کے کتبوں کو پاؤں تلے آنے سے بچاتے
اس قبرستان میں سے گزرے اور چند کھیتوں اور گھروں اور دیواروں کے بعد کچھوڑا کی خیمہ گاہ میں پہنچ گئے
۔ کچی چار دیواری میں گھر ایک چھوٹا سا میدان تھا جس کے ایک کونے میں چند درخت تھے۔

پورٹ پہنچ چکے تھے۔

گدا اور گرد آ میز بھی پہنچ چکے تھے اور اطمینان سے تاش کھیل رہے تھے۔ آخرت کے
درخت تلے ہمارا سامان اور خیمے جوں کے توں پڑے تھے۔

”ابراہیم“ میں نے اپنے واحد مونس غم خوار کو پکارا ”ابھی تک خیمے کیوں نہیں لگائے؟“

”گدا صاحب کہتے تھے کہ تارڑ صاحب آئیں گے تو خود لگوائیں گے“

”کھانے کا کیا بندوبست ہے؟“

”گدا صاحب کہتے تھے کہ تارڑ صاحب آئیں گے تو بتائیں گے ابھی ہم۔“

ہیں ہمارے لیے چائے بناؤ۔

میں گھاس پر گر اور بے سندھ ہو گیا۔

کوہ نوری کا اُن لکھا دستور ہے کہ جب کوئی ساتھی سب سے پہلے منزل پر پہنچتا ہے
تو فوری طور پر خیمے نصب کروانا ہے۔ خوراک کی تیاری میں مشغول ہو جاتا ہے تاکہ بعد میں آنے
والے ساتھی جو تھکن سے چور آئیں گے خیموں میں آرام کر سکیں اور پھر ان کے لیے خوراک تیار
ہو۔ شہرت ایک لعنتی شے ہے۔ آپ اپنے ہم خیال اور مشترکہ دلچسپی رکھنے والے لوگوں سے دوستی کر
لیتے ہیں۔ پہلے پہل وہ آپ کی قربت پر فخر کرتے ہیں اور پھر ایک ایسا وقت آتا ہے کہ وہ آپ کو
نا پسند کرنے لگتے ہیں کہ یہ شخص تو ہم جیسا ہے۔ اس میں کوئی خاص خوبی تو نہیں تو اسے ہر جگہ اولیت
اور توقیر کیوں دی جاتی ہے۔ وہ آپ کے حوالے سے نامور ہو جاتے ہیں کہ آپ دوستی میں ان کی
بے جا تواضع کرتے ہیں اور پھر وہ آپ کو نا پسند کرنے لگتے ہیں۔

صرف میں ہی نہیں۔ سلیم۔ میاں۔ حسن اور شاہد بھی اس خبر سے بے سندھ گرے کہ نہ
خیمے نصب ہیں اور نہ چولہا گرم ہوا ہے اور آخرت کے ایک گھنے شجر کے نیچے بے سندھ گرے۔ یہ
صرف عمران۔ کاظمی اور طاہر تھے جو ابھی تک مکمل طور پر چاق و چوبند اور پھر تیلے تھے اور ایک مرتبہ
پھر بندر ہو چکے تھے۔

عمران نے میرے عالم بے سندھی میں خلل ڈالا اور ٹیکر ٹنول کر بولا ”سر آپ تو جوں کی
نور رتے ہیں۔ ٹھیک ہے عمر کا تقاضہ جو ہوا۔ ہم لوگ تو دو گھنٹے پہلے پہنچ گئے تھے“

”تو مجھ پر احسان کیا ہے۔“ میں نے غضب ناک ہو کر کہا۔ ”میں پہنچ تو گیا ہوں ناں۔
تم میری عمر کے ہو گے ناں تو کہیں بھی نہیں پہنچو گے۔ زیادہ سے زیادہ تمہاری خاک پہنچے گی جہاں کا
خیر تھا۔ نہیں سمجھے؟“

”نہیں“ اس نے داڑھی ٹھجلا کر کہا ”لیکن سر کیا گاؤں ہے یہ کچھوڑا کا اور کیا وادی ہے
اشکو من کی۔ ہم نے آپ کی آمد سے پہلے کچھ چہرے۔ کچھ گھر اور کچھ کھیت شوٹ کئے ہیں۔ سر اس

وادئ میں بھی ایک گھر ہونا چاہیے۔ کیا خیال ہے؟“

”نیک خیال ہے۔ میں یہاں پہلی بار نہیں آیا“ میں اپنے عالم بے سدھی میں سے اٹھا“ میں چند برس پیشتر اس گاؤں سے گزر کر آگئے امت تک گیا تھا۔ اور وہاں سے ”یاک سرائے“ کے ٹریک کا آغاز کیا تھا۔ یہ جو گاؤں کے پار ایک وسیع پھیلاؤ والا دریا ہے یہ اشکو من ہے اور اس کے پار جو بلند درے ہیں وہ وادی یاسین میں اترتے ہیں۔ کچھ کوہ نور و فلز ٹریک مکمل کر کے اس دریا کے پار اترتے ہیں اور پھر ان بلند دروں کو عبور کر کے وادی یاسین میں جا نکلے ہیں۔“

”تو کل صبح چلتے ہیں ناں سر“ کاظمی نے دانت نکال دیئے۔

”ہاں جی ہاں جی۔ طاہر نے الف لیلیٰ کے ایک ناکام جن کی مانند سر ہلایا تو اس کے کانوں کی بالیاں بھی ہلنے لگیں۔

”مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ عمران بولا۔

مجال ہے جوان تینوں پر اس مسافت کا کوئی اثر ہوا ہو۔ شاید وہ ہم سے جدا کوئی اور نسل تھے۔ انسان نہ تھے۔ بندر سے تھے۔ ان پر تھکاوٹ اور پہاڑی مشقت اثر نہ کرتی تھی۔

”نہیں۔ کل صبح جیپیں ہمیں لینے کے لیے آجائیں گی۔ ہم گلگت جائیں گے اور وہاں سے سیدھے رُکے بغیر لاہور جائیں گے۔ ہم انسان ہیں تمہاری طرح بندر نہیں ہیں۔ نہیں سمجھے؟“

”سمجھ گیا سر۔ تو پھر یہ فیصلہ ہو گیا ہے کہ ٹریک کا اختتام ہو گیا ہے۔ تو اس صورت میں اس ڈاکو مٹری کے آخری منظر کے لیے آپ ذرا میرے ساتھ آجائیں۔“

”کہاں؟“

”قبرستان میں۔“

”قبرستان میں تو کندھوں پر اٹھا کر لے جایا جاتا ہے۔ میں خود بخود چلتا ہوا کیسے چلا جاؤں؟“

”ویسے تو ہم تینوں آپ کو کندھوں پر اٹھا کر بھی لے جاسکتے ہیں لیکن سزاوارتہ الگ۔ میں چاہتا ہوں کہ۔“

”نہ تم چاہنے والے کون ہوتے ہو۔“

”میں آپ کا ہدایت کار ہوتا ہوں سر۔ اتنے دنوں سے مکمل تعاون کرتے رہے ہیں تو آخری شام کے لیے بھی تعاون کر لیجیے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ ٹریک کے اختتام پر ایک قبرستان

میں گلے میں مانگ ڈالے کسی بے نام قبر کے کتبے کو تھا ہے ہوئے۔ یعنی کسی اور قبر کے کتبے کو تھا ہے ہوئے کسرے سے مخاطب ہو کر کہیں۔ خواتین و حضرات میں کتنا خوش بخت ہوں کہ اس خوفناک اور حیرت ناک مہم سے زندہ بچ کر آ گیا ہوں۔ کچھ اور پہنچ گیا ہوں، نہ پہنچتا تو اسی قبرستان میں ہوتا۔ شاید اس کتبے پر میرا نام ہوتا۔ چلیں؟“

میں اپنے آپ پر جبر کر کے زبردستی اس بے سدھ کیفیت میں سے اٹھا اور عمران اور اس کے بغل بچوں کے ہمراہ اس قبرستان میں چلا گیا۔ مانگ گلے میں ڈالا اور اپنی بڑھی ہوئی داڑھی اور سرخ آنکھوں سے کسرے کو گھورتا اداکاری کرنے لگا۔ خواتین و حضرات اگرچہ میری مسرت کا کوئی ٹھکانہ نہیں کہ میں فلز پکھورا مہم کے آخر تک بغیر وعافیت پہنچ گیا ہوں لیکن یہ کہتہ جو میں نے تھا ماہوا ہے اس پر میرے نام کا امکان بہت کم تھا۔ اگر میری قسمت میں ایک گناہم قبر میں ہونا ہوتا۔ تو یہاں نہ ہوتا۔ برا الذو۔ بیافو یا ہوسپر کی کسی بھی دراز میں ہونا ہوتا۔ میں سنولیک یا درہ ہوسپر۔ چنی ہوئی یا درہ در کوٹ میں دفن ہوتا۔ یہاں نہ ہوتا۔ اس لیے کہ یہ ٹریک ان کی نسبت محض بچوں کا کھیل تھا۔ اگرچہ بچوں کے کھیل میں بھی کبھی جان چلی جاتی ہے۔ جھینک پو“

”سر جی“ عمران کسرے میں سے سر نکال کر دھاڑا“ بچ نہ بولیں۔ جھوٹ کی انتہا کر دیں۔ ڈرامہ کریں۔ کوئی ہولناک بات کریں۔ کوئی ایسی بات کریں کہ دیکھنے والوں کے رو گئے کھڑے ہو جائیں۔“

”سوری۔“ میں نے معذرت کی۔ یعنی لوگ عشق کی انتہا چاہتے ہیں اور تم جھوٹ اور ڈرامے کی انتہا چاہتے ہو تو عمران مجھ سے بہتر تم اور کسی کو نہ پاؤ گئے۔ شام دوبارہ کرؤ“

”اوکے۔“ عمران نے کسرے میں سر گھسا کر مجھے اشارہ کیا“ کیو۔“

”خواتین و حضرات۔“ میں ایک نہایت المناک شکل بنائے شروع ہو گیا“ میں اس انتہائی خوفناک مہم سے زندہ بچ کر بالآخر پکھورا کے گاؤں میں پہنچ گیا ہوں جہاں کل صبح دو جیپیں آئیں گی اور مجھے اور میرے ساتھیوں کو گلگت لے جائیں گی۔ ان جیپوں کی بجائے کل ایک تابوت بھی آ سکتا تھا۔ میرے سائز کا۔ کہ یہ ایسا دنیا کا خطرناک ترین ٹریک ہے کہ بہت کم لوگ زندہ بچ کر آتے ہیں۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے راستے میں جگہ جگہ مردہ کوہ نور دوں کے ڈھانچے دیکھے ہیں۔ اب اسی قبرستان کو دیکھئے جس میں میں کھڑا ہوں اس میں پیشتر قبریں ان کوہ نور دوں کی ہیں جو اس ٹریک کے دوران ہلاک ہو گئے۔ وہ میری طرح خوش قسمت نہیں تھے۔ یہیں کہیں میری

دوسرا سفر

”چٹان پر ایک لڑکی.. کچھ نہ بن سکو تو گھاس بن جاؤ“

چٹان پر ایک لڑکی...

چٹان بلند ہوتی جا رہی ہے اور جب چوٹی تک پہنچتی ہے تو وہاں ایک لڑکی...

چٹان کی چوٹی پر ایک لڑکی... براہمن!

اور چٹان حرکت کرتی جاتی تھی اور اُس کے ساتھ لڑکی جو اُس کی چوٹی پر براہمن تھی، وہ بھی حرکت کرتی جاتی تھی... بہت تیزی سے... جیسے میں ایک تیز رفتار ٹیلی کاسٹ میں بیٹھا اُس کے قریب سے گزر رہا ہوں...

چٹان پر اطمینان سے بیٹھی لڑکی سرخ لباس میں تھی۔

وہ ایک جل پری کی مانند چوٹی پر ٹانگیں سیٹے بیٹھی تھی۔

ایک سرخ جل پری بھوری چٹان کی بلندی پر ٹانگیں سیٹے بیٹھی تھی اور وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ تو سامنے اُفق کے پار کتنی تھی نیچے نہیں دیکھتی تھی اور اگر وہ نیچے نگاہ کرتی تو دیکھتی کہ ڈوبتے سورج کی زردی میں نہاتی ایک جیپ ہے جو دھول اُڑاتی ہو شے جانے والے کچے راستے پر چلی جاتی ہے اور اُس کے پچھلے حصے میں ٹرک سیک اور چند کوہ نور دھنسنے پڑے ہیں... بیک ہو چکے ہیں اور وہ ہوشے کے اوپر سایہ لگن مشاہیرم کو تکتے ہیں اور اُس کے دامن سے آنے والی سرد ہوا کو اپنے رخساروں پر محسوس کرتے مسکراتے ہیں کہ وہ نیچے سے... پنجاب کے میدانوں سے اوپر آئے ہیں اور ابھی تک اُن کے چہروں میں سے پنجاب کی گرمی پھوٹی ہے۔ اور جیپ کی اگلی نشست پر ایک موٹے ڈرائیور کے برابر میں ایک بھوری آنکھوں والا شخص حیرت کی کیفیت میں گرفتار منہ اٹھائے اُسے تک رہا ہے اور اُس کی بھوری آنکھوں میں بھی ایک حرکت کرتی ہوئی بلند چٹان ہے جس پر

قبر کا کتبہ بھی اوندھا پڑا ہوتا اور اس پر میرا نام لکھا ہوتا... اگرچہ اٹھکومن کے کتبہ نویسوں کو میرا نام لکھنے میں بے حد دشواری ہوتی، لیکن کتبوں پر درج ناموں کے سچے کون چیک کرتا ہے... مستنصر کو ”س“ سے لکھا جاتا تھا ”ص“ سے تو کون چیک کرتا ہے... یعنی اگر قسمت یاوری نہ کرتی میں بھی ان بے نام قبروں میں سے ایک ہوتا... اور بے نام قبروں پر کوئی دیا جلانے بھی نہیں آتا... آپ بھی نہ آئیے گا... وادی اٹھکومن بہت دور ہے... خدا حافظ!“

”واہ سرجی واہ... آپ نے تو کمال کر دیا... آج اخیر کر دی... یہ ڈاکومنٹری ہٹ ہے سر“ عمران اینڈ کمپنی نے کیمرہ آف کیا اپنا ساز و سامان سمینا اور کچھ اور گاؤں کو شوٹ کرنے کی خاطر قبرستان سے اتر کر میری آنکھوں سے اوٹھل ہو گئے... اب میں ان کے لیے بیکار ہو چکا تھا... وہ پروفیشنل لوگ تھے... مجھے استعمال کرنے کے بعد وہ مجھے کیمرہ ترک کر گئے... گویا کوڑے کے ایک ڈھیر پر پھینک گئے...

اب میں آپ سے... اس قبرستان کی تنہائی میں صرف آپ سے... اپنے پڑھنے والوں سے مخاطب ہوتا ہوں کہ آپ مجھے کبھی ترک نہیں کرتے ”خواتین و حضرات... اگرچہ اس سفر نامے کے آغاز میں میں نے اقرار کیا تھا کہ یہ سفر اس لائق نہیں کہ اسے بیان کیا جانا چاہیے... البتہ اس کے کچھ کردار ایسے ہیں جو اس لائق ہیں یا نا لائق ہیں کہ انہیں بیان کیا جانا چاہیے... لیکن اب اس کوہ نور دی کے اختتام پر مجھے یہ اقرار کرنا ہے کہ اگر دنیا بھر کی جھیلیں میں سے سب سے آئینہ دار اور رنگ ریز نظیر جھیلیں کو بیان نہ کرتا... ہر شام لوہڑ شاہنی کی ڈھلوانوں پر سے اترتے یا ک قافلوں کی سموں سے اٹھنے والی دھول اور دھمک کو تو میر میں نہ لاتا... تین سروں والی شاہنی پیک میں سے گرتے برف کے آبشار ایو لائچ کو قلم بند نہ کرتا... کوہ قاف کے اس ہرے بھرے بلند برفانی تخت کا تذکرہ نہ کرتا جس میں پاک اور گھوڑے کھلونے تھے... کہیں بلند پہاڑوں میں رسول حمزہ توف کی نظم ”اے عورت“ نہ پڑھتا... برف کے کنویں میں گرتی اس آبشار میں ایک خطوط شدہ چہرے سے نہ جھانکتا جب کہ میرے جو گرز میں میری جان تھی اور انہیں ابراہیم نے جکڑ رکھا تھا... برف کے سفید جنگلوں میں چسید کرتی سورج کی اولین شعاعوں کو دھند میں نقب لگاتے نہ بیان کرتا... ایک آبی شامیر میں بدن ڈوبنے کی کیفیت... نہ تحریر کرتا... تو کتنا بڑا گناہ کرتا... سوہنے رب نے جو کچھ بنایا ہے اسے دیکھنا اور پھر بیان نہ کرنا کتنا بڑا گناہ ہے... تو میں نے بیان کر دیا تو کیا بڑا کیا؟...

اور پھر اگلے لمحے جیپ کی کھڑکی میں سے ایک چٹان بلند ہونے لگی۔ وہ گزرتی جاتی تھی۔ اسی رفتار سے جس رفتار سے ہماری جیپ جاتی تھی اور اس کی چوٹی پر یہ لڑکی بیٹھی تھی۔ چٹان کے پس منظر میں جو برف پوش بلندیاں تھیں، وہ یکدم غائب ہو گئیں اور وہ چٹان اور اس پر بیٹھی لڑکی جو جانے کس دھیان میں تھی اور جانے چوٹی تک کیسے پہنچی تھی، آسمان میں تیرنے لگی۔ یہ محض پل دو پل کا سماں تھا۔ جو تیزی سے گزر گیا۔ آکھ جھپکتے ہی گزر گیا لیکن میری یادداشت پر مثبت ہو گیا۔ سکتے پر مہر لگ گئی۔

وہ کوپن ہیگن کی ”لعل مر میڈ“ کی مانند اس چٹان پر بیٹھی تھی۔ کوپن ہیگن کی لعل مر میڈ ایک بڑے پتھر پر براجمان سمندر کو دیکھتی تھی، اس شہر کی علامت ہوتی تھی۔ اتنی مختصر تھی کہ قریب پہنچنے پر بھی غور کرنے سے نظر آتی تھی لیکن کینڈاس تھنگ کی یہ جل پری اس کی نسبت ہزاروں گنا بڑی اور بلند چٹان پر۔ اور جانے وہاں تک پہنچی کیسے تھی، اطمینان سے بیٹھی تھی۔ اور اس کے سامنے سمندر نہ تھا۔ غلاء تھا۔ وہ اتنی بلندی پر تھی۔ اور اس غلاء کے کہیں نیچے دریائے ہوشے اور شیوک تھے۔ اور بہت دور پہلو کی وادی تھی اور سیاچن جانے والے راستے تھے۔ وہ ایک لیڈی گوڈائیو تھی جو اپنے بے لباس بدن کو محض اپنے طویل گیسوؤں سے ڈھکی ایک سفید براق گھوڑے پر سوار تھی۔

ایک جون آف آرک تھی جو اپنے جلائے جانے کی منتظر تھی۔ حضرت عیسیٰ کا وہ سفید جسم تھی جو ریوڈی جنیرو کی بلند ترین پہاڑی پر ہاتھ پھیلائے کھڑا ہے۔

اگرچہ وہ یہ سب کچھ تھی لیکن ان سب سے افضل تھی کیونکہ وہ زندہ تھی۔ اس کا سرخ دوپٹہ ہوا کے زور سے کبھی کبھار پھڑپھڑا کر اٹھتا تھا اور گر جاتا تھا۔

”بن سکو تو پہاڑ کی چوٹی بن جاؤ“

یہ ممکن نہ ہو تو پہاڑ کی کھاکی میں کھلنے والا ایک زرد پھول بن جاؤ۔

ایسا نہ ہو سکے تو ایک چھوٹا سا جھرنایا بنی۔

اور کچھ بھی نہ بن سکو تو گھاس بن جاؤ۔

ایسی گھاس جس پر کسی کے قدموں کے نشان ثبت ہو جائیں۔

ایک سرخ لباس میں، ناگلیں سمیٹے بیٹھی لڑکی ہے جو گزرتی جاتی ہے۔
اگر وہ نیچے نگاہ کرتی تو یہی دیکھتی۔

یہ پل دو پل کا منظر تھا لیکن اس پر ابدیت نے مہر لگا دی تھی۔

چٹان پر بیٹھی سرخ لباس والی لڑکی بھوری آنکھوں میں مثبت ہو گئی تھی۔

جیسے کسال میں ایک سکتے پر کسی سکندر، کسی اشوک یا کسی شاہ جہان کی شبیہ ثبت ہو جاتی ہے۔ اور وہ سکتے سینکڑوں یا ہزاروں برس بعد جب کسی کھنڈر میں سے برآمد ہوتا ہے تو متروک ہو چکا ہوتا ہے لیکن اس پر مثبت شبیہ قائم ہوتی ہے۔

یوں اس شخص کی بھوری آنکھیں بھی ایک ایسا سکتہ تھیں جو لمحہ موجود میں تو دیکھ سکتی تھیں، رات تھیں اور ان پر چٹان کی چوٹی پر براجمان سرخ لباس والی لڑکی ناگلیں سمیٹے بیٹھی مثبت ہو چکی تھی ایسے کہ کل کلاں جب یہ آنکھیں متروک ہو چکی ہوں گی۔ خاک در خاک ہو چکی ہوں گی تو بھی اس خاک میں سرخ پیراہن میں ملبوس چٹان پر بیٹھی ایک لڑکی کی شبیہ محفوظ ہوگی۔

میں جیپ کی ونڈ شیڈ پر نظریں جمائے ہوئے جانے والے کچے راستے کی خطرناکی سے آنکھیں چراتے سامنے مشاہیرم کی چوٹی کو تک رہا تھا جو شام میں جاری تھی اور میرے دل میں دسو سے تھے۔ کہیں ہوشے کے راستے میں ہی رات نہ ہو جائے۔ اگر رات ہو گئی تو خیمے کیسے اور کہاں نصب کریں گے۔ بدن میں کلبلائی بھوک کا مداوا کرنے کے لیے چوہا کیسے روشن کریں گے۔ جب میں نے جیپ کی کھڑکی میں فریم ہوتے اس میں سے تیزی سے گزرتے منظر کی جانب نگاہ کی۔

اور اس لمحے ایک ویرانے میں خشک اور چٹانی ویرانے میں چٹانوں کی اوٹ میں ان درجنوں گھروں کو دیکھا جو شاندار چٹانوں کی کوکھ میں سے جنم لے رہے تھے۔ درجنوں کوٹھڑی نما صرف انسانی ہاتھوں کی مدد سے تعمیر کردہ گھر جو کاندے کے سیلاب میں بے گھر ہو جانے والے لوگوں نے یہاں آباد کئے تھے۔ یہاں کینڈاس تھنگ نامی ایسے مقام پر جہاں پانی کی ایک بوند نہ تھی۔ کاندے میں پانی نے ان کو بہا دیا تھا اور یہاں کینڈاس تھنگ میں کر بلا تھی۔ پانی کا ایک گھونٹ نہ تھا۔

اسی لیے ہماری جیپ کے پچھلے حصے میں میرے ساتھیوں کو بے آرام کرتے پانی سے بھرے تین پلاسٹک کین تھے جو ہم کاندے کے فرات سے بھر کر ان کے لیے لائے تھے۔

میں کچھ بھی نہ بن سکا تھا، اس لیے وہ گھاس بن گیا تھا جس پر جیپ کی کھڑکی میں سے تیزی سے گزر جانے والی چٹان پر ٹیٹھی لڑکی کے نشان ثبت ہو گئے تھے۔

منظر کب کا گزر چکا تھا۔

سب کچھ پیچھے رہ گیا تھا۔

لیکن اس کے باوجود وہی چٹان وہی لڑکی اس کی چوٹی پر ٹانگیں سمیٹے ٹیٹھی گزرتی رہی۔ جیسے ایکشن ری پلے ہوتا جائے۔

میری بھوری آنکھوں کے سلتے پردہ بار بار ثبت ہوتی رہی۔

کہیں بلند پہاڑوں میں۔

ایک ٹرانگوٹا ورا ایسے چٹانی مینار پر براجمان۔ سرخ لباس والی لڑکی۔ تیزی سے جیپ کی کھڑکی کے فریم میں سے گزرتی رہی۔

چونکہ ابھی میری بھوری آنکھوں کا سکہ رائج ہے۔ اس لیے نقش بھی تازہ ہے۔ ابھی ابھی نکسال میں ڈھلا ہے۔ اس لیے اسے میں اتنی تفصیل سے بیان کر رہا ہوں۔

ایک بلند چٹان۔ عرش کی قربت میں۔ چوٹی پر ایک لڑکی۔ سرخ لباس میں۔ تیزی سے سرکتی۔ جیپ کی کھڑکی میں سے گزرتی۔ بلند یوں کی جل پری پاؤں سمیٹے جانے کی منتظر۔

ہوشے کی شام میں جاتی دھول اڑاتی ایک جیپ کے عین اوپر۔

چٹان پر ایک لڑکی۔

”ویگن جس میں موسم، بلندیاں اور چند چہرے

ٹھہرے ہوئے تھے۔۔۔۔۔ واپسی!“

ویگن خاموشی کے چپ جزیرے میں سے یکدم۔۔۔ سکوت کے کواڑ توڑتی یکدم۔۔۔ شہر کے شور میں داخل ہو گئی۔

لاہور شہر کے شور میں داخل ہو گئی۔

ہمارے کانوں کے پردے پھٹنے کو آئے۔ چہرے شور کی بوچھاڑ سے زخمی ہونے لگے۔ ریزھے، تانگے، ویگنیں، بسیں، رکشے شور مچاتے دندناتے ہمیں روندتے ہماری ویگن کے آس پاس ایک ہولناک قیامت برپا کر رہے تھے۔ اور پھر لوگ۔۔۔ بہت ہی لوگ۔۔۔ شہر کے لوگ۔۔۔ لاکھوں لوگ۔۔۔ بھیروں کے ریوڑ۔۔۔ لالچ اور حماقت کے ریوڑ ایک سیلاب کی مانند ہماری ویگن کو دھکیلنے لگے۔

ہم نے ایسا منظر کبھی نہ دیکھا تھا۔

دندناتی لہراتی بے قابو بے اختیار ہوتی ویگنیں ہمیں کچلنے کے لیے آرہی تھیں۔ بسیں اپنے بانٹ کھولے ہمیں ہڑپ کرنے کو تھیں۔ تانگوں میں بٹے گھوڑے عفریتوں کی مانند منہ کھولے ہمیں نوالہ بنانے کے لیے ہنہناتے چلے آ رہے تھے۔ کاریں صرف ہمیں کچلنے کی خاطر چینی چلاتی ہماری ویگن کی جانب بڑھتی تھیں۔ اور ہم سبہ ہوئے تھے۔

ہم ڈبکے ہوئے کھڑکی کے کھلے شیشوں میں سے ان آنٹوں اور بلاؤں کو اپنے آس پاس چنگھاڑتے ہوئے دیکھتے تھے اور سبہ ہوئے تھے۔

اگرچہ دور سے ٹریک کی بھیڑ میں یہ ایک عام سی کوئی سی ویگن لگتی تھی

لیکن اس میں چند موسم... چند بلندیاں اور چند چہرے ٹھہر گئے تھے۔

ویگن کے فرش پر ابھی تک کچھ کانٹے تھے۔ کسی پہاڑی پودے کے جو کسی کوہ نور کے بوٹوں سے چپک کر اندر آئے تھے اور ہمارے ساتھ ہی شہر کے شور میں چلے آئے تھے۔

نشستوں تلے رک سیکوں میں ٹھنڈے ہمارے قدموں میں پڑے اُس شاپنگ کے ڈھیر ڈبے اور کارڈن تھے اور بیگ تھے جو گلگت کی این ایل آئی مارکیٹ میں کی گئی تھی۔ بچوں کے کھلونے، جوگر، ریشمی زنانہ سوٹ، ہیلی کاپٹر، چینی ڈزنیٹ اور ٹی سیٹ۔ ایک عدد ویلی ویشن اور بے شمار کاکا جو بے حد سستے تھے اور اب درجنوں کے حساب سے ہنگ ہنگ کئے جا رہے تھے۔

اور ہاں... ہماری گندی جرابوں کی بہت ہی بڑی بو تھی۔

ویگن میں میری شاپنگ سب سے مختصر تھی کیونکہ شاپنگ تو ہمیشہ بیٹیوں کے لیے کی جاتی ہے۔ اور میری بیٹی ملک سے باہر جا چکی تھی۔ اگر ایک بیٹی آپ کے پاس ہو تو کسی بھی شاپنگ سنٹر کے سارے شیلٹ اس کے لیے خرید کئے جاسکتے ہیں۔ وہ نہ ہو تو وہاں خریدنے کے لیے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اور بیٹے بھی اتنے بڑے ہو چکے تھے کہ میں ان کے لیے تالیاں بجاتے بندر یا بیلی کا پٹر نہیں خرید سکتا تھا۔

میرے پاؤں میں سینڈل تھے اور ٹریکنگ بوٹ فرش پر پڑے منہ کھولے ہانپ رہے تھے کہ وہ پندرہ ہزار فٹ کی بلندی پر تو آسانی سے سانس لے سکتے تھے۔ برفباری کے دوران ان کے تسمے کس دینے سے وہ آرامدہ محسوس کرتے تھے لیکن لاہور کی اس جس زدہ گرمی میں وہ چڑیا کے بچوں کی مانند منہ کھولے ہانپ رہے تھے اور ان کو سانس نہیں آ رہا تھا۔ ویسے وہ یہ جانتے تھے کہ یہ شخص اگر اگلے برس تک صحت مند رہا اور زندہ رہا تو ہاں نہیں آئے گا اور ہم پھر اس کے پاؤں سے آشنا ہوں گے اور بلندیوں تک جائیں گے۔

ویگن سے باہر ایک ہولناک شور تھا جیسے کوئی ڈانٹا ہو رہا ہو چکوال یا بلوچستان میں اپنی ہڈیاں جوڑ کر زندہ ہو کر لاہور کے برج بینارے ڈھانٹا شہر میں گھس آیا ہو۔ اتنی افراتفری مچی ہوئی تھی۔

اگر مجھے فوراً یہیں کہیں ڈراپ کر دیا جاتا اور کہا جاتا کہ آپ سڑک کے پار چلے جائیں تو میں کبھی بھی ایسا نہ کر پاتا کہ مجھ میں کاروں، ویگنوں اور رکشوں سے بچ کر سڑک پار کرنے کی

ہم مکمل طور پر ایک نیٹ آف شاگ میں تھے۔

ہماری ویگن موڑوے سے اتر کر کالاشاؤ کا کوکے قریب گرینڈ ٹریک روڈ میں داخل ہوئی تھی اور اب لاہور شہر میں پہنچ کر اس کے گھنے بدھیت شور میں ڈوبتی جاتی تھی۔ ہماری ویگن۔ اگرچہ... بلکہ بظاہر ان تمام ویگنوں جیسی اور ان کی شکل کی تھی جو ہمارے ہونٹیں ہمیں کھینے کی نیت سے بے قابو اڑتی پھرتی تھیں لیکن شکل سے کیا ہوتا ہے، ہماری ویگن کی روح ان سے مختلف تھی۔

اس کا ڈھانچہ اور ماڈل ان جیسا تھا لیکن اس کی روح کچھ اور تھی۔

ہماری ویگن کے اندر ابھی تک کچھ موسم ٹھہرے ہوئے تھے۔

اور اس ویگن میں جو ہم تھے۔ ہمارے رک سیک۔ پانی کی بوتلیں۔ خیمے۔ جیکٹیں، واکنگ سلکس اور جو ہانگنگ بوٹ تھے، ان میں بھی کچھ موسم ٹھہرے ہوئے تھے۔ بٹام کی شام میں شیرور یا سندھ کی لہروں کی کروٹوں کا بہاؤ اس میں تھا ہوا تھا۔ اس کی کچھ فی باقی تھی۔ برسیں۔ یا برزین کی بلند تہائی کے موٹل کے ایک کمرے میں بستر پر پھٹی بے شکن چادر کی ایک پادھی۔

رائے کوٹ ٹپل پر۔ سرخ ریش پور ٹشور کا چہرہ تھا جو اوپر فیری میڈ سے آیا تھا اور مجھ سے کہتا تھا۔ صاحب۔ اوپر چلو۔ فیری میڈ تمہیں یاد کرتا ہے۔ گلگت کی ایک مست شام تھی۔

سکرور روڈ پر سفر کرتے ہوئے اس تنگ درے میں۔ اس کی پریچ اٹھان اور اتران میں دریاے سندھ کی گرج نے جودل کو روکا تھا، اس ویگن میں ابھی تک اُس دل کی دھک دھک تھی۔ سکرور کی وسعت میں وہ ملکی بارش تھی جو سندھ کے بہاؤ پر گرتی تھی۔

گنی رات وادی چپلو کی جانب سفر تھا۔ شیوک ابھی تک اس ویگن میں بہتا تھا۔ مچلو کی خانقاہ کے تپتی دینار اور ستارے تھے۔ کاندے کا ٹونا ہوا پل تھا اور اس کے پار ایک چٹان پر براہمان سرخ لباس والی لڑکی تھی۔ ہوشے تھا۔ وڑہ گندگور تک کا ایک پُر اذیت سفر تھا۔ شاکی چو میں اڑتی پتنگ تھی۔ ذل سنگ پاکی جھیل میں اترتے ہوئے سات گھیشیر تھے اور ہسپاں تھا جہاں لیے ہماری منتظر تھی۔

اس ویگن کے اندر جو ابھی ابھی موڑوے سے جدا ہو کر اس کے سکوت کے قفل توڑ کر یکدم لاہور شہر کے شور میں داخل ہوئی تھی، بہت کچھ باقی اس لیے تھا کہ اس میں کچھ موسم ٹھہرے ہوئے تھے۔

جس مفقود ہو چکی تھی.. میں ایک ہی مقام پر بیٹھی مرغابی کی مانند شکار ہو سکتا تھا.. مجھ میں کسی گہری دراز کو پھلا گئے یا گھیشیر کے بلند راستے کی دھار ایسے کنارے پر چلنے کی صلاحیت تو تھی لیکن اس طوفانی شور اور زوم زوم گزرتی ٹریفک میں سے بچ کر سڑک کے پار کرنے کی صلاحیت نہ تھی..

میں ابھی تک ہسپاں میں تھا..

لیٹا پیک کی آغوش میں تھا..

میرا چہرہ اور ہاتھ جلے ہوئے تھے.. بلندیوں کے اثر دھسے کی پھونک سے ڈسے ہوئے تھے.. اگر کوئی میرے پورے بدن کو اُلفت سے دیکھتا تو وہ کہتا کہ.. یہ کیا ہے کہ تمہارے بدن کے کچھ حصے نیم سفید ہیں لیکن تمہارے ہاتھ سیاہ ہیں، چہرہ جلا ہوا ہے اور ٹانگوں پر سیاہی کے آثار ہیں اور تمہاری جلد اکھڑ رہی ہے.. یہ کیا ہے.. اور میں کہتا کہ یہ بلندی کی ڈائن ہے جس نے میرے بدن کے کچھ حصے سیاہ کر دیے ہیں..

تو پھر کیوں کہیں بلندی پہاڑوں میں جاتے ہو؟..

میں نے کہیں اپنے گاؤں کے اس جولا ہے کا قصہ بیان کیا ہے جو ایک بار سانپ سے ڈسا گیا تو پھر ایک خاص موسم میں پھر سے ڈسے جانے کے لیے بے چین اور مضطرب ہو جاتا تھا.. وہ اس سانپ کا منتظر رہتا.. اور وہ آتا اور اسے ڈس کر چلا جاتا اور وہ جولا پاشانت ہو جاتا..

میں بھی وہی جولا ہوں..

ایک خاص موسم میں میں بھی بے چین اور مضطرب ہوتا ہوں اور پھر خود بلندی کی ڈائن تک جا پہنچتا ہوں کہ وہ میرے بدن کے کچھ حصوں کو سیاہ کر دے تاکہ میں بھی شانت ہو سکوں.. لیکن.. شہر کے اس شور میں ڈوب رہی تھی جس سے فرار ہو کر ہم شمال کو گئے تھے.. ہم سب سہے ہوئے تھے..

”روانگی کا دن، ڈرائیور نیم حکیم اور کلر کہار میں بریک ڈاؤن“

یہ تو کچھ روز پہلے کی بات ہے..

چند روز پہلے کا قصہ ہے..

جب ہم..

لیکن کتنے روز پہلے؟.. نہ دن یاد ہے اور نہ تاریخ.. اس قصے کو گزرے ہوئے چند

صدیاں بھی ہو سکتی تھیں..

کیونکہ چند روز میں تو انسان اپنے شہر کو نہیں بھولتا.. اس میں دو بارہ داخل ہونے پر ہم نہیں جاتا.. خوفزدہ تو نہیں ہو جاتا کہ یہ میں کہاں آ گیا ہوں، یہ کونسا دیار ہے.. تو یقیناً اس قصے کو چند صدیاں گزر چکی تھیں جب ایک ایسی سویر تھی جب میرے گھر کے موگیے رنگ کے پھانک کے باہر ایک ایسی ویگن کھڑی تھی جس میں میرے کوہ نور ساتھیوں کے رُک سیک اور سامان لوڈ کیا جا رہا تھا.. اور پھر ہم لوڈ ہوئے تھے بلکہ ٹھنڈے تھے کیونکہ ویگن کی چھت پر کیریز نصب نہ تھا اور ہم اور سامان اس کے اندر ہی بمشکل پیک ہوئے تھے..

ویگن گھرگ میں سے نکلی تو موٹروے کی بجائے ملتان روڈ کی ایک ایسی درکشاپ کے سامنے جا کھڑی ہوئی جس کے چھوٹے ابھی نیند میں تھے اور استاد کے نمودار ہونے میں ابھی بہت وقت تھا کیونکہ یہ صبح سویر تھی..

”کیا ہوا ہے؟“ میں نے حکیم سے پوچھا..

اور یہ حکیم ہمارا ڈرائیور تھا اور عجیب و غریب حکیم تھا.. نہ کچھ بولتا تھا نہ کچھ کہتا تھا.. شاید نیم حکیم تھا.. ہم نے سفر کے آغاز میں اس سے کچھ فرینڈلی ہونے کی کوشش کی لیکن اس نے ہمیں

کچھ زیادہ لفٹ نہ کرائی صرف ”جی“ اور ”ہوں“ کے ساتھ ہمیں ٹرخا دیا۔ ایک بہت ہی طویل سفر کے دوران ڈرائیور کے ساتھ فریڈی ہونا بلکہ کسی حد تک اس کی خوشامد کرتا ہے حد ضروری ہوتا ہے۔ کیونکہ شاہراہ قراقرم اور سکروڈ پر آپ ایک ناراض اور ناخوش ڈرائیور فوراً نہیں کر سکتے۔

”ہوں“ اس نے جواب دیا۔

”یار حکیم پلیز بتاؤ کہ کیا پر اہم ہے؟“

”ایئر کنڈیشنر کی ہیٹ آواز دے رہی ہے۔ اسے چیک کرانا ہے۔“ حکیم نے اونگھتے ہوئے حکمت سے کہا۔

”پہلے کیوں نہیں چیک کی؟“ حسن صاحب ڈرائیور سے ہو گئے کہ یہ انہی کا بندوبست تھا۔ ”آپ تو کہتے تھے ویگن بالکل بریڈ نیو ہے اور ابھی تک اس کی سیلیں نہیں ٹوٹیں۔“

”میں نے نہیں کہا تھا۔ مالک نے کہا تھا۔“

ایک زبردستی بیدار کیا گیا اونگھتا ہوا چھوٹا کچھ اوزار لے کر ویگن کے پیٹ کے نیچے ریگلتا ہوا روپوش ہو گیا۔

یہ کوئی اچھا شگون نہ تھا۔

پاؤ کو کو بلو کہتا ہے کہ شگونوں پر ہمیشہ دھیان دو۔

لیکن ہم نے اس کا کہنا مانا کہ سفر کا آغاز اچھا نہ تھا۔ ایئر کنڈیشنر کی ہیٹ کا آواز دینا ایک بُرا شگون ہو سکتا تھا۔ ہم اس شگون پر دھیان دیتے تو سفر کا ارادہ ترک کر دیتے۔ چنانچہ ہم نے آس پاس دیکھنا شروع کر دیا۔

اور آس پاس ملتان روڈ کا وہ علاقہ تھا جہاں شاہ نور سٹوڈیو واقع تھا۔ شاہ یعنی شوکت حسین رضوی اور نور یعنی نور جہاں دونوں مرچکے تھے لیکن ان کا سٹوڈیو ابھی زندہ اور بارونق تھا۔ اس کے آس پاس اور قربت میں ایسے ”ادارے“ اور ”اکیڈمیاں“ تھیں جو ہیر و بنے، گلوکاری میں کمال حاصل کرنے کے خواہش مندوں کے لیے مینارۂ نور تھیں۔

ہر جانب مختلف ”پرفارمنگ آرٹس“ کی اکیڈمیوں کے بورڈ تھے جو یقیناً ان بلند پایہ اداروں کے پرنسپل حضرات نے خود اپنے ہاتھوں سے لکھ کر وہاں لٹکائے تھے۔

”شاہی بینڈ ہاؤس۔ پوپ ساگ کے ایکسپریٹ۔ بلو بھائی۔“

”رائل ڈانس اکیڈمی۔ استاد اچھے خان ولد ستارہ ہندوستان تو خان۔“

”ناچ ناچ گھر۔ ہر قسم کے ناچ کی ٹریننگ۔“

”ملٹری بینڈ سروس۔ یہاں بگل بجانا بھی سکھایا جاتا ہے۔“

”ہالی وڈ ایکٹنگ اکیڈمی۔“

”بھائی گلو حسین بھائی گیٹ والے کا گنار سکول۔ اور باگڈورم۔“

ہم یہ سائن بورڈ پڑھتے رہے۔ اور بار بار گھڑیاں دیکھتے رہے کہ آٹھ بج چکے تھے اور ابھی تک ہمارا سفر شروع نہیں ہوا تھا۔

اور شیڈیول کے مطابق ہمیں آج شام۔۔۔ بشام میں ہونا تھا۔

بشام۔۔۔ سندھ کے کنارے۔ ایک ناممکن آرزو ہو رہی تھی۔

ویگن کے نیچے روپوش ہونے والے پہلے چھوٹے کے بعد ایک اور چھوٹا بچی فینڈ میں جھولتا آیا اور اس نے اپنی مردانگی ظاہر کرنے کے لیے شلوار میں ہاتھ ڈال کر ایک کھجلی کی حالانکہ فی الحال دس برس کی عمر میں وہاں کھلانے کے لیے بہت کچھ نہ تھا اور وہ بھی ویگن کے نیچے لیٹ کر سرکتا ہوا غائب ہو گیا۔

تقریباً ایک گھنٹے کے بعد ایئر کنڈیشنر کی ہیٹ تھدیل ہوئی۔ حکیم نے حکمت سے سر ہلاتا اور ہم موٹر وے کے مسافر ہو گئے۔ جانب اسلام آباد۔

اس برس بھی میری ٹیم میں وہی آزمودہ چہرے تھے جو ہر برس میرا ساتھ دیتے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کی طفیل میں ہر برس شمال کو جا سکتا تھا۔ یہ میرا خیال رکھتے تھے۔ میرا سہارا بننے تھے۔ البتہ ایک چہرہ ایسا تھا جو ایک مدت کے بعد ہمارے سفر میں شریک ہوا تھا۔

یہ عامر کے ٹو تھا۔

عامر کے ٹو اس لیے کہ ایک عامر ہمارے ہمراہ ناراض ناراض۔ روٹھا ہوا ”سنو لیک“ کے ٹریک میں چلا تھا۔

اُس عامر سے اس عامر کو الگ کرنے کے لیے یہ کہہ کر تھا جو میرے پہلے بڑے ٹریک میں۔۔۔ ”کے نو کہانی“ میں میرا ساتھی تھا۔

عامر کے نوعیت کا بُرا نہ تھا لیکن ہر برس شدید خواہش کے باوجود اپنے کاروباری جمیلیوں کے جال میں پھنس کر رہ جاتا تھا اور ہمارا ساتھ نہ دے سکتا تھا۔

اس برس بھی ہمیں یقین نہ تھا کہ وہ آخری لمحوں میں نمودار ہوگا یا نہیں۔ لیکن وہ ہو گیا۔

یہ وہی تھا جس نے بیافو کی برفوں کے آغاز میں واقع کورڈون کیسپنگ میں یہ خواہش کی تھی کہ تارڑ صاحب ہم کبھی نہ کبھی یہاں سے کنگورڈیا جانے کی بجائے اوپر بیافو پر جائیں گے اور سنو لیک تک پہنچیں گے لیکن وہ نہ جاسکا تھا۔ اور آج جارہا تھا۔ اپنی یکتا جس مزاج۔ اور دنیا کے بارے میں ایک الگ فکیر نظر رکھنے کی اہلیت اور دل کو خوشی دینے والی اپنی شخصیت کے ہمراہ۔ ہمارے ساتھ جارہا تھا۔

مجھے صرف یہ قلق تھا کہ ایک اور نہایت بلند پایہ جگت باز خان سلیم ہمارے ساتھ نہ تھا۔ شاید ایک میان میں دو تلواریں۔ عامر اور سلیم نہیں سہا سکتی تھیں۔

ایک چہرہ۔ سلمان کا تھا جسے میاں صاحب ہمیشہ مسلمان کہتے تھے۔

سلمان میرے ہمراہ دیوسانی کو عبور کر چکا تھا۔ ”سنو لیک“ پر گڈی اڑانے کی کوشش کر چکا تھا لیکن پھر وہ آسٹریلیا چلا گیا۔ وہاں کے پاسیوں کے علاوہ وہاں کے کنگوروؤں نے بھی اسے بے حد پسند کیا۔ وہ بنجر زمینوں سے بھی پیار کشید کر لینے والا ایک گولومولو بچہ تھا۔ پھر وہ آسٹریلیا سے امریکہ سدھار اور وہاں سے واپس آیا تو سیدھا اس بٹام جانے والی دین میں آ بیٹھا۔ بنیادی طور پر وہ ایک بچہ جاسوس تھا جو میری ہر حرکت پر کڑی نظر رکھتا تھا کہ سرجی اگر آپ ایسا کریں گے تو میں واپس جا کر بھر جانی کو رپورٹ کر دوں گا۔ بتا دوں گا کہ آپ پہاڑوں میں جا کر اپنی جان کی پروا نہیں کرتے۔ مسخریاں کرتے ہیں۔

عامر کے ٹو اور سلمان کے علاوہ اس برس ہمارے درمیان پہلی بار ایک اور نہایت اجنبی اور ناقابل بیان سا چہرہ بھی تھا۔ بس یوں جان لیجیے کہ یہ چہرہ ایسے مجرمانہ خدو خال کا حامل تھا کہ اس کی تصویر کسی بھی تھانے میں آویزاں ہو سکتی تھی اور اس کے نیچے ”موسٹ وائنڈ“ کے علاوہ دس لاکھ روپے کے انعام کی نوید ”زندہ یا مردہ“ کے عنوان سے درج ہو سکتی تھی۔ لیکن اس چہرے پر آپ اتنی معصوم نرمی اور الفت بھی دیکھ سکتے تھے کہ وہ محض ایک کونہل کے لیے۔ سندھ کے اوپر پرواز کرتے ایک راج ہنس۔ برف کے ایک ڈرے اور فیوری میڈ وین کھٹنے والے ایک پھول کے لیے بھی پھسل کر بہہ جاتا تھا۔

یہ ”مجرم“ ڈاکٹر عباس برمانی تھا۔

ایک زمانے میں وہ اپنی جناتی پنڈ رائٹنگ میں مجھے اپنے نہایت عجوبہ سرفروں کی داستانیں لکھا کرتا تھا۔ اور ایسے انداز میں کہ میری خواہش تھی کہ وہ کچھ نہ کچھ کتابی صورت میں بھی

لکھے۔ پھر ہماری ملاقات ہوئی تو ایک فین، ایک دوست میں بدل گیا۔ اس نے میری فرمائش پر ”کیلاش کٹھا“ اور ”میرا سندھو سائیں“ ایسے کمال کے سفر نامے لکھے۔ لیکن اُس میں ایک بہت بڑی خامی تھی۔ وہ نہایت نامناسب انداز میں اتنے دھمے اور سرگوشی سے بھی کم دھمے پن میں بولنے والا ہے کہ سننے والا صرف نہایت تنگ دود کرنے کے بعد ہی اندازہ لگا سکتا ہے کہ اس ڈاکٹر نے کیا کہا ہے۔ کیا برمانی نے یہ کہا ہے کہ مارکس کا فلسفہ اقتصادیات اب بھی اہمیت رکھتا ہے۔ یا یہ کہا ہے کہ سائیں آپ جہنم میں جاؤ، مجھے نیند آرہی ہے۔ کچھ پتہ نہ چلتا تھا۔

ایک ایسا شخص جو بیک وقت ایک سفید چوٹی اور ایک سفید گھوڑی کے عشق میں جھکا ہو، اس کے بارے میں کیا پتہ چل سکتا ہے۔

باقی وہی، آزر دو۔ سالخورہ۔ اور ساتھ دینے والے چہرے تھے۔ حسن، شاہد، میاں صاحب! حسن کو اپنی بیگم سے جدا ہونے ابھی دو گھنٹے نہ ہوئے تھے کہ وہ ان کے لیے اداس ہو گئے اور اتنی بے قراری سے کوئی پی سی او تلاش کرنے لگے جتنی بے قراری سے کوئی نہایت دباؤ میں آیا ہوا شخص ناکت تلاش کرتا ہے۔

شاہد صاحب۔ سیاہ چشمے اور سُرخ پی کیپ میں اپنے سچ گراں مایہ کو چھپاتے جاسوس بنے بیٹھے تھے اور حسب سابق ٹیم کے حساب کتاب کے انچارج تھے۔ ٹیم کا کل کیش ان کی بیلٹ کے بٹوں میں پھولا ہوا تھا اور وہ اس کی حفاظت اس طرح کرتے تھے جیسے کروسیڈ کو جانے والا کوئی شکی نائٹ اپنی بیوی یا محبوبہ کی کمر کے ساتھ ایک ”جسٹسٹی بیلٹ“ باندھ کر اسے مقفل کر کے اس کی چابی اپنی ذرہ بکتر میں سنبھال کر ساتھ لے جاتا تھا تا کہ بیوی یا محبوبہ اس کی غیر موجودگی میں پتھر سے نہ اڑانے لگے۔

یہ الگ بات کہ پتھر سے پتھر بھی اڑ جاتے تھے۔

میاں صاحب حسب معمول چہریرے و چہیرے۔ اور اپنے لاہوری لہجے میں ”ر“ کو ”ز“ سے بدلتے اور ”ز“ کو ”ر“ بولتے۔ یعنی چہریرے و چہیرے۔

کلر کبار کی چڑھائی آئی تو دین گنگا نے لگی۔ بچکیاں لینے لگی اور کھڑی ہو گئی۔

”اب کیا ہوا ہے؟“

”پتہ نہیں۔“ نیم حکیم نے کہا۔

اس نے ریڈی ایٹر کا ڈھکن کھولا تو اس میں سے اُبلتا ہوا گرم پانی ایک فوارے کی مانند

بلند ہوا۔ سرد اور گرم کی اطلاع کرنے والی سوئی گرم کے سرخ نشان سے بھی اوپر لرز رہی تھی۔ نیم حکیم کبھی ریڈی ایٹر کے ڈھکن کو سونگھتا کبھی سر ہلاتا اور کبھی کہتا کہ گیس بن رہی ہے اور خارج ہو رہی ہے۔ ابھی ٹھیک ہو جائے گی۔

ہم ویگن سے باہر کڑی دھوپ میں بے آسرا کھڑے رہے۔ تاکہ گیس بنتی رہے اور خارج ہوتی رہے۔

ہمارے سفر کی شروعات اچھی نہ تھیں۔ ٹھکون بڑے تھے۔

آغاز سفر کی نشہ آور شمعوں کے پہلے جو آج سویر ہمارے تن بدن میں سے پھوٹ رہے تھے۔ ہر پہلے کسی ایک منزل کی نوید دے رہا تھا۔ بشام۔ گلگت۔ سکرو۔ ہوشے۔ تو یہ سب پہلے کلر کہار کی دھوپ میں ایک ایک کر کے پھٹتے جاتے تھے، ہموار ہوتے جاتے تھے۔ پہلے ایئر کنڈیشنر کی سیٹ بدلنے کے باوجود ہمیں اس کی سرد راحت نصیب نہ ہوئی اور اب یہ ریڈی ایٹر جس کا گرم پانی ڈھکن پر زور لگاتا چمکتا تھا اور وہ نامہ نیم۔ نیم حکیم بس اس ڈھکن کو سونگھتا تھا اور کہتا تھا ”ابھی ٹھیک ہو جائے گی۔“

”تم نے تو کہا تھا کہ گاڑی بالکل برینڈ نیو ہے۔“

”میں نے نہیں، مالکوں نے کہا تھا۔“

میں نے بے دھیانی میں وہی سوال پھر سے کر دیا اور اس نے وہی جواب دیا جو وہ پہلے دے چکا تھا۔

کلر کہار کی دھولانوں پر۔ موٹر دے کے لیے ترانے گئے سرخ پہاڑوں کے درمیان، کاریں رینگ رہی تھیں۔ ٹرک اور بسیں چڑھائی پر بے بس تھے اور سناکت لگتے تھے۔ زور لگاتے مگر سناکت لگتے تھے۔

ایسی چڑھائیوں پر مجھے سب سے زیادہ ترس فلی لوڈ ڈرائیروں اور ٹرکوں پر آتا ہے جو لاچار نظر آتے ہیں۔ ایک زخمی کھوڑے کی مانند بے چارے رینگتے ہیں، زور لگاتے ہیں اور ان کے پیچھے پھرتے پھرتے کو آتے ہیں۔

ہم تو رینگ بھی نہیں رہے تھے کڑی دھوپ میں کھڑے تھے۔

کلر کہار سے بشام آن انڈس ایک دور کی آواز تھی۔ ہمیں آج شام تک۔ رات گئے تک بھی اس آواز تک پہنچنا تھا اور نہ کوہ نور دوں کا پورا شیڈیول درہم برہم ہو جانے کا خدشہ تھا۔ پھر کسی کو

ایئر جنسی فون کا خیال آیا جو موٹر دے کے کنارے پر دکھائی دے رہا تھا۔۔۔ سلمان اور برہمانی نے نزدیکی فون تک کو نیک مارچ کی اور امداد کی درخواست کی۔ اور ہمیں بے حد خوشگوار حیرت ہوئی جب چند لمحوں بعد نہایت سمارٹ اور مددگار قسم کی پولیس موقع واردات پر پہنچ گئی۔

”تارڑ صاحب ہم آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو اسلام آباد پہنچا دیتے ہیں۔ ویگن بعد میں آتی رہے گی۔“

”شکر یہ۔ لیکن یہ ویگن آتی نہیں رہے گی کیونکہ اس کی عمومی صحت اچھی نہیں ہے اور ڈرائیور بھی نیم حکیم ہے۔ اس ویگن میں ہم سب کے گھر اور ان کی آرائش کے سامان ہیں۔ اور ہمیں صرف اسلام آباد نہیں بہت آگے جانا ہے۔“

بالآخر فیصلہ ہوا کہ ایئر کنڈیشنر آف کر دیا جائے۔ خاموشی اختیار کر لی جائے۔ دعاؤں کا ورد کیا جائے۔ اور ویگن کو ہولے ہولے چلایا جائے۔ ہر دو چار کلومیٹر کے بعد جب پانی زیادہ اٹھنے لگے تو اسے روک کر ٹھنڈا ہونے کا موقع دیا جائے۔ چند کلومیٹر تک موٹر دے وے پولیس ہمارے آس پاس منڈلاتی رہتی اور پھر ہماری سست روی سے ٹک آ کر ہمیں سیٹ کر کے اباؤٹ ٹرن ہو گئی۔

”راولپنڈی میں استاد زاہد کی ورکشاپ تک پہنچ جائیں تو وہ اسے ایک دن میں پھر سے چالو کر دے گا۔“ نیم حکیم نے خوش خبری دی۔

یعنی آج رات راولپنڈی میں ہو جائے گی۔ کہاں ٹھہریں گے۔ کیا کریں گے۔ اور کوہ نور دوں کا شیڈیول۔

اور راولپنڈی میں نالہ لیہ کے کناروں پر ایک اور گرم اور موہل آئل سے لتھڑی اور کاروں کے ڈھانچوں سے مزین ایک ورکشاپ میں ہماری ویگن ہولے ہولے ہو گئی اُترتی۔ جہاں نالہ لیہ میں حالیہ سیلاب کی تباہ کاریاں، دروازوں اور دیواروں سے اوپر اپنے نشان چھوڑ چکی تھیں اور اس ورکشاپ کے پتھر، جھاڑیاں، چھوٹوں کے چہرے یہاں تک کہ وصول بھی موہل آئل سے سیاہ تھی۔

استاد زاہد ذرا صحت مند مونا پے والا اپنے کام کو تھرو اینڈ تھرو جانے والا کہ وہ بھی کبھی اسی ورکشاپ میں ایک ”چھوٹا“ تھا۔ ریڈی ایٹر کا ڈھکن اٹھا کر اسے سونگھتے ہوئے بولا۔ ”ریڈی ایٹر فٹ ہے۔ صرف اس ڈھکن کے پیچ کھولے ہو گئے ہیں اور ہوا ایک ہوتی ہے۔ بس ڈھکن بدل

دیں تو ویگن فٹ ہے جناب۔ تارڑ صاحب آپ اس کے مسافر نہ ہوتے تو ہم اس کا انجر پنجر کھولتے سارا دن لگا کر۔ اور پھر چپکے سے دھکن بدل دیتے۔ لیکن آپ تو ہمارے چاچا جی ہیں۔ فٹ ہے۔“

”کیا گلگت تک جانے کے لیے بھی فٹ ہے؟“
 ”بادشاہ اسے بے شک لنڈن لے جاؤ۔ فٹ ہے۔“
 ”فٹ ہے۔“ ٹیم مہران نے نعرہ لگایا۔

”بشام کی شام۔ برسین کی سویرا اور چلاس کا انصاف“

ویگن۔ ٹیکسلا اور واہ میں سے گزرتی جا رہی تھی۔
 اور ہم سب دم رو کے بیٹھے تھے۔ چپ تھے کہ کہیں ریڈی ایٹر پھر سے نہ ابل پڑے لیکن ویگن واقعی فٹ تھی۔

ہم نے جو دم روکا ہوا تھا، اس دم کو لینے کے لیے ہم حسن ابدال میں رُکے۔ وہاں سستانے اور باقاعدہ فروکش ہو کر کھانے کی بجائے ہم نے وہاں کے نہایت خستہ پکوڑے اور مچھلی خریدی۔ گرم روٹیاں حاصل کیں اور پھر سے رواں ہو گئے کہ ہنوز بشام دور است۔
 ہری سنگھ کا ہری پور، ایٹ کا ایٹ آباد۔ مان سنگھ کا مانسہرہ۔ اشوک اعظم کے پتھروں پر کھدے فرمان۔ اور پھر ”ہوٹل خنجراب“ گزرا جسے دیکھ کر اکثر سیاح اس غلطی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ بس اب تو وڑہ خنجراب کہیں آس پاس ہی ہے جب کہ وہ ابھی تین روز کی مسافت پر ہوتا ہے۔ بھل۔ چھتر پلین۔ چائے کے باغ، جنگل منگل۔
 اور جنگل منگل میں شام ہونے لگی۔

ہم ابھی تک دم رو کے بیٹھے تھے۔ یہاں تک کہ مسلمان بھی گفتگو سے پرہیز کر رہا تھا کہ کہیں ویگن کے میکا کی نظام میں کوئی اور ضلل نمودار نہ ہو جائے۔
 شام کے بعد ظاہر ہے رات اُتری اور گہری ہوتی گئی۔ اور اس کی گہرائی میں ہمارے دل ڈوبتے تھے۔

پھر ایک بہاؤ کا ہلکا شور ہمارے کانوں میں اُترا۔ یہ ہمارے کانوں کے لیے موسیقی تھا۔
 تھوون یا موٹزارٹ کی کسی سمفنی سے بڑھ کر مترنم تھا کہ یہ شیرور یا کارکسٹرا تھا جو ہمارے کانوں

میں بہتا آ رہا تھا۔

تھا کوٹ کا پل۔ رات کی تاریکی میں دیگن کی ہیڈ لائٹس سے روشن ہوا اور ہم تنہا تھے جو اس کے پار جاتے تھے۔

بشام دور نہ تھا۔ سندھ کے پار ہوئے تو بشام دور نہ تھا۔

ہمیں سفر نے تو نہیں اس ذہنی اذیت نے تھکا دیا تھا جو دیگن کی خرابیوں نے ہم پر مسلط کر دی تھی۔

ہم ابھی تک ٹپ تھے۔ دم رو کے ہوئے تھے اور تب ہم نے دریائے سندھ کے اوپر بہت بلندی سے نیچے دریا کے کنارے ایک ایسے تاج محل کو دیکھا جس کی روشنیاں پانیوں میں ٹٹمتی تھیں۔

پانی ڈی سی موئل بشام۔ کمرہ نمبر ۲۲۔

بہت سے لوگ اپنے آپ کو خوش نصیب تب گردانتے ہیں جب وہ ایک سکوتر سے اتر کر ایک مرسیڈس میں بیٹھ جائیں۔ موچی دروازے کے گھر سے ڈیفنس کے ہنگلے میں منتقل ہو جائیں۔ شیدا قلنیاں والا کی بجائے ترقی کرتے ہوئے ملک آکس کریم پارلر کی ایک ملک گیر چین کے مالک ہو جائیں۔ لال کھوئی والے فیٹے حلوائی کی بجائے رفیق سویت ہاؤس کی لاجواب برنی کے پروپرائٹر ہو جائیں یا اپنی خالہ زاد بیوی خورشید بانو کی بجائے۔ بلکہ اس کے بعد آپ ایٹور یا رائے جیسی کسی خاتون کے شوہر ہو جائیں۔ لیکن میری خوش نصیبی کے پیمانے ذرا مختلف رہے ہیں۔

میں اپنے آپ کو خوش نصیب تب گردانتا ہوں جب۔ شاہ گوری مجھے اپنا گورا بدن دکھلا دے اور اس کی برفوں پر میری نظروں کے بوسوں کے نیل ہوں۔ جھیل کرومہر کے پانی مجھے آغوش میں لے لیں۔ یا۔ بشام موئل میں مجھے کمرہ نمبر ۲۲ مل جائے۔ جی ہاں۔ یہ کمرہ نمبر ۲۲ میرے لیے ایک بڑی خوش نصیبی ہے کہ اس کی بالکونی سندھ پر یوں ٹھکتی ہے کہ اس کی سفید آہنی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے یہ مہران۔ یہ اندس آپ کے نیچے ہو لے ہو لے بہتا ہے اور یوں بہتا ہے کہ اس کے پار جو پہاڑیاں ہیں، ان کے کھیتوں میں جو اکا دکا جھونپڑے ہیں اور ان میں سے کسی ایک جھونپڑے میں اگر ایک لائین یا دریا روشن ہے تو اس کی روشنی دریا کی سطح پر پڑتی ہے۔ دریا بہتا چلا جاتا ہے لیکن اس لائین اس ایک دیئے کی روشنی وہیں ایک ہی مقام پر ٹھہری رہتی ہے۔

یہ منظر ایسا ہے کہ بے شک آپ کے ایئر کنڈیشنر کی ہیٹ خراب ہو جائے۔ ریڈی ایٹر اُبلنے لگے۔ آج دوپہر آپ راولپنڈی میں استاد زاہد کی موئل آئل سے تھڑی ورکشاپ میں نا اُمید اور مایوس بیٹھے ہوں۔ تو آپ یہ سب آفات بھلا دیتے ہیں اور کمرہ نمبر ۲۲ کے نیچے۔ سندھ کی سیلیٹی چادر کو سر کئے۔ گزرتے۔ دیکھتے جاتے ہیں اور سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ گئی رات تھی اور کمرہ نمبر ۲۲ کی بالکونی تھی۔

میرے ہمراہ حسن اور برمانی سفید آہنی کرسیوں پر براجمان تھے اور وہ بھی بھول چکے تھے کہ آج ہمارے ساتھ کیا کیا ظلم ہوئے تھے۔ اگر ہوئے تھے تو کن زمانوں میں ہوئے تھے۔ کیا یہ آج کی سویر تھی جس میں ہم شاہ نور سلوڈیو کی قربت میں بینڈ باجوں اور ڈانس اکیڈمیوں کے اشتہار پڑھتے تھے۔

اور کھر کھار میں وہ قہر انگیز دھوپ جو ہماری بے بسی کو جھلساتی تھی۔ وہ آج دوپہر کی بات ہے۔ وہی کھر کھار جس کے آس پاس ننڈانا کا وہ قلعہ تھا جہاں محمود غزنوی کے سپاہیوں کی قبریں تھیں اور جہاں بیٹھ کر البیرونی نے زمین کا گھیر ماپا تھا۔ جہاں محض ایک ڈھکن کی خرابی کے باعث ہم بے بس اور غمگین اور لاچار ہوئے تھے۔ یہ تو کسی اور صدی میں ہوا تھا۔ یہ قلعہ تو جانے کن زمانوں کا ہے۔

ہم سب کچھ بھول چکے تھے اور کمرہ نمبر ۲۲ کی بالکونی میں بیٹھے۔ گئی رات تک بیٹھے دریائے سندھ کی چادر پر کسی ایک لائین۔ کسی ایک دیئے کی روشنی کو اس پر عکس ہوتے دیکھتے رہے۔

اور جب سویر ہوئی۔ بشام میں سویر ہوئی تو میں اپنی مختصر نیند کے بعد جاگا تو میں نے دیکھا۔ بالکونی میں آکر دیکھا کہ سندھ کے پار جو پہاڑیاں تھیں، وہ گہری دھند میں گم تھیں۔

میں کمرہ نمبر ۲۲ سے نکل کر۔ نیچے دریا تک چلا گیا۔

ابھی سویر تھی اور سندھ پر دھند تھی۔

میں بہت بار اس کنارے پر اُترا تھا۔ پچھلے میں بائیس برسوں میں شاید پندرہ سولہ بار۔ لیکن ہر بار یہی کنارہ نہ تھا۔ یہی دریا نہ تھا۔ یہ ہمیشہ کسی اور منظر میں ہوتا تھا۔ یہ ہمیشہ مجھے ایک الگ سی خوشی دیتا تھا۔

وہاں وہ بڑا پتھر تھا جس پر بیٹھ کر۔ بمشکل بیٹھ کر کئی برس پہلے یعنی نے تصویر کھینچی تھی۔

”ہیں پر میرے بیٹے نے میری چٹیل کو سندھ میں پھینکا تھا کہ اب وہ بوڑھا انتظار کر رہا ہوگا۔ اور ایک پتھر ایسا بھی تھا جس پر ایک ناسودہ تمنا براجمان تھی۔“

میں نے اس ناسودہ تمنا سے دریافت کیا کہ تم کون ہو؟

”تو اس نے کہا“ میں ازل سے ہوں۔ کمرہ نمبر ۲۲ کی بے چکن چادر کی ایک سلوٹ بنا چاہتی ہوں۔ میں شیردریا سندھ کی روانی کو کھنکھاتی تمہارا انتظار کرتی ہوں۔ میں ازل سے ہوں اور اب تک رہوں گی۔“

اور کون ابدا انتظار کرتا ہے۔

بشام سے اگلا ساپ ظاہر ہے داسو کے پل کے پار ناشتے کے لیے برسین موٹل میں تھا۔ دریائے سندھ کے اوپر۔ شاہراہ قراقرم سے اوپر ایک دیران تنہائی میں معلق یہ برسین۔ سلمان جو مکمل طور پر آسٹریلوی ہو چکا تھا۔ اور اپنے تن و قوش کے حوالے سے نہ کنگرو ہوا تھا اور نہ کوالا بیئر۔ اپنے نئے وطن کی یاد میں جذباتی ہو کر کہہ رہا تھا۔ ”سرجی یہ برسین ہے یا برزین۔“

”برزین؟“

”جی سرجی۔ ایک تو آپ کا جغرافیہ بڑا کمزور ہے۔ سرجی آسٹریلیا کا بڑا مشہور شہر ہے۔ میں ایک مرتبہ وہاں گیا تھا۔ وہاں بڑے زبردست رنگارنگ طوطے ہوتے ہیں۔ آبشاریں اور زرد پھول ہوتے ہیں۔“

”ہوں گے۔“ میں نے بیزار ہو کر کہا۔ ”لیکن تمہارا برزین میرے برسین سے بہتر نہیں ہو سکتا۔ کیا وہاں بھی میرے سندھو سائیں ایسا کوئی دریا ہے۔؟“

”دریا تو نہیں سرجی۔ لیکن۔۔۔ کچھ ندیاں ہیں جذباتی قسم کی۔“ وہ ایک بھالو کی مانند جو کہ وہ تھا، ناراض ہو گیا۔

اس برسین میں۔۔۔ یا برزین میں ہم نے حسب روایت۔۔۔ پچھلے درجنوں برسوں کی روایت کے مطابق ناشتہ کیا۔ اور اسی روایت کی پیروی میں۔۔۔ میں نے موٹل کے ایک کمرے میں جا کر کچھ دیر کے لیے اپنے آپ کو مکمل طور پر تنہا کیا۔

اور اس تنہائی میں بشام کے سندھ کنارے اُس پتھر پر براجمان ناسودہ تمنا نے اپنی

چسب دکھائی اور چلی گئی۔ میں آج تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ دریائے سندھ کے اوپر ایک پتھر کیلے پتھر علاقے میں برسین کا جو موٹل ہے، اس کے کسی ایک کمرے کی تنہائی مجھے اپنا تمنا کی کیوں کرتی ہے۔ اُس کمرے میں ایک اچھے ہوٹل کی تمام تر سہولتیں میسر ہیں۔ صاف ستھرا باتھ روم ہے، تو لیے ہیں، فرش پر قالین اور بستر پر چادریں ہیں اور خوراک بھی مناسب مل جاتی ہے۔ اور یہ کمرہ ایک دیرانے میں ایک پتھر کیلے دیرانے کی بلندی پر دنیا جہان سے کٹا ہوا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میں ایک سہولت آمیز زندگی بھی چاہتا ہوں اور ایک دیرانہ بھی۔ نہ میں محض سہولت آمیز زندگی میں خوش رہتا ہوں اور نہ مجھ میں دیرانے کی سختیاں برداشت کرنے کا حوصلہ ہے تو برسین کا یہ کمرہ میری ان دونوں خواہشوں کو یکجا کرتا ہے۔ شاید اس لیے۔۔۔ برسین سے آگے گئے تو چلاس میں ایک وقوعہ ہو گیا۔

چلاس میں بہت کم لوگ رکتے ہیں۔ رکتے ہیں تو مجبوراً رکتے ہیں۔ اس میں جہاں اس کے گرم ویران اور چٹیل ہونے کا عمل دخل ہے، وہاں اس کے باشندوں کے کھر درے پن اور باہر سے آنے والوں کے لیے ایک ناپسندیدگی کا عنصر بھی شامل ہے۔ یوں بھی چلاس شہر شاہراہ سے اوپر کہیں واقع ہے اور اس بستی کی کوئی ایک عمارت بھی شاہراہ سے نظر نہیں آتی۔ سوائے ایک بورڈ کے جو آپ کو اطلاع کرتا ہے کہ چلاس کہیں اوپر چٹانوں کی آغوش میں ہے۔

چٹانوں کو کوئی بھی رکتا ہے، مجبوراً رکتا ہے۔ کھانے کے لیے۔۔۔ چائے کے لیے یا پٹرول یا ڈیزل حاصل کرنے کے لیے۔

ہم بھی اپنی دیگن کا پیٹ بھرنے کے لیے سب سے پہلے۔ ایک پولیس چوکی کے سامنے واقع پٹرول پمپ میں ڈیزل حاصل کرنے کے لیے رکے۔

پٹرول پمپ کا انچارج ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی پر لیٹا ہوا ہمیں پمپ کے اندر آتے ہوئے ناپسندیدگی سے دیکھتا تھا کہ میں آرام کرنے کے موڈ میں ہوں اور یہ کہاں سے آگئے ہیں۔ اس نے ایک چھوٹے کوآواز دی اور وہ چھوٹا جو بہت ہی چھوٹا تھا، نہایت بُری بُری شکلیں بناتا آیا۔ ہینڈل کو ٹپک سے اٹھایا اور دیگن کی نیکی میں فٹ کر کے اسے دبا دیا۔ ہم سب نے فوراً ٹوٹ کیا کہ میٹر زیرو پر نہیں تھا بلکہ ۱۷ کے ہند سے پر تھا۔ ہم نے احتجاج کیا کہ بھائی آپ میٹر کو زیرو پر نہیں لائے تو وہ چھوٹا خفا ہو گیا اور کہنے لگا۔ زیرو کیا۔ زیرو کیا۔ اور ہم نے بھی خفا ہو کر کہا، نہیں کیا نہیں کیا۔ اتنی دیر میں انچارج صاحب اپنے بدن کے مختلف حصوں میں خارش کرتے آگئے اور انہوں نے بھی چھوٹے کا ساتھ دیا۔ ہم نے چپکے سے ادائیگی کر دی۔ تقریباً تین سو روپے زائد ادائیگی

”رائے کوٹ جہاں دل رکتا ہے.. شکور سے ملاقات“

چلاس کے بعد ونگین نے بہر طور رائے کوٹ پل پر رکتا تھا اور اس کے ساتھ میرے دل نے بھی رکتا تھا کہ اوپر فیئر میڈو تھا..

اور نیچے شگر پلا کے متروک شدہ ہوٹل کے آس پاس اوپر جانے والی جینیں تھیں۔ پورٹر اور گائیڈ تھے.. اور شکور تھا.. رزق روزگار کی آس میں بیٹھا سرخ بالوں والا شکور تھا جو آج سے کتنے برس پیشتر.. اٹھارہ برس.. بیس برس.. جانے کتنے برس پیشتر مجھے فیئر میڈو میں ملا تھا.. پھر جب میں اپنے خاندان سمیت اوپر گیا تھا تو وہ مجھے سلوک اور نمبر کونا لگا پرست کے بیس کیپ تک لے کر گیا تھا اور واپسی پر بیمار سلوک کو کندھوں پر اٹھا کر لایا تھا.. اور پچھلے برس رحمت نبی کی کیپنگ سائٹ میں وہ پھر مجھے خاص طور پر ملنے آیا تھا اور فیئر میڈو کی فلم کا ایک اہم کردار ہوا تھا..

وہ بوڑھا ہو چکا تھا اور اس کا سرخ بالوں والا سر لرزش میں تھا.. چہرے کی ٹھنریاں گہری ہو گئی تھیں.. وہ ایک آئینہ تھا اور میں اس میں اپنے آپ کو دیکھ سکتا تھا.. مجھے وہ شام یاد آئی جب کئی برس پہلے وہ اپنی رائے کوٹ گلیشیر کی برفوں میں گمشدہ گائے کو پکارتا تھا اور وہ جواب دیتی تھی..

”والدہ کیسی ہیں؟“

والدہ وہ میری بیوی میمونہ کو کہتا تھا.. اور ان دنوں میمونہ نے والدہ کہے جانے پر بے حد مایوس کیا تھا کہ یہ بوڑھا کس سلسلے میں مجھے والدہ کہتا ہے تو اس نے کہا تھا.. بیگم صاحبہ میں تو آپ کے پیارے بچوں کے حوالے سے ان کی والدہ کہتا ہوں.. ماں ہونے کی حیثیت سے ماں کہتا ہوں..

”بچہ لوگ کیسا ہے صاحب؟“

صرف اس لیے کر دی کہ ہم بحث نہیں کرنا چاہتے تھے.. یہاں چلاس ایسی جگہ پر لڑائی جھگڑا نہیں کرنا چاہتے تھے.. اپنا سفر کھوٹا نہیں کرنا چاہتے تھے.. لیکن یہ صریحاً بے ایمانی تھی اور ہمیں بہت دکھ ہوا.. اور جلتی پر انچارج صاحب نے تیل یہ چھڑکا کہ ہمیں بے ایمان کہتے ہو.. جاؤ جا کر پولیس کو رپٹ دے دو.. ہم نے سوچا یہاں کے پولیس والے بھی انہی کے بھائی بند ہیں.. ہو سکتا ہے ہمیں اٹا اندر کر دیں لیکن ہم بھی تاؤ کھا گئے اور سامنے پولیس کی چوکی میں جا کر فریاد کر دی.. ڈیوٹی پر موجود پولیس والے نے حیرت انگیز طور پر ہماری بات قتل سے سنی اور پھر ایک سادہ کاغذ پر اس وقت سے کی تفصیل لکھنے کو کہا جو ہم نے لکھ دی..

”آپ جاؤ ہم کا رروائی کرے گا اور تم کو اطلاع کر دے گا..“

کوئی کارروائی اور کوئی اطلاع.. ہمارے لیوں پر ایک حقارت انگیز قسم تھا.. اس سفر سے واپسی پر.. ایک ہفتے کے بعد لاہور میں مجھے تین سو روپے کا ایک مٹی آرڈر وصول ہوتا ہے جس کی سلیپ پر لکھا ہے.. ”آپ کی رپورٹ پر استغاثہ مرتب ہو کر عدالت میں پیش کیا گیا تھا جہاں سے ملزم کو مبلغ ایک ہزار روپے جرمانہ کے علاوہ آپ کی زائد رقم کی وصولی بھی ہوئی تھی جس کو آپ کی خدمت میں بھیجا جا رہا ہے.. از طرف.. عبدالسعید.. ایس ایچ او تھا نہ چلاس.. ضلع دیامر..“

میرا خیال ہے میری شدید شرمندگی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے..

ہمیں انصاف وہاں سے ملا تھا اور فوری ملا تھا جہاں سے ہمیں اس کی امید تھی.. کم از کم پنجاب پولیس میں تو یہ معجزہ کم کم ہی ہوتا ہوگا..

میں چلاس پولیس کا گرویدہ ہو گیا ہوں اور آئندہ جب کبھی ادھر سے گزروں گا تو ایک عدد ”تھینک یو چلاس پولیس“ کا سلیوٹ کر کے گزروں گا..

میرے رُک سیک میں صرف ایک تصویر تھی۔ یعنی کی شادی کی۔ اس کے برابر میں ظاہر ہے اس کا دولہا بلال براجمان تھا اور دائیں بائیں سلجوق اور شیر کھڑے تھے۔
 ”اچھا۔“ شکور کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ ”بہن تو بہت چھوٹا تھا، ابھی سے اس کا شادی بنا دیا۔“

”تب چھوٹا تھا شکور۔ پھر ڈاکٹر ہو گیا تو شادی بنا دیا۔“

شکور نے یعنی کو بے شمار دعائیں دیں جو سب کی سب میں نے سنبھال لیں اور پھر لاہور واپسی پر انٹرنیٹ پر وائس چیٹ کرتے ہوئے اسے آرلینڈو امریکہ میں پہنچا دیں کہ فیہری میڈ وکا انکل شکور رائے کوٹ پل پر بیٹا تمہارے لیے یہ دعائیں کر رہا تھا۔

”چنار ان میں رحمت نبی کا نزول اور۔۔ محبت کے شگوفے“

گئی شام، ہم گھگٹ میں تھے۔

حسب روایت اور یہ روایت نوثقی نہ تھی ہم چنار ان میں تھے۔ اور وہاں کرم الہی ویٹر ایک بھائی کی مانند میری خدمت کرتا تھا اور افسوس کرتا تھا کہ صاحب آڑو کا موسم ختم ہو گیا ہے ورنہ ضرور پیش کرتا۔ مجھے معلوم ہے آپ کو گھگٹ کے آڑو نمک کے ساتھ بہت پسند ہیں۔ ندیم تھا۔ شیرستان کا نھریوں بھرانہ سرخ و سفید چہرہ تھا اور میری آمد کی خبر گھگٹ کی شب میں یوں پھیلی کہ اکرام بیگ اور فضل صاحب اپنی تمام تر مصروفیتیں ترک کر کے میرے پاس آ گئے۔ اور چنار ان میں دوستی اور خلوص کے شگوفے پھوٹنے لگے۔ اور پھر میں ایک عجیب سے احساس سے دوچار ہوا۔ میں جس کمرے میں تھا، وہ کہیں میری یادداشت کی دھند میں سے باہر آ کر کچھ شاسا لگتا تھا۔ یہ چنار ان کے اولین۔۔ اور بجنیل اور قدیم کمروں میں سے تھا۔ جب یہ موکل تعمیر ہوا تھا تو یہ کمرہ تب سے تھا۔ یہ وہی کمرہ تھا جس میں پتہ نہیں کتنے برس پیشتر ”ہنزہ داستان“ کے زمانوں میں رات کے ایک بجے شاہراہ قراقرم پر اپنے پہلے سفر کے بعد تھکن اور ڈر سے شکستہ۔ داخل ہوا تھا۔ سلجوق کے ہمراہ اُترا تھا۔ اور سلجوق جو آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا اور ذرا لم ڈھینگ ہو رہا تھا، کمرے میں داخل ہوتے ہی ہاتھ روم میں ٹھس گیا تھا نہانے کے لیے۔ اور اندر سے آواز دیتا تھا کہ ابو اس کا نلکا تو لیک کرتا ہے۔ اور وہ نلکا اب بھی لیک کرتا تھا۔ اسی کو روایت کا تسلسل کہتے ہیں۔

گئی رات جب ہم سب۔۔ حسن، برمانی اور میں میند میں مدہوش تھے۔

ایک دستک ہوئی۔

”کون ہے؟“ میں نے نیم غنودگی اور بیزارگی کی ملی جلی کیفیت میں کہا۔

دروازہ کھلا اور ایک مشتہ ساسیہ اندر داخل ہوا۔ اس نے اندر داخل ہوتے ہی برمانی کے پاؤں پکڑ لیے۔ ”تارڑ صاحب۔“

برمانی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ ”سائیں کون ہو تم۔“

”سوری۔“ سائے نے کہا اور آگے بڑھ کر حسن صاحب کے گھٹنوں کو ہاتھ لگا کر بولا۔
”مرشد۔“ حسن صاحب بھی گھبرا گئے۔ ”بھائی جان کس کو ملنا ہے؟“ اور ٹیبل لیپ روشن کر دیا۔
”سوری“ سائے نے پھر معذرت کی اور پھر میرے قریب آ کر پہلے جھک کر اطمینان کیا کہ یہ میں ہوں اور پھر ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”مرشد میں سلام کرنے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ سوری ٹو ڈسٹرب یو۔“

یہ فیئر میڈ کا رحمت نبی تھا۔ جو صبح کے دو بجے نازل ہو گیا تھا۔

”اب میں جاتا ہوں تارڑ صاحب۔ صرف سلام کرنے کے لیے حاضر ہوا تھا۔“

”ہمیں چگا کر اب کہاں جاتے ہو۔ بیٹھو۔“

”میں بھی بیٹھنے ہی آیا تھا۔“ وہ ہنسنے لگا۔

تمام روشنیاں آن کر دی گئیں۔ برمانی اور حسن اپنے اپنے بستروں پر چوڑیاں مار کر بیٹھ گئے۔ ویٹر کرم الہی کو چگا کر اس سے درخواست کی گئی کہ تازہ سلاہ کی ایک طشتری اور مشروبات لے آئے اور محفل جم گئی۔

اور ایسی جمی کہ کھڑکی کے پردوں میں سے صبح کے آثار روشن ہونے لگے۔ اور کھڑکی کے باہر جو سیب کا ایک درخت تھا، اس کی شاخوں میں پنہاں ہر سیب سورج کی پہلی کرنوں سے زرد ہونے لگا۔

”کوہِ ہراموش کی سفید سستی“

جیسے شاہراہِ قراقرم پر درجنوں بار سفر کرنے سے واقفیت تو ہو جاتی ہے لیکن اس کی عادت نہیں ہوتی۔

اس شاہراہ کی بلند خطرناکی کی عادت نہیں ہوتی، بے شک یہ آپ کا چالیسواں پھیرا ہو۔ ہندو بھائی اور ہندو بہن جی اگر ایک آگ کے گرد صرف سات پھیرے لگالیں تو ان کی شادی ہو جاتی ہے۔ یہاں عمر بھر پھیرے لگاتے رہیں تو کچھ نہیں ہوتا۔ ہوتا ہے تو پھر کوئی حادثہ ہی ہوتا ہے۔
تو جیسے شاہراہِ قراقرم کی عادت نہیں ہوتی۔
ایسے سکر دور وڈ کی بھی عادت نہیں ہوتی۔

چاہے آپ ادھر درجنوں باری کیوں نہ آئے ہوں۔ اس کے پھیرے پہ پھیرے کیوں نہ لگاتے ہوں۔ اور یقین کیجیے سکر دور وڈ میں پھیرے بھی بہت ہیں۔ آپ کی ویگن دریائے سندھ کے اوپر ایک تنگ درے میں۔ جس کی چٹانیں بس اب گری کہ اب گری کی دھمکی کے انداز میں جھکی ہوئی ہیں۔ پھیرے لگاتی رہتی ہے۔ ایک دو تین اور گھوم جاؤ۔ ایک دو تین اور۔ یعنی والٹر رقص کے تمام سٹپس یہاں موجود ہیں۔ لیکن رقص آپ نہیں کرتے آپ کی ویگن کرتی ہے اور اگر ایک بھی سٹیپ غلط پڑا تو آپ سیدھے نیچے سندھ میں پڑے اور ایسے پڑے کہ بھیرہ عرب تک آپ کو کوئی نہیں پوچھے گا کہ یہاں کیوں پڑے۔ یہاں تک کہ اندھی ڈولفن بھی نہیں پوچھے گی کہ وہ آپ کو قریب سے بہتا ہوا دیکھ بھی نہیں سکتی گھومتے گھومتے آپ بھی گھوم جاتے ہیں اور پھر لا پروا اور مست ہو جاتے ہیں کہ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔

سکر دو گورج کی چٹانوں میں پہلی ہریا دل سستی میں نظر آتی ہے۔

سندھ جوا کثر شاخوں میں بنا۔۔ ریتلے ٹیلوں اور جزیروں میں خاموشی سے بہتا ہے۔ اس برس پورے جو بن پر ہے۔ ٹیلوں اور جزیروں کو نابود کرتا رواں ہے۔ بھرا ہوا ہے۔ ہم از حد تھکے ہوئے ہیں۔

کم از کم میں تو سب سے زیادہ تھکا ہوا تھا۔ کہ مجھے لاہور میں اگلی صبح کے آثارِ سفر کی فکر مندی نے سونے نہ دیا۔ بٹام میں شیردیا کی لہریں میری نیند میں بہتی رہیں اور پہلی شب رحمت نبی نے مجھے جگائے رکھا۔ رات بھر طالع بیدار نے مجھے سونے نہ دیا۔ اس لیے میں سب سے زیادہ تھکا ہوا تھا۔

اور میں کے ٹوموئل پہنچ کر اپنے اس سفر کو بھول کر ایک آرام دہ بستر پر ڈھیر ہو جانا چاہتا تھا۔

یہ سستی.. ایک بے آب و گیاہ چٹائی صحرا میں جانے کہاں سے بھٹکتی ہوئی آنکلتی ہے۔ اور یہ سستی بھی بے خبر ہے۔

کیونکہ میں یہاں سے جتنی بار بھی گزرا ہوں میں نے سوائے ایک چھوٹی سی آبشار کے.. مٹکی کے چند سر راہ کھیتوں اور کچھ درختوں کے سوا کبھی کسی ذی روح کو نہیں دیکھا۔

صرف ایک ذی روح ہے اس سستی کے عین اوپر سانس لیتا برف سے سفید ہوتا۔ آسمان کی نیلا ہٹ میں بلند ہوتا۔ اور وہ ہے کوہِ ہراموش!

بادلوں اور برفوں کا ایک ڈھیر جو سکر دوڑے میں سستی کے مقام پر جھانکتا نظر آتا ہے۔ ہراموش تک میں جانا چاہتا ہوں۔

یہ میرے مستقبل کے کوہِ نوروی کے منصوبوں میں ترجیحِ اول ہے۔

بڑھتی عمر اور کھٹتی ہمت پر تو میرا اختیار نہیں۔ منصوبے بنانے پر تو میرا اختیار ہے۔ سکر دو روڈ پر سینکڑوں ایسے یکدم موڑ آتے ہیں جن پر مڑتے ہوئے اگر غیر متوقع طور پر سامنے سے ایک اور ویگن یا بس آجائے تو.. اگر آپ اس لمحے محض سگریٹ کا ایک کش لگانے کے لیے سگریٹ منہ تک لے جا رہے ہیں تو بس اتنی دیر میں یا تو آپ اور یا سامنے سے آنے والی ویگن نیچے سندھ میں ہوں گے۔ اور پھر باقی رہے نام اللہ کا.. یا کچھ عرصے کے لیے دریائے سندھ کا۔

ایک مقام باغچہ نامی بھی راستے میں پڑتا ہے۔

اور کیا باغ و بہار قسم کا مقام ہے جہاں اکثر کم کم باد و باراں بھی ہے۔ ہرا بھرا ہے اور سرخ اور زرد رنگ کے پھول کھلا ہے۔ یہ وہ باغچہ.. یعنی باغچہ اطفال ہے جس میں سکر دو روڈ کے سہمے ہوئے بچہ خوف کے مارے ہوئے بچہ مسافر داخل ہوتے ہیں تو ہرے بھرے ہو جاتے ہیں۔

دریا کے پار کبھی کوئی بچہ پوسٹ کارڈ گاؤں نظر آتا ہے۔ چٹانوں سے گرتے کسی سفید ریش آبشار کے دامن میں.. چند گھر.. کچھ کھیت.. پہلو میں کوہ کے ایک جھونپڑا اور یہ آبشار ایک نالے کی صورت اختیار کرتا نیچے سندھ میں گرتا ہوا.. گاؤں تک ایک ٹپل سے سندھ کے آر پار.. کبھی تو سکر دو روڈ ترک کر کے نیچے اتر کر اس ٹپل کے پار اس گاؤں میں جانا چاہیے.. اس آبشار کی پھوار سے ہٹ کر کسی ہرے بھرے کھیت میں خیمہ لگانا چاہیے اور وہاں سے یہ دیکھنا چاہیے کہ سکر دو روڈ پر ریگتی کوئی ایک ویگن.. بلکہ ہماری ویگن کتنی یہ توقف ڈالتی ہوئی اور بے مقصد لگتی ہے۔

دڑھ کھلتا ہے.. سر شام کھلتا ہے.. منظر وسیع ہوتا ہے اور سکر دو کھلتا ہے۔

”کوہ مشاہیرم کی بجائے گندوگور و بیس کیمپ جائیں گے“

چکورا جمیل اس جانب..

ایئر پورٹ اس جانب..

گمبہ چھاؤنی میں سے گذرتے..

اور پھر سکروڈ کے مین بازار کا آغاز۔ دائیں جانب پٹرول پمپ کے برابر میں ”ہمالین نورز“ کا بورڈ آویزاں ہے۔ محمد علی چنگیزی کا سیاحتی ادارہ اور یہاں سے ہمیں آئندہ سفر کے بارے میں نہایت قیمتی معلومات مل سکتی تھیں.. چنانچہ تھوکاوت اپنی جگہ لیکن معلومات اپنی جگہ..

”رک جاؤ..“ میں بہ حیثیت لیڈر حکیم کو حکم دیتا ہوں..

عجیب افیونی سا حکیم ہے.. نہ بات کرتا ہے نہ مسکراتا ہے بس ویگن چلاتا جاتا ہے اور وہ بھی جیسی تھیں.. نہ اسے کھانے میں دلچسپی ہے نہ اسے ہم میں دلچسپی ہے اور نہ ہی وہ اپنے آپ میں دلچسپی لیتا ہے.. ایک معجونی انداز میں.. ویگن چلاتا جاتا ہے اور ہاں کبھی کبھار ذرا اونگھ بھی جاتا ہے اور ہمیں ایک پل کے لیے محسوس ہوتا ہے کہ ویگن ابھی کچھ فری سی ہوگی تھی اور وہ پھر سنبھل جاتا ہے.. ایسے موقعوں پر ہم ویگن روک کر اسے زبردستی چائے پلاتے ہیں، اور پھر اسے اونگھنے سے بچانے کے لیے لطفیے سناتے ہیں.. اس کی زندگی میں خواہ مخواہ دلچسپی لیتے ہیں.. اس کی بند بند آنکھوں کی تعریف کرتے ہیں کہ یہ لگتی تو اچھی ہیں لیکن انہیں ذرا کھولے رکھو تو تمہاری بڑی مہربانی.. سکروڈ روڈ پر وہ پہلی بار آیا تھا اور صرف پانی پیٹ کے لیے آیا تھا.. اور اگر اس حکیم کا کوئی دماغ ہے تو وہ یقیناً سوچتا ہوگا کہ لاہور کے کسی پرائیویٹ پاگل خانے کے مریض ہیں جو فرار ہو گئے ہیں.. ورنہ یہ ننھیالگی یا سوات جاتے.. ادھر کیوں آ گئے ہیں.. آ گئے ہیں تو مجھے ساتھ کیوں لے

آئے ہیں.. اگرچہ میں ایک حکیم ہوں لیکن ان کی حکمت مجھے سمجھ نہیں آتی..

تو میں نے جب ”رک جاؤ“ کہا تو حکیم نے اس کے پورے ایک منٹ بعد ویگن روکی کیونکہ وہ یہی سوچ رہا تھا جو میں نے اوپر بیان کیا ہے.. ویسے ہم جان چکے تھے کہ ہم جو کچھ بھی کہتے تھے، وہ کچھ سمجھنے میں اسے کم از کم ایک منٹ لگتا تھا.. چنانچہ ہم آگے نکل چکے تھے اور جب وہ ”رک جاؤ“ سمجھا تو پھر ویگن بیک کی اور ہم ”ہمالین نورز“ کے دفتر میں داخل ہو گئے..

چنگیزی موجود نہیں تھا.. عقل مند تھا.. اسلام آباد میں تھا..

اس دفتر میں ہم نے ”کے ٹو کہانی“ اور ”سنو لیک“ کی منصوبہ بندی کی تھی اور چنگیزی نے ہمیں گائیڈ کیا تھا.. ساز و سامان عطا کیا تھا.. بغیر کسی معاوضے کے.. شاید اسے خبر ہو گئی تھی کہ لاہوری مفت پر پھر آرہے ہیں.. اسی لیے وہ اسلام آباد رو گیا تھا.. چنگیزی کی افواج قاہرہ میں سے دو صاحب دفتر میں موجود تھے.. ایک صاحب منبر تھے اور اسے منبر تھے کہ کچھ بولے نہیں، منبر کی کرسی پر بیٹھے سر جلاتے رہے.. دوسرے صاحب شال کے چپے چپے کو جانتے تھے اور انہوں نے مناسب انداز میں ہمارا سواگت کرنے کے بعد پوچھا ”تارڑ صاحب اس برس کہاں جائیں گے؟“

”ہوشے.. اور وہاں سے مشاہیرم بیس کیمپ..“

”اب مشاہیرم بیس کیمپ کون جاتا ہے..“

”ہم جاتے ہیں..“

”کیوں جاتے ہیں؟“

”ہم سب ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے کہ کیوں جاتے ہیں..“

”جناب عالی سنا ہے کہ خوبصورت پہاڑ ہے..“ میاں صاحب نے کھنگورامار کر کہا..

”کیا ہے؟“

”خوبصورت پہاڑ..“

”آپ کو کس نے بتایا ہے؟“

”تارڑ صاحب نے..“

”کیوں تارڑ صاحب؟“

”مجھے بھی کسی نے بتایا ہے..“

”نہ جائے..“

”کیوں؟“

”آپ ہوشے سے مشاہیرم کے بیس کیپ میں ڈیڑھ دن میں پہنچ جائیں گے۔ اور وہ ایک تنگ جگہ ہے۔ مشاہیرم کی چوٹی راستہ روکے کھڑی ہے اور بس۔ ایک دن میں واپس ہوشے آجائیں گے تو کل ڈھائی دن کی ٹریکنگ کیا ٹریکنگ ہوئی۔“

میں کہنا تو یہ چاہتا تھا کہ وہ کیا پنجابی گیت ہے جگجیت سنگھ کا کہ۔ ڈھائی دن نہ جوانی چل دی۔ تے کڑتی ملل دی۔ تو ڈھائی دن کی کوہ نور دی بھی بہت ہوتی ہے لیکن میں نے کہا یہ کہ۔۔۔۔۔

اس سوال کا جواب کیا آیا یہ بتانے سے پہلے میرا بہت جی چاہ رہا ہے کہ میں آپ کو اس گیت کے بارے میں ایک اور مزید ارقہ بتاؤں۔ ایک شب۔ ایک گنی شب جب میں اپنی سٹڈی ٹیبل پر گھجکا تنگ مار رہا تھا یعنی کوئی اس قسم کا سفر نامہ لکھ رہا تھا اور گرمی سے نڈھال اور پیسے سے شرابور تھا تو ایک ٹیلی فون آیا۔ بیس منظر میں خوب شور شرابہ تھا اور شور اتنا نہ تھا جتنا شرابہ تھا کیونکہ اس میں شراب کی آمیزش تھی، کوئی صاحب اس آمیزش میں ڈوبتے بولے ”تارڑ جی۔ ہم تو آپ کے پجاری ہیں۔ چرن چھوٹا چاہتے ہیں۔ اور آپ کے لاہور میں مشرقی پنجاب سے آئے ہیں ایک کانفرنس کے سلسلے میں تو چرن چھوٹے آجائیں؟ ویسے آپ آجائیں تو بھاگ جاگ جائیں ہمارے۔ ہم کسی شاہ نور سنو ڈیو کے قریب رنگ جمائے بیٹھے ہیں۔ پرویز مہدی گارہے ہیں۔“

”شکر یہ بہت بہت۔ لیکن رات کے اس پہر ذرا مشکل ہے۔ ویسے آپ اپنا تعارف تو کرواد دیجیے کیا کرتے ہیں۔ کون ہیں؟“

”لو جی۔ ہمیں تو پورا امریکہ جانتا ہے۔ پورا یورپ جانتا ہے۔ پورا افریقہ جانتا ہے۔ آپ نے جگجیت سنگھ کا وہ گیت نہیں سنا۔ ڈھائی دن نہ جوانی چل دی۔ تے کڑتی ملل دی۔ سنائے؟“

”بالکل سنا ہے اور متعدد بار سنا ہے۔“

”تارڑ جی۔ وہ گیت آپ کے اس پجاری نے لکھا ہے۔ سنائوں؟“

اس سے پیشتر کہ میں کچھ کہتا، ان صاحب نے یہ گیت الاپنا شروع کر دیا اور پس منظر میں جو شور شرابہ تھا، وہ مزید شراب ہو گیا۔ اور گیت کے درمیان رُک کر وہ مجھ سے مخاطب ہوتے۔ اوئے تارڑ جی ڈھائی دن نہ جوانی چل دی۔ تو اڑھے کول کڑتی ملل دی ہے کہ نہیں نہیں تو میں پانچا دوں۔۔

مجھے افسوس ہے کہ میں اس شب اس عظیم گیت نگار کے درشن نہ کر سکا اور اپنی سٹڈی میں

ہی قید رہا۔

بہر حال یہ قصہ ملل کی کڑتی یہاں تمام ہوتا ہے اور وہ لمحہ آتا ہے جب میں نے چنگیزی کے دفتر میں بیٹھے ہوئے پوچھا کہ۔ بیس کیپ نہ جائیں تو کہاں جائیں؟

”آپ جانتے ہیں کہ 93ء تک کے ٹو بیس کیپ اور کنکورڈیا جانے والے کوہ نور وہاں پہنچ کر واپس اٹنے قدموں اسی راستے سے لوٹ جاتے تھے۔ اسی گورے، اردو کس اور پانیو اور کوروفون سے واپس اٹھو لے جاتے تھے۔ لیکن پھر ایک نیا راستہ دریافت ہو گیا۔ کے ٹو بیس کیپ سے کوہ نور وہاں مشاہیرم گلی شیر کوکراس کرتے ہیں۔ درہ گندو گورو کوہ نور کرتے ہیں اور ہوشے میں آتے ہیں تو آپ جائیں گندو گورو۔ جسے گورا لوگ گاندو گورو بولتے ہیں۔“

”کیا گندامنداس نام ہے جناب عالی۔“ میاں صاحب پھر بولے اور بڑی مشکل سے بولے کیونکہ سکرورور کے ڈر سے ان کا جو کچھ بول رہا تھا، وہ بند ہو چکا تھا۔

”آپ اسے انگریزی میں نہ بولیں۔“ سلمان نے صلاح دی۔ ”اردو میں ذرا تمیز سے بولیں۔“

”ہوشے سے گندو گورو بیس کیپ تین دن کی مسافت پر ہے۔۔۔ راستے میں ذل سنگ پا ہے جس کا مطلب ہے پھولوں کا کھیت۔ بیس کیپ سے آپ ہائی کیپ جائیں گے اور پھر وہاں سے آپ اٹھارہ ہزار فٹ بلند گندو گورو کی شاندار چوٹی فتح کریں گے۔“

”یعنی میں بھی فتح کر لوں گا۔ اس عمر میں؟“

”ہاں۔ اسے کسی بھی عمر میں فتح کیا جاسکتا ہے۔ ستر برس کے گورے بھی اس کے اوپر پہنچ جاتے ہیں۔ آپ کی عمر تو ایک دو برس کم ہی ہوگی۔“

”کیسے۔ جلدی سے بتاؤ کہ کیسے؟“

”آپ ہائی کیپ سے رات بارہ بجے نکلیں گے اور اوپر چڑھنا شروع کر دیں گے۔ چار چوں کی روشنی میں۔ برف ابھی سخت ہوگی اور آپ کے ٹپوں کے ساتھ کریچون ہوں گے تو آسانی سے چلیں گے۔ تقریباً پانچ بجے آپ چوٹی کے دامن میں پہنچ جائیں گے اور جب آپ سر اٹھا کر اوپر دیکھیں گے تو آپ گھبرا جائیں گے کہ وہاں چوٹی تک ایک برف کی سیدھی دیوار بلند ہوتی ہے لیکن گھبرانے کی کوئی بات نہیں، وہاں ہوشے کے کچھ ہائی پورز مستقل طور پر قیام پذیر ہیں

”ویسے مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن..“ میاں صاحب پھر بولے۔ ”چوٹی کا نام ذرا خوش ہے.. اب یہ چنگیزی کا آدمی اسے بار بار گانڈو گورو کہہ رہا تھا..“

”میاں صاحب آپ مہربانی کر کے بھائی گیٹ لاؤ اور سے نکل کر بلتستان میں آجائیے پلیز.. ہر تہذیب اور ہر زبان کی صدائیں اور لہجے الگ الگ ہوتے ہیں..“ میں نے لیڈر کی حیثیت سے انہیں ڈانٹا۔ اگرچہ میں بھی نام کے بارے میں ذرا فکر مند تھا.. چوٹی کا نام کچھ اور ہوتا تو ذرا بہتر ہوتا..

”مائی لیڈر..“ اور یہ وہ بات طرزِ نظم شاید کا ہی ہو سکتا تھا جس نے اپنا سیاہ جاسوسی چشمہ ایک مدت کے بعد آنکھوں سے الگ کیا اور پیندھیائی ہوئی فلسفیانہ نظروں سے سب کو دیکھتے.. بلکہ شائد نہ دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میرے ٹک سیک میں اتفاق سے ایک پاکستانی پرچم موجود ہے جو میں گندوگورو کی چوٹی پر لہرا کر پاکستان اور اسلام کا نام روشن کروں گا.. ایک مدت سے پاکستان اور اسلام کا نام روشن کرنے کی ایک خواہش دیرینہ و پارینہ میرے اندر موجیں مار رہی تھی.. مائی لیڈر.. چڑھ جائیں چوٹی پر..“

یہ ”چڑھ جائیں چوٹی پر“ اُس نے ”چڑھ جائیں سولی پر“ کے انداز میں کہا تھا۔ کم گو اور شدید مجبوری کے تحت بات کرنے والا برہمانی بھی بولا ”سائیں آپ تو جانتے ہو کہ میرے خیالات میں کج روی بہت ہے.. میں تو لیٹے پکٹ پیک کو بھی دولہن کے روپ میں خوابوں میں دیکھتا ہوں اور صبح شرمندہ ہوتا ہوں تو ایک بلند برفانی چوٹی پر چڑھنا میرا خواب ہے.. مجھے چڑھ جانے دیں..“

میں نے پہلے اپنے آپ کو دیکھا.. اس طرح دیکھا جیسے ہاتھ روم کے قہر آدم شمشے میں نہانے سے جوشتر اپنے آپ کو دیکھتا ہوں اور جو کچھ میں نے دیکھا، اسے پسند نہ کیا اور پھر سلمان کے تن و توش پر نظری.. ہمارا مشترکہ نہ سہی الگ الگ بوجھ بھی اتنا تھا کہ اول تو وہ برف کی دیوار میں نصب رہے ہمیں سہارا نہیں دیتے تھے اور اگر ہم گرتے پڑتے چوٹی پر پہنچ جاتے تھے تو پوری چوٹی ہمارے وزن سے مسمار ہو سکتی تھی.. اس کے علاوہ بلندی کے مسائل بھی تھے کہ ہم دونوں درہ و پسر کی سترہ ہزار فٹ اونچائی کو مشکل برداشت کر سکتے تھے.. اور یہ بھی بتایا گیا تھا کہ اگر اوپر چڑھتے ہوئے پھسل جاتے ہیں.. مگر جاتے ہیں تو پھر گر جاتے ہیں.. ”اگرچہ وہاں رہنے نصب ہیں لیکن انہیں صبح کی نیم تاریکی میں برف کی دیوار کے ساتھ تھامنا اور اوپر چڑھنا تو ہم نے ہے.. تو کیا ہم

اور انہیں RESCUE ٹیم کہا جاتا ہے.. انہوں نے چوٹی تک رہنے باندھ رکھے ہیں.. وہ فی کوہ نور دو تین سو روپے چارج کریں گے اور پھر آپ ان پورٹروں کی مدد سے رسوں سے لٹکتے برف کی دیوار پر چڑھتے صبح چھ بجے کے قریب چوٹی پر پہنچ جائیں گے..“

”اور اگر رسہ ہاتھ سے پھوٹ جائے تو کیا ہوتا ہے؟“

”وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے صاحب.. لیکن ادھر چوٹی پر پہنچتے ہیں تو صاحب وہاں سے کیا منظر ہے..“

”کیا منظر ہے؟“ عامر نے پُر اشتیاق ہو کر پوچھا۔

”وہاں سورج نکل رہا ہوتا ہے اور آپ کے نیچے سے کہیں برفوں میں سے طلوع ہو رہا ہوتا ہے.. اور اس لمحے چوٹو لیزر، مشاہیرم اور کے نو نظر کے سامنے ہوں گی..“

”یعنی نظر کے سامنے جگر کے پار“ سلمان چپکے لگا..

”ہاں جی.. آپ کچھ دیر ٹھہریں.. تصویریں اتاریں.. لیکن زیادہ دیر نہیں کیونکہ نیچے کوہ نور کی ایک لائن لگی ہوئی ہے کہ آپ اُتریں تو وہ اوپر جائیں.. تو آپ انہی رسوں کو تھام کر نیچے آجائیں گے.. دیر کریں گے تو برف نرم ہو جائے گی..“

ایک باقاعدہ اور یورپ کی سب سے بلند چوٹی ماؤنٹ بلاک سے بھی دو ہزار فٹ مزید بلند چوٹی کو فتح کرنے کے امکان نے میری ٹیم کے تنِ مُردہ میں ایک نئی کھور اور ایڈو جنرس روح پھونک دی.. وہ بے حد ایکساٹنڈ ہو کر ان مینڈکوں کی طرح ٹرانے لگے جو ایک طویل خشک سالی کے بعد بارش کی پہلی بوچھاڑ میں بھگتے ہی پھر سے زندہ ہو جاتے ہیں اور ٹرائرا کر جینا و بال کر دیتے ہیں..

”دفع کریں جی مشاہیرم کو.. چوٹی فتح کریں..“

”سر یہ جو باہر کے لوگ ہیں ناں، ہمارے قبیلے سے باہر کے لوگ.. تو یہ ہم سے ہمیشہ پوچھتے ہیں کہ تم جو پہاڑوں پر جاتے ہو تو وہاں جا کر نا لگا پرست اور کے نو پر کیوں نہیں چڑھ جاتے.. انہیں فتح کیوں نہیں کرتے.. انہیں تو معلوم نہیں کہ کوہ نور دی اور کوہ پیما کی میں فرق ہوتا ہے تو ایسے لوگوں کا منہ ہمیشہ کے لیے بند کرنے کے لیے یہ گولڈن چانس ہے.. ہم اس.. کیا نام بتایا ہے چوٹی کا.. جو کچھ بھی ہے تو ہم اس پر چڑھ ہی جائیں.. واپسی پر بیان دے دیں گے کہ کے نو پر چڑھ کر آئے ہیں..“

بچے ہو۔ تمہارا تو صرف ابھی نکاح ہوا ہے۔ تم آئے دال کا بھاؤ کیا جانو۔ ہم سے پوچھو۔ جتنا عرصہ ہمیں شادی شدہ ہوئے گزر رہے، اس کے بعد ایک فینٹسی جنم لیتی ہے۔ آپ کو وہ کچھ بھی نظر آنے لگتا ہے جو نظر نہیں آتا۔ اور اس فینٹسی میں اگر کے ٹوئیس کیپ نہیں بھی پہنچے تو پہنچ جاتے ہیں۔ یہ تو تخیل کی پرواز کے کرشمے ہیں۔ اب یہ ہمارے لیڈر صاحب ہیں۔ ایسے ایسے منظر بیان کرتے ہیں جو ہمیں تو نظر نہیں آتے۔ صرف انہیں نظر آتے ہیں۔“

”جناب مجھے شادی شدہ ہوئے آپ سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے۔ اس لیے میرے تخیل کی پرواز آپ سے بھی اونچی ہے۔ براہ کرم اپنی لڑائی لڑیں اور مجھے معاف رکھیں۔“

”اب سمجھ آئی؟“ شاہد نے فاتحانہ انداز میں سر ہلایا۔

”بالکل سر۔“ نادان بھائو نے سر جھکا لیا۔ ”چلیں گوندو گورو کی چوٹی پر چلیں لیکن دھیان رکھیں کہ راستے میں کہیں میں لڑھک ہی نہ جاؤں۔“

میں اتنی ہمت ہے۔ اور ہمارے پاس آئس ایکس نہیں۔ کریمپن نہیں جن کے بغیر ہم چوٹی تک نہیں جاسکتے۔“ میں نے احتیاط کا طبل آہستہ آہستہ بجایا۔

”تارڑ صاحب یہ سب کچھ آپ کو ہائی کیپ میں مل جائے گا۔“ چنگیزی کا اسسٹنٹ ہمیں گندو گورو کی چوٹی پر پہنچانے پر تھلا ہوا تھا۔ شانہ کہیں شرط لگا کر آیا تھا کہ میں تارڑ کو کیفر کردار تک پہنچا کر رہوں گا۔“ ویسے کیا آپ نے کبھی کوئی چوٹی سر کی ہے؟“

”برقانی چوٹی تو نہیں۔“

”تو پھر آپ نہیں جانتے کہ پچھلے بیس برسوں کی کوہ نوردی ایک طرف اور کسی بلند قراقرمی چوٹی پر ایک قدم رکھنا۔ ایک طرف۔“

”یہ تو مرنے کے سامان لگتے ہیں۔“

”سرجی۔ موت کا ایک دن معین ہے۔۔۔ اور آپ تو عمر کے اس حصے میں ہیں جہاں اس کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ چلتے ہیں سر۔ دیکھا جائے گا۔“ یہ بیان جانے کس ناخوار نے دیا تھا مجھے یاد نہیں۔ کیونکہ پوری ٹیم سرخوشی کی برقانی مسرت سے سرشار تھی۔ چنانچہ آزادی جمہور کا زمانہ آ گیا تھا۔ مشاہیرم بیس کیپ کا سفر ترک کر دیا گیا اور گندو گورو کو منزل بنا لیا گیا۔ البتہ میں نے ایک شرط رکھ دی۔ ”ہم گندو گورو کے بیس کیپ پہنچ کر یہ فیصلہ کریں گے کہ کیا ہم نے وہاں سے ہائی کیپ اور پھر چوٹی تک جانا ہے یا نہیں۔“

”کیوں نہیں جانا مائی لیڈر۔ چوٹی وہاں سامنے موجود ہوا اور ہم نہ جا سکیں۔ پاکستان اور اسلام کا پرچم اس پر نہ لہرائیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“

”شاہد صاحب۔ براندہ ماننے کا لیکن۔“ یہ سلمان تھا جو بے شک بہت فرمانبردار بچہ تھا لیکن بہت بدتمیز بچہ بھی تھا۔ اس کا قصور نہ تھا۔ انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور میں جس نے بھی چند برس گزارے ہوں، اس کے لیے بقیہ زندگی میں باتیز ہونا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ ”آپ اگر گندو گورو کی چوٹی پر نہ بھی پہنچے تو لاہور واپسی پر ڈیپلکیم کر دیں گے کہ پہنچ گئے تھے۔ جیسا کہ آپ نے کنکور ڈیا سے واپسی پر اعلان فرما دیا تھا کہ ہم لوگ کے ٹوئیس کیپ میں جا پہنچے اور پھر میری آنکھ سے آنسو ٹپکا۔ نکلتے ہی برف میں بدل گیا اور اس برف میں کے ٹو کی تصویر ہمیشہ کے لیے نقش ہو گئی۔ حالانکہ تارڑ صاحب نے ”کے ٹو کہانی“ میں اقرار کیا ہے کہ آپ لوگ کے ٹوئیس کیپ نہیں پہنچے تھے۔“

”اے نادان بھائو۔“ شاہد صاحب نے نہایت الفت سے سلمان کو دیکھا۔ ”تم ابھی

منٹ کے بعد کہتے ”تارڑ صاحب.. آج صبح نیچے سندھ کے کنارے سیر کرتے ہوئے پورے چھ بجکر چودہ منٹ پر میں نے آپ کو بہت یاد کیا.. اپنی بد نصیبی پر تاسف کیا کہ ہائے ہائے تارڑ صاحب آئے اور میں موجود نہ تھا.. پورے چھ بجکر چودہ منٹ پر..“ پھر سر ہلاتے اور کھیرے کی ایک قاش کو چٹکی میں پکڑ کر کہتے۔ ”رزق میرے ہاتھ میں ہے تارڑ صاحب.. پورے چھ بجکر چودہ منٹ پر.. آج صبح میں نے آپ کو یاد کیا.... کے ٹوموئل میں جو اضافے ہو رہے ہیں، ہم ان حصوں کے نام ایسی شخصیات کے نام پر رکھ رہے ہیں جنہوں نے شمال کے لیے بہت کام کیا ہو.. انشاء اللہ اگلا ونگ آپ کے نام پر ہوگا.. اور تارڑ صاحب آج صبح پورے چھ بجکر چودہ منٹ پر.. ٹوموئل کے برآمدوں میں آپ کے ٹریکس کے بارے میں جو کارڈ اور پوسٹر وغیرہ چسپاں ہیں، کئی لوگ انہیں سوویسر کے طور پر خریدنا چاہتے ہیں لیکن یہ تو ہماری پہچان ہیں تارڑ صاحب.. ویسے آج صبح چھ بجکر چودہ منٹ پر..“

لیکن ریاض صاحب کی یہ محبت تو ہمیں واپسی پر ملی..

ابھی تو ہم بے آسرا تھے اور ہلکی بارش ہو رہی تھی..

استقبالیہ صاحب نے یہ پیشکش بھی کی کہ آپ جمیل صد پارہ چلے جائیں وہاں دو کمرے مل جائیں گے.. لیکن اس میں کچھ سخت مقام آتے ہیں۔ اب شام ۵ بجے پہلے تو صد پارہ جانے کے لیے جیپوں کا بندوبست کریں.. اپنی وگین یہیں کہیں چھوڑ دیں.. کل صبح پھر واپس سکرو آئیں.. نہیں اس میں تردد بہت تھا..

”سر آپ شیر علی کا موئل کنکورڈ یا چیک کر لیں، شام وہاں جگہ مل جائے..“

”شیر علی تو ہمارا اپنا شیر ہے..“ میں نے ہنس کر کہا اور ہم کے ٹوموئل سے باہر آ گئے..

لیکن کنکورڈ یا موئل میں بھی یہی حالات تھے اور شیر علی یوم آزادی کے سلسلے میں کھیلے جانے والا ایک فٹ بال میچ دیکھنے گیا ہوا تھا اور موئل میں اُس کا ایک ”چھوٹا“ انچارج تھا جو بے حد معاون ثابت ہوا۔ ”تارڑ صاحب موئل بالکل ہی فل ہے.. لیکن فکر نہ کریں میرے پاس ایک نامکمل کمرہ ہے، وہ حاضر ہے۔ برابر میں پولیس ریسن باؤس ہے وہاں ایک کمرے کا بندوبست ہو جائے گا.. اور اگر بارش زیادہ نہ ہو تو بے شک لان میں ٹینٹ لگا لیجیے..“

شیر نے یہ موئل کے ٹوموئل کے سائل میں دریائے سندھ کے اوپر بنایا تھا..

عجیب سکرووی شام تھی جس میں بارش کی اداسی اتاری تھی اور ہم بے گھر تھے.. مدت سر پر تھی..

”سکرو بے وفا ہو جاتا ہے اور چلو چلو چلو...“

کے ٹوموئل نہ صرف فل تھا بلکہ اس کے برآمدوں میں بھی اتنے ملکی اور غیر ملکی سیاح تھے کہ کھڑے ہونے کی جگہ نہ تھی..

ہم نے اگرچہ گلگت سے فون پر اپنی آمد کی اطلاع دے دی تھی لیکن استقبالیہ صاحب نے نہایت احترام سے عرض کیا کہ جانے وہ فون کس نے انینڈ کیا تھا.. موئل میں ایک کمرہ بھی خالی نہیں ہے.. بلکہ یہ جو دو گورے مجھ سے الجھ رہے ہیں، ان کی بنگلہ ہونے کے باوجود ان کے لیے بھی گنجائش نہیں کیونکہ کچھ مہمان جو رخصت ہونے تھے، فلائٹ نہ ہونے کی وجہ سے رخصت نہیں ہو رہے اور کمرے خالی نہیں کر رہے.. سو رہی سر..

باہر ہلکی بارش شروع ہو گئی تھی اور موئل کے ڈائننگ روم سے ایک ایسا سندھ نظر آ رہا تھا جس پر بادل اترے ہوئے تھے اور شام کو نیم تاریک کرتے تھے.. یہ منظر ہمیں خوشی دیتا اگر ہمیں رہائش مل جاتی اور اسے ہم اپنے کمرے کی کھڑکی سے دیکھتے لیکن اب یہ ہمارے لیے اداسی اور اذیت تھا کیونکہ ہم بے گھر تھے..

ہنزہ کے ریاض صاحب جن سے ایک مدت سے آشنائی تھی، ان دنوں یہاں فیجر تھے.. میرے بچوں سے اتنا لگاؤ تھا کہ گلگت میں موئل کے لان میں واقع سیب کے درخت پر بہ نفس نفیس چڑھ کر ان کے لیے سیب اتارا کرتے تھے.. لیکن وہ سکرو سے باہر تھے.. اندر بھی ہوتے تو شاد تھ بھی مجبور ہوتے کہ موئل ٹھنڈا پڑا تھا..

البتہ واپسی پر ریاض صاحب نے ساری کسر نکال دی.. چلو سے نکل کر ہم تھوڑی دیر کے لیے سکرو کے تو ہم پر باقاعدہ نچھاور ہو گئے.. ہم سب کے لیے لُچ کا بندوبست کیا اور ہر پانچ

”غریب کے ایک اندھے فقیر کو دیکھ کر کسی نے کہا تھا کہ اے عورت! اس فقیر کو خیرات دو کہ غریب ایسے خوبصورت شہر میں ہونا اور اندھا ہونا اس سے بڑی بد قسمتی کوئی نہیں۔ تو کسی شام سکر دو میں ہونا اور سر پر چھت نہ ہونا۔“

ناکمل کمرے کا ہاتھ روم بھی ناکمل تھا۔ اور کچھ بوجھ بھی تھی۔

پولیس ریٹ ہاؤس کا کمرہ تھا تو اطمینان بخش لیکن مجھے بے آرامی سی ہو رہی تھی۔ بارش کا کچھ پتہ نہ تھا کہ تیز ہو جائے، اس لیے خیمے نصب کرنا بھی دانش مندی نہ تھی۔ اور ہم میں ہمت بھی نہیں تھی خیمے نصب کرنے کی۔

”ویسے سر...“ کنکوردیا کا چھوٹا واقعی میرے لیے فکرمند تھا۔ ”ایک بات بتانا ہوں۔ ابھی معلوم ہوا ہے کہ آپ تو اپنی دینگن لے کر آئے ہو تو آپ چلو کیوں نہیں چلے جاتے۔ ادھر تو نیا موٹل بنا ہے اور زبردست ہے۔ اور خالی ہے۔“

میں نے اس نئے موٹل کی تعریف سن رکھی تھی۔ لیکن چلو؟...

”آٹھ بج رہے ہیں اور رات ہو چکی ہے تو۔ لیکن کیا ہماری دینگن چلو جاسکتی ہے؟ رات کو اس روڈ پر ٹریفک چلتا ہے؟“

”ادھر تو اب ٹریڈ اور فوجی ٹرک بھی جاتا ہے سر۔ ادھر نہیں جائے گا تو اور کدھر جائے گا۔ سیاحین کا راستہ ہے ناں۔ ادھر تو دنیا کا ٹریفک چلتا ہے۔“

”کیوں حکیم؟“ میں نے باہر آ کر حکیم سے رجوع کیا جو بار بار اپنا ازار بند اڑستا پہلی بار سکر دو کی رات میں بہتے سندھ کو حیرت سے ٹکاتا تھا۔ ”چلو چلیں۔“

”ہیں؟“ وہ چونک گیا۔ ”کدھر چلیں؟“

”چلو۔“

”یہ کوئی اور ہوٹل ہے؟“

”نہیں۔ یہاں سے ڈھائی گھنٹے کی مسافت پر ایک وادی ہے۔ راستہ تقریباً میدانی ہے اور روڈ پر ٹرک بھی چلتے ہیں۔ یہاں تو رات گزارنے کے لیے کوئی بندوبست نہیں ہو رہی تو وہاں چلیں؟ تم تھک تو نہیں گئے؟“

”تھک گیا ہوں۔“ اس نے فوراً ڈھکیڑ کر دیا۔ ”سکر دو روڈ بہت گنڈا روڈ ہے سر۔ بہت تھک گیا ہوں۔“

”حکیم تھک گیا ہے؟“ عامر کے اندر خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ ”تارڑ صاحب تھکے ہوئے ڈرائیور کو کبھی مزید ڈرائیونگ کے لیے مجبور نہیں کرنا چاہیے۔ ٹھیک ہے حکیم تم تھک گئے ہو تو نہیں جاتے، آرام کرو۔“

”یہ تو آرام کرے عامر لیکن ہم کہاں آرام کریں۔“

”ہاں یہ مسئلہ بھی قابل غور ہے۔“

”حکیم۔“ میں نے لاہور سے چلنے کے بعد پہلی بار دینگن کے لیے ادا کئے جانے والے مبلغ ڈھائی ہزار روپے روزانہ۔ چاہے وہ ایک ہی مقام پر ہفتہ بھر کھڑی رہے، پھر بھی ڈھائی ہزار روپے روزانہ۔ پلس ڈیزل کا خرچہ، پلس ڈرائیور کے روٹی، پانی اور رہائش کا خرچہ۔ ان سب خرچوں کے خرچ کرنے والے کو جتنا حق ملنا چاہیے، اس کا مطالبہ کر دیا اور آ رڈر دے دیا کہ۔ حکیم راستہ آسان ہے۔ چلو چلنا ہے۔ چلو!

حکیم نے جس ڈھکی چھپی بدتمیزی اور بیزاری کا مظاہرہ کیا، وہ قابل دید تھا۔ ”یہ جو چلو ہے۔ اور سیاحین کی طرف ہے تو راستے میں برف ہی برف ہے؟“

”نہیں۔ سیدھا اور سوکھا راستہ ہے۔ صراطِ مستقیم ہے۔ کچھ کچھ چلے چلو۔ چلو۔“

میں اس سے پیشتر دو مرتبہ چلو۔ یعنی چلو جا چکا تھا۔ پہلی بار نظامی اور مطیع ٹھوکی کے ہمراہ اور دوسری مرتبہ اپنے خاندان کے ساتھ۔ اور راستے میں کیسے کیسے سنہری گاؤں آتے تھے جہاں دو منزلہ چوٹی گھراور گندم کے کپے ہوئے گولڈن فیلڈز تھے۔ وہ مقام تھا جہاں تبت سے آنے والا شیر دریا اس سے بڑے دریا شیوک کو اپنی آغوش میں لے کر مدغم کر لیتا تھا۔

تھے۔ بشام سے یہاں چلو تک میں سوچتا رہا تھا کہ انعام ایسے نفیس شخص کو یہ کیا انعام ملا۔ لیکن اس کی رضا کے آگے سر جھکانے کے علاوہ کیا کیا جاسکتا ہے۔

انعام کے اسٹنٹ ارشاد موئل کے معاملات کی نگہبانی کر رہے تھے۔
ریسپشن ہال میں چلو میں تعینات ایک کرنل صاحب کے شہری بچے۔ غالباً اسلام آبادی بچے بوریٹ کے شدید عالم میں۔ بیزاری کی ایک لا جواب کیفیت میں۔ کہ ایک شہری بچے کو اگر زبردستی پدرانہ شفقت کے زور پر چلو ایسی دور افتادہ وادی میں اپورٹ کر لیا جائے تو اس کا یہی حال ہوگا۔ یہ بچے صوفوں پر نیم دراز بیٹھ ہاتھ میں لیے ٹیلی ویژن کے چینل بدلتے تھے اور والد صاحب کو ناراض نظروں سے دیکھتے تھے۔ کرنل صاحب ہمیں دیکھ کر نہایت خوش ہوئے، بے شک کرنل تھے لیکن بچے تھے اور باہر کی دنیا سے آنے والوں سے مل کر خوش ہوئے۔

موئل دریائے شیوک کے کناروں پر ایک شالیمار کی مانند تختہ بہ تختہ اٹھتا تھا اور سب سے اوپر والے تختے پر ہمارے کمرے تھے۔ ہم ان شاندار کمروں کی بلند چھتوں اور لکڑی کے بھاری شہتیروں اور آہنی گرفت والی چھتوں کے نئے نوے کنوار پن کی مہک والے کمروں میں داخل ہوئے تو سکر دور وڈ کے خوف اور سکر دوشہر کے ایک چھت سے انکار اور پھر وہاں سے رات کی سیاہی میں جو ایک طویل تھکاوٹ کا سفر تھا، اسے بھول بھال گئے۔

جیسے کے نو کی چوٹی پر پہنچ جانے والا کوہ پیا۔ برس ہا برس کی ٹریننگ کی مشقت۔ اپنے ملک سے اسلام آباد، پھر سکرو۔ پھر اشکو۔ پائیو۔ اردو کس، گورے، کنکور ڈیا۔ بیس کیمپ سے اوپر جو برفانی موتیں ہیں اور بلندی پر جو سانس اکھڑتا ہے اور کبھی اپناج کر دیتا ہے اور کبھی کسی دراڑ میں دھکیل دیتا ہے اور اس کا نام ”گلگلی میموریل“ کی چٹان پر کسی سلور کی تھالی پر کھود کر اس کا کتبہ لگا دیا جاتا ہے تو وہ اگر کے نو کے چوٹی پر پہنچ جاتا ہے تو یہ سب کچھ بھول بھال جاتا ہے۔

ایسے ہم بھی بھول بھال گئے۔
جیسے برفوں میں منجمد کسی پرندے کو آگ کے سامنے رکھنے سے اس میں جان پڑنی شروع ہو جاتی ہے۔ ایسے ہم بھی زندہ ہونے لگے اور چمکنے لگے۔
”یہاں تو جشن ہونا چاہیے ہارڑ صاحب“ حسن صاحب شرماتے ہوئے بولے کہ وہ برمانی کے ہمراہ میرے ہم کمرہ تھے۔

”حسن جی۔ ہم آج سویرے گلگت سے چلے تھے۔ یقیناً تو نہیں آتا کہ گلگت سے چلے

”بھگت کبیر اور میرا بانی چلو کے موئل میں“

ہم نئی رات چلو پہنچے۔

راستے میں حکیم کو محفوظ کرتے رہے۔ سکھوں کے لپیٹے سناتے رہے۔ اس کی خوشامد اس طرح کرتے رہے جیسے وہ کوئی فوجی حکمران ہو۔ اس کی بے مثل ڈرائیونگ اور نشیلی آنکھوں کی تعریف کرتے رہے تاکہ وہ اونگھ نہ جائے۔ ہمیں انڈس کے حوالے نہ کر دے۔
چلو پہنچے اور پی ٹی ڈی سی کے نئے موئل میں داخل ہوئے۔ تو سشدر رو گئے۔
سنائے میں آ گئے۔

چلو جہاں کچھ عرصہ پہلے تک باہر سے آنے والوں کے لیے ایک دو کمروں کا پرانا ریٹ ہاؤس تھا، اوپر بازار میں بوسیدہ اور حشرات الارض سے ریگتے چند گندے کمبل اور کچے فرشوں کے ایک دو ہوٹل تھے، وہاں اُسی چلو میں ایک تاج محل تھا۔ جدید فن تعمیر مگر مقامی روایت سے جڑا ہوا ایک ایسا عجوبہ تھا کہ ہم سشدر رو گئے۔

لیکن انعام صاحب۔ جو اس موئل کے منجر تھے اور میرے قدیمی دوستوں میں سے تھے اور میں انہیں ان کی سادگی اور ہمدرد خصلت کی وجہ سے قدرت کا انعام کہا کرتا تھا۔ وہ وہاں نہیں تھے۔ مجھے بشام میں ہی اطلاع مل گئی تھی کہ انعام کے بال بچے گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے کے لیے ان کے پاس چلو آئے تھے۔ وہ اسلام آباد واپس جانے کے لیے سکرو سے ایک نئی اور قابل اعتماد ایئر کنڈیشنڈ بس میں سوار ہوئے اور ماضیہ کے قریب اس بس کا ڈرائیور اونگھ گیا۔
حادثے میں انعام کی اہلیہ ہلاک ہو گئیں اور بیٹے شدید زخمی ہو گئے۔ انعام اپنی اہلیہ کو دفن کرنے کے لیے اور ہسپتال میں پڑے اپنے بیٹوں کی دیکھ بھال کے لیے وطن جا چکے تھے۔ چلو میں نہیں

تھے۔ تقریباً چند روگھنے ہو گئے ہیں مسلسل سفر کرتے۔ تو آپ تھکے نہیں۔ سو نہ جائیں؟“
”سرجی۔ سو گئے تو گئے۔ ذرا تھکاؤ اتارتے ہیں۔ لیکن سے روسٹ چکن اور چپس منگواتے ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ میرا معدہ کمزور ہے۔ میں مقامی پانی نہیں پی سکتا تو لاہور سے لایا ہوا منرل واٹر پیتے ہیں اور باتیں کرتے ہیں۔“

”تارڑ صاحب اس بلوچ کی بھی کوئی گزارش سن لیں۔“ برمانی جیسے ایک ریچھ کی مانند اپنی سرمائی نیند سے بیدار ہوا۔ حسب عادت سرگوشیوں میں گویا ہوا۔ ”مشورہ نہیں۔ محض گزارش ہے۔ یہ جو ہوش ہے اور گندوگور و وغیرہ ہے سائیں تو اس کو فراموش کر دیں۔ یہیں اسی موٹل میں چند روز قیام کرتے ہیں۔ اس کے شایہمار تختوں میں آپ کے پسندیدہ زرد پھول کھلے ہیں اور سائیں سرد ہوا میں جھومتے جاتے ہیں۔ اور ذرا کمرے کی بالکونی میں جا کر دریائے شیوک کے نظارے دیکھنے اور اس کے پار پہاڑوں کی برفوں میں دھیرے دھیرے حرکت کرتے بادل دیکھنے۔ ہمیں اور کیا چاہیے۔“

”برمانی۔ تمہیں رات کے اس پہر۔ بلکہ آدھی رات کے سے دریا پار برفوں میں دھیرے دھیرے حرکت کرتے بادل کیسے نظر آ گئے۔“

”سائیں میں پہلی بار آپ کی ٹیم میں شامل ہوا ہوں۔ اور میں نے نوٹ کیا ہے کہ آپ وہ کچھ بھی دیکھتے ہیں جو ہوتا نہیں۔ تو سائیں آپ کا شاگرد ہوں، مجھے بھی اس بالکونی کے پار وہ کچھ نظر آ رہا ہے جو پتہ نہیں ہے کہ نہیں۔ ہم بلوچ یوں بھی ویرانوں اور صحراؤں کے باسی ہونے کے ناطے سے بادلوں اور برفوں کے خواب دیکھتے رہتے ہیں۔“

”برمانی میں تمہیں ایک راز کی بات بتاؤں۔۔۔ کسی بھی مقام پر پہنچ کر ہم وہی کچھ دیکھتے ہیں جو ہم دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ وہاں ہے یا نہیں، اس سے ہمیں کوئی غرض نہیں ہوتی کہ ہم خود غرض لوگ ہوتے ہیں۔ ہماری آبشاریں، فہری میڈو، جھیلیں، جھرنے اور بلندیاں ہمارے اندر ہوتے ہیں۔ ہم گھر سے نکل کر اگر بے گھر ہوتے ہیں تو محض ان کے فوٹو سٹٹ تلاش کرنے کے لیے۔“
”بھگت کبیر کے دوہے بھی یہی کہتے ہیں اور میرا بانی کے بھجن بھی یہی سرگوشی کرتے ہیں کہ جو کچھ ہے، وہ تمہارے اندر ہے۔“

”یہ بھگت کبیر اور میرا بانی چلو میں کہاں سے آ گئے برمانی۔“

”یہ تو ہمیشہ سے یہاں ہیں سائیں۔ مرشد آپ نے خود ہی تو ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ

ایک آوارہ گرد یہ جان جاتا ہے۔ اس کو اس بات کا عرفان ہو جاتا ہے کہ اس کا جی ہی آخری جگہ نہیں ہے۔ اس کا عقیدہ اور تاریخ ہی واحد سچائی نہیں۔ اور بھی سچ ہیں۔ تو بھگت کبیر اور میرا بانی بھی سچ ہیں اور چلو میں ہیں۔“ برمانی اپنی سیاہ آنکھوں کے ساتھ ہنسنے لگا اور اس کی فنی میں ایک ہتھیار رکھوا لینے والی معصومیت تھی۔

ایک اور معصومیت حسن کے چہرے پر تھی۔

اگرچہ ہمارے وحشی، بے مہار جذبے بھی تسکین پاتے تھے جب ہم راستوں اور آبادیوں کو چھوڑ کر پہاڑوں کے اندر اپنے قدموں پر سفر کرتے تھے لیکن۔ وہاں تک پہنچنے میں جو منزلیں آتی تھیں۔ بٹام، گلگت اور آج چلو ان میں بسر کی ہوئی شامیں بھی ایک انتخاب تھیں۔ ایسی شامیں بھی نصیب والوں کے نصیب میں ہوتی ہیں۔ چلو کی رات میں کمرے کی بالکونی کے پار۔ ایک چپ تار یک بہاؤ میں گم شیوک کے پار۔ مگر برمانی کو برف پوش بلندیاں کے گرد بادل نظر آ رہے تھے تو یہ اس کا استحقاق تھا کہ وہ۔ وہ کچھ دیکھ سکتا تھا جو وہاں نہ تھا۔

اور میں۔ وہاں وہ کچھ بھی نہیں دیکھ رہا تھا جو۔ وہاں تھا۔

ہاں یہ ہوا کہ دریائے شیوک کے بہاؤ کی آواز رات گزرنے سے بلند ہوتی گئی۔

ہمارے کمرے پر دستک دینے لگی۔

کہ اب تو سو جاؤ۔

ہم شیوک کو کیسے انکار کرتے۔

ہم سو گئے۔

جاتے۔ کبھی کوئی جیب نیچے شیوک کے کناروں سے اوپر آ جاتی.... بلکہ ایک بڑا ٹالہ جو شیوک میں گرتا تھا، رات کے وقت جب تیز ہو جاتا تو اس کے پانی سڑک پر اتنی تندی سے بہتے کہ ریسٹ ہاؤس اور اوپر چلو کے بازار کے درمیان رابطہ منقطع ہو جاتا..

”چلو کا وہ بازار پرانے قصبے کہانیوں میں گمشدہ ایک خواب سا بازار تھا، اور یہ بازار جس میں میں آ نکلا تھا.. اسے میں قطعی طور پر نہیں پہچانتا تھا.. کوئی ایک دکان کوئی ایک عمارت ایسی نہ تھی جو شناسا لگتی ہو.. یہاں تک کہ جو پس منظر میرے ذہن میں تھا، وہاں اس سے الگ ہی کوئی منظر تھا.. دکانوں کی لمبی قطاریں تھیں.. جیپیں دندناتی پھرتی تھیں.. بے شمار لوگ تھے.. یہاں تک کہ ٹریفک پولیس بھی تھی..

مجھے صرف اپنے ڈاکخانے کی فکر تھی..

یہ ڈاکخانہ میں نے بہت دنوں سے اپنے اندر رکھول رکھا تھا.. جوانی میں انسان اداسی اور رومان کی ایک غیر حقیقی فضا میں تنہا ہونا چاہتا ہے۔ یونہی اپنے آپ پر ٹرس کھانے کے لیے کہ کوئی مجھ سے پیار نہیں کرتا۔ سب لوگ میرے خلاف ہیں اور کڑھتا رہتا ہے.. عمر ذہلی ہے تو وہ بہت سے احساسات اور رشتوں سے الگ ہوتا جاتا ہے.. بیزار اور چڑچڑا ہو جاتا ہے اور یوں تنہا ہونا چاہتا ہے.. اس دوسری قسم کی تنہائی کے لیے ایک ذاتی ڈاکخانہ بے حد کارآمد ثابت ہوتا ہے.. آپ سب سے کٹ کر اس میں ایک پرانے بچے پر بیٹھ جاتے ہیں اور پوسٹ کارڈوں اور لفافوں پر مہریں لگانے لگتے ہیں.. ان پوسٹ کارڈوں اور لفافوں میں آپ کی حسرتوں اور محبتوں کی تحریریں ہوتی ہیں..

اس لیے مجھے اپنے ڈاکخانے کی بہت فکر تھی..

میں نے اس ڈاکخانے کو چلو سے پہلی ملاقات کے دوران دریافت کیا تھا.. شیوک سے بلند وادی کی ڈھلوان پر بازار کی جو چند کچی دکانیں تھیں، وہاں ایک نیچی چھت کی بوسیدہ شہتیروں والی ایک کوٹھڑی تھی جس کے باہر سرد ہوا میں ہاتھ سے لکھا ہوا ایک بورڈ جھولتا تھا جس پر ”ڈاکخانہ چلو“ کی عبارت تھی.. اس کی چوکھٹ کے اندر جاتے ہوئے ذرا جھکنا پڑتا تھا اور اندر نیم تاریک سردی میں ایک ٹوٹا ہوا بیچ تھا ایک چھوٹا سا کاؤنٹر تھا.. ایک سالخورہ آہنی جھنگلے کے عقب میں ایک جلیقی بوڑھا نہایت دھیرج اور اطمینان سے چند پوسٹ کارڈوں پر مہریں لگا رہا تھا.. وہ ایک پوسٹ کارڈ پر مہر لگاتا اور پھر اسے بہت غور سے دیکھ کر اطمینان کر لیتا کہ مہر پر

”وہ ڈاکخانہ جہاں سے میرے لیے ایک خط پوسٹ ہوا تھا“

مسلمان نے چلو کے بازار سے ہوشے جانے کے لیے ایک جیب ہانڈ کر لی تھی.. لیکن ہوشے تک کے لیے نہیں.. کاندے کے گاؤں تک.. اس لیے کہ اس سے آگے کاندے والے کاپل سیلاب سے بہہ چکا تھا.. ہوشے تک براہ راست جیب نہیں جاسکتی تھی.. اور شنید تھی کہ اس نالے کے اوپر مقامی لوگوں نے چند شہتیر رکھ دیے ہیں جنہیں پار کرنے پر دوسرے کنارے پر ہوشے کے لیے جیپیں میسر ہو سکتی تھیں.. ہم آج چھین مسجد کی زیارت کر چکے تھے..

اس بلتستان کی سب سے قدیم تقریباً چھ سو برس پرانی چٹانوں پر ایک گھونسلے کی مانند براجمان مسجد میں گیان دھیان کے لیے ایک ایسی کوٹھڑی تھی جس میں کئی برس جوشتر میں نے دنیا کو ترک کر دینے کی آرزو کی تھی.. محض رومانوی ہو کر کہ ہم دنیا دار لوگوں کی آرزو میں بھی کھوٹ ہوتا ہے..

ہمیں کاندے سے جانے والی جیب سے دو بچے موٹل کے صحن میں پہنچنا تھا.. ابھی کچھ وقت تھا..

اتنا وقت تھا کہ میں اوپر چلو کے بازار میں چند لمبے گزار سکتا..

چلو کی طرح چلو کا بازار بھی بدل چکا تھا..

میرے ذہن میں جو تصویر تھی، اس میں ایک بلند کوہستانی بستی کی ڈھلوان پر چند کچی پکی دکانیں تھیں اور ان پر بادل اترے ہوئے تھے.. وہاں کے ہاں ایک اجنبی کو دیکھ کر ٹھہر جاتے تھے.. ہوا بے حد سرد تھی.. چونکہ اوپر بازار تک کوئی باقاعدہ سڑک نہیں تھی اس لیے بہت کم لوگ اوپر

”دو تو پرانا ڈاکخانہ ہوا کرتا تھا صاحب.. اب تو ترقی ہو گیا ہے سیاچن کی وجہ سے.. اس کی جگہ تو نیا مارکیٹ بن گیا ہے.. اور درکشاپ بن گیا ہے.. اور پرانا ڈاکخانہ بنا ہے.. بالکل سکر دو کے موافق.. اس میں پی سی ایڈ بھی کھلا ہے۔ بے شک امریکہ فون کرو.. آپ نے کہیں فون کرنا ہے؟“

”نہیں۔“

”ڈاک کا لفافہ وغیرہ بھی ادھر ملتا ہے لیکن اب خط کون لکھتا ہے صاحب.. یا فون کر لیتا ہے یا ادھر سا بھر کیفے بھی ہے کمپیوٹر پر بات کر لیتا ہے.. ترقی ہو گیا ہے۔“

ہر شخص کی زندگی میں چلو کے پرانے ڈاکخانے کے ماحول ایسا کوئی ایک گوشہ ہونا چاہیے جس میں وہ الگ ہو کر پوسٹ کارڈوں اور لفافوں پر مہریں لگا سکے.. ایک مہر میرے بدن پر یوں ثبت ہوئی جیسے گھوڑے کی پشت پر سرخ جلتے ہوئے لوہے کے ساتھ ملکیت کا نشان لگاتے ہیں اور گوشت کے جلنے کی بو آتی ہے....

تاریخ اور ڈاکخانہ چلو کے الفاظ واضح ہیں یا نہیں.. اگر اس کی تسلی نہ ہوتی تو وہ ایک اور مہر نہایت احتیاط سے اس پر ثبت کر دیتا..

اس پوسٹ ماسٹر کے چہرے پر جو اطمینان تھا.. وہ ایک ایسے شخص کا تھا جو زندگی سے بے حد مطمئن ہو..

شائد وہ نہیں پیدا ہوا تھا.. یہیں رہتا تھا.. آج تک اس چوکھٹ سے باہر نہیں گیا.. ایسا لگتا تھا..

”دن میں کتنے خط آتے ہیں؟“

”صاحب کبھی بکھار تو میں پچیس آ جاتے ہیں.. ایک دو مٹی آرڈر بھی آتے ہیں۔“

”آپ نکلیں بھی فروخت کرتے ہیں؟“

”ہاں صاحب.. لفافے.. پوسٹ کارڈ اور رجسٹری کے لفافے بھی.. ڈاکخانہ ہے۔“

”کوئی ڈاکیہ بھی ہے؟“

”ہاں ناں.. میں خود ہی ڈاکیہ ہوں.. یہاں سے فارغ ہو کر ڈاک بانٹتا ہوں لیکن جانے سے پہلے ڈاکخانے کو تالا ضرور لگاتا ہوں.. لوگ ہنستے ہیں کہ ایسا کیوں کرتے ہو بلتستان میں تو چوری چکاری کا رواج نہیں.. اس لیے تالے بھی کم فروخت ہوتے ہیں تو میں کہتا ہوں، تم نہیں سمجھ سکتے یہ گورنمنٹ کا مال ہے، اس کی حفاظت ضروری ہے۔“

اس کچی کوٹھڑی سے باہر جانے کو جی نہیں چاہتا تھا.. اس لمبے پتھن مسجد کی بلند یوں سے اترنے والے بادل بازار میں سفید ہونے لگے اور ان کی ہلکی دھند ڈاکخانے میں دھیرے دھیرے داخل ہونے لگی.. کچے فرش پر پھیلنے لگی اور پوسٹ کارڈوں اور لفافوں پر درج پتوں کو گیلیا کرنے لگی..

یہ ڈاکخانہ میرے اندر رہ گیا.. اسی حالت میں.. کچے فرش اور اس پر پھیلتی دھند اور تنہائی اور سکون کے ساتھ.. میرے اندر منتقل ہو گیا.. اور اگلے کتنے برس تک میں اس جٹی بوڑھے کی جگہ بیٹھ کر مہریں لگاتا رہا.. اس لیے مجھے اپنے اس ڈاکخانے کی فکر تھی..

”ادھر ڈاکخانہ کدھر ہے؟“ میں نے ایک چپاوی کوروک کر پوچھا..

”ادھر اوپر ہے۔“

”لیکن وہ تو یہاں تھا.. اس بازار میں..“

اور ہم تو کچھلے بیس برس سے لگا تار جانے کتنے برگدوں کے سائے میں بیٹھے تھے۔
 حیمان دھیان میں گم رہے۔ لیکن کچھ بھی نہ ملا۔ کے نو۔ پاک سرائے۔ ناگاپربت اور سنولیک
 ایسے عظیم برگدوں تلے دھونی رمائی۔ ایسے برگد جن کی شاخیں برف کی تھیں جن کے چوں میں
 جھیلیں سرد ہوتی تھیں اور جن کی شاخوں میں سرد ہوا کہیں شوکتی تھیں اور موت زندگی کی پہریدار
 تھی۔ کچھ بھی نہ ملا۔

راوی روڈ کی ایک ورکشاپ کے قریب میاں صاحب اپنی نشست سے اٹھ کھڑے
 ہوئے۔ ”مجھے یہاں اتار دیں۔ میرے ایک عزیز کی ورکشاپ ہے۔ یہاں سے میں اپنے بیٹے کو
 فون کروں گا، وہ مجھے لینے آ جائے گا۔ پتہ نہیں بیگم کی طبیعت کیسی ہے۔ شوگر لیول کا کیا حال ہے۔“
 میاں صاحب اپنا رُک سیک گھسیٹتے۔ گھٹ کی شاخ کا چینی ٹیلی ویژن اٹھاتے۔ کچھ
 کیتلیاں اور برتن سنبھالتے اتر گئے۔

باقی رو گئے چھ!

لاہور کی گھنی ٹریفک میں ایک دیگن پہاڑوں سے واپس آئی ہے اور اس میں ابھی کچھ
 موسم ٹھہرے ہوئے ہیں۔ اور چھ کو نور د پہلو بدلتے ہیں۔ گرمی ناقابل برداشت ہے۔

”باقی رہ گئے چھ... واپسی“

دیگن راوی کے پرانے ٹیل پر تھی۔
 سب سے پرانے تو نہیں کہ وہ پل مخدوش قرار دیا جا چکا تھا اور اس پر سے صرف تانگے
 اور ریڑھے گزر سکتے تھے۔
 اس ٹیل کے پار تخت لاہور تھا۔
 ہم اس تخت لاہور سے بیس کیپ تک جانے کے لیے نکلے تھے اور ہو کہاں آئے؟
 کیا پتہ کہاں سے ہوئے۔
 شہر کا شور چنگھٹا تھا۔
 ہم سبے ہوئے بیٹھے تھے۔ یقین نہ کر سکتے تھے کہ صرف دو ہفتے پیشتر اس شہر پر شور کے
 باسی تھے اور یہیں سے نکلے تھے۔

ایسے اذیت ناک شور میں ہم کیسے رہتے تھے۔ اور اب کیسے رہیں گے۔
 ہم تخت لاہور سے نکل کر پہاڑوں کے تخت کی جانب گئے تھے اور ان کے چرنوں میں
 بیٹھے تھے کیونکہ بیس کیپ پہاڑوں کے چرن ہی تو ہوتے ہیں۔ ہم نے ان کو مرشد مانا تھا، ان کی
 مریدی اختیار کی تھی۔ ان کی بیعت کی تھی۔
 تو کیا ہمیں نروان ملا۔ کوئی انعام ملا۔

نہیں نروان کبھی نہیں ملا۔ یہ تو ایک مسلسل عمل ہے۔ ہر برس چرنوں تک جانا پڑتا ہے۔
 قدموں میں بیٹھنا پڑتا ہے۔ ہر برس نئی بیعت ہوتی ہے۔ بدھ بابا تو نصیب والے تھے کہ ایک بار
 برگد کے سائے میں تک کر بیٹھے رہے۔ تپسیا کی اور فارغ ہو گئے۔

”مچلو میں دل مچلو مچلو.. چھیڑخو بانیاں سے چلی جائے اسد..“

ہم بہ قانچی ہو شے حواس..
نہیں..

ہم بہ قانچی ہو شے حواس.. ہو شے کو جاتے تھے..

نچلو سے.. نچلو کے تاج محل موئل سے ایک کھٹارا چپ میں بمشکل سوار.. بلکہ میں اور حسن تو بہ آسانی سوار کہ ہم دونوں اگلی نشست پر قابض تھے اور بقیہ ممبران دیکھتے تھے میں کوہ نور دی کے سامان اور رک سیکوں میں پھنسے ہوئے.. پیک ہوئے بمشکل سوار.. ہو شے کو جاتے تھے.. دریاے شیوک کے کنارے کنارے..

اس کے رواں پانیوں کی خاموشی دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ یہ ازل سے یونہی بہتے آئے ہیں.. اور یونہی بہتے چلے جائیں گے..

وادئ نچلو کے دامن میں بہتے اس دریا میں ایک عجیب لاپرواہا شاہانہ بہاؤ ہے..

یہ اس ندیا کی مانند ہے جس سے مخاطب ہو کر کہا جاتا ہے کہ.. میرے سناں جی اتریں گے پار ندیا دجیرے.. ہو.. یہ دجیرے بہتا ہے.. آپ اس کی بہاؤ کو تا دیر دیکھئے تو یہ آپ کو اپنے ساتھ بہا کر نہیں لے جاتا بلکہ آپ کے موڈ کے مطابق اپنا بہاؤ دجیرا تیز کر لیتا ہے..

شیوک، سندھ کی مانند نہ تو آپ کو ڈراتا ہے اور نہ ہی ایک عظیم تہذیب کے دھارے کے طور پر پر تکبر ہوتا ہے.. بس بہتا چلا جاتا ہے..

مجھے راستہ یاد آ رہا تھا.. کیونکہ میں نچلو سے ہو شے جا چکا تھا.. اس لیے مجھے راستہ یاد آ رہا تھا کہ اب اس مختصر آبی جزیرے اور جھاڑیوں کے دوسری جانب شیوک کے پار جانے والے

مسافروں کے لیے ایک ایسی کشتی ہوگی جو ہزاروں برس پیشتر ایجاد ہوئی تھی.. زدوہ کی کھال کو.. ایک مشکیزے کی طرح.. اس میں تو پانی بھرتے ہیں لیکن اس میں اپنے پیچیدہوں پر زور لگا کر منہ سے ہوا بھر کر پھلا کر.. متعدد کھالوں میں ہوا بھر کر ان کھالوں کو باندھ کر ایک کشتی تیار کی جاتی ہے جس کے ڈوبنے کا کوئی امکان نہیں ہوتا.. جسے ”انڈس رافٹ“ کہا جاتا ہے، ایک ایسی کشتی ہوگی..

کچھلی بار میں نے اس کے ملاج سے باتیں کی تھیں جو مسافروں کا انتظار کرتا تھا.. لیکن جب ہم اس مختصر آبی جزیرے اور جھاڑیوں کے دوسری جانب گئے تو وہاں جہاں میں نے دس برس پیشتر انڈس رافٹ کو تیرتے دیکھا تھا، وہاں کچھ بھی نہ تھا.. کیا اب لوگ شیوک کے پار نہیں جاتے؟ ”حسین..“ میں جیپ ڈرائیور سے مخاطب ہوا جو ایک ہلکی چھو کر اٹھا.. وہ چپ رہا.. ”حسین..“ میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر زور بلند آواز سے کہا..

”صاحب.. میں حسین نہیں ہوں، یوسف ہوں.. حسین میرا بھرا ہے اور وہ پیچھے بیٹھا ہے..“ ”سوری.. ہمیں سب ہلکی ایک جیسے لگتے ہیں.. تو یوسف یہاں ہمیشہ مشکیزوں والی ایک کشتی ہوا کرتی تھی، شیوک کے پار جانے کے لیے..“

”ہاں صاحب ہمارے بچپن میں ہوتی تھی.. پھر ترقی ہو گیا.. سیاحین کا ٹریک شروع ہو گیا تو اب ادھر پار جانے کے لیے پل بن گیا ہے تو اس کا ضرورت نہیں ہے..“ ”تو وہ ملاج اب کیا کرتے ہیں جو مشکیزوں کی کشتیاں کھے کر روزی کھاتے تھے، ہزاروں برسوں سے کھاتے تھے..“

”کیا پتہ صاحب.. اوپر بازار میں مزدوری کرتا ہوگا.. یا مکرچپ گیا ہوگا..“

وادئ نچلو کی مشکیزوں کی اس کشتی کا تذکرہ قدیم ترین سفرناموں میں بھی ملتا ہے.. یہ ہزاروں برسوں تک جب سے شیوک تھا، تب سے یہ اس کے پانیوں پر راج کرتی چلی آتی تھی.. لدخ سے آنے والے بدھ بکھشو بھی اس پر سوار ہو کر پار اترتے ہوں گے.. شاہ ہمدان نے بھی اسی پر سفر کیا ہوگا.. پار اترے ہوں گے.. یہاں تک کہ میں نے بھی دس برس پیشتر اس کے ملاج سے گفتگو کی تھی اور اب وہ کشتی وہاں نہیں تھی.. ایک قصہ پارینہ ہوگئی تھی کیونکہ.. ترقی ہوگئی تھی.. سیاحین کی جنگ کی وجہ سے..

اور تقریباً وہیں جہاں اس ”انڈس رافٹ“ کا گھاٹ ہوا کرتا تھا وہاں پر ایک شاندار پل تعمیر ہو چکا تھا اور ہم اس کے پار چلے گئے..

”مثلاً۔“

”مثلاً یہ کہ سرہم سفر میں بھی روزے رکھتے ہیں۔ نمازیں ملا کر نہیں پڑھتے، الگ الگ پڑھتے ہیں۔ اور ہم عبادت بہت کرتے ہیں۔ درویش لوگ ہوتے ہیں سر۔“

”تو کیا ایسا ممکن نہیں تھا کہ آپ لوگ چلو کی خانقاہ کو جوں کا توں رہنے دیتے۔ ایک تاریخی یادگار کے طور پر اور نئی خانقاہ کسی اور مقام پر تعمیر کر لیتے۔“

”نہیں صاحب۔ ہمارا مذہبی لوگ۔ ملا لوگ کہتا ہے کہ خانقاہ کا مقام نہیں بدل سکتا۔“

چلو کے بارے میں میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ اسے دیکھ کر دل چل جاتا ہے، اس لیے اس وادی کو چلو کہا جاتا ہے۔ کیونکہ چھلنے کے عمل میں ایک شور ہے۔ ایک اٹھل پھل ہے جب کہ اس وادی کو دیکھ کر انسان شانت ہو جاتا ہے۔

ایک پہاڑوں کے زینے سے اترتا تہہ در تہہ گاؤں۔ سنہری کھیت۔ خوبانیوں کے باغ۔ خوبصورت لوگ۔ بھولے لوگ۔ نہایت قدیم تہتی باپے جیسے وادی شکر میں بھی ملتے ہیں اور اسکو لے میں بھی۔ کچھ بھکی ہوئی دیوانی روچیں۔ خوب روڑیاں جن کے رخسار خوبانیوں سے بنے ہوئے تھے اور جن کی آنکھوں میں نیلے شیدو کہتے تھے۔ گڑیوں ایسے کھلونے بنے۔

ایک میری عمر کے بابا جی اپنی کمر پر گندم کا تقریباً آدھا کھیت اٹھائے۔ جھکے ہوئے مگر پھر بھی ہمیں دیکھ کر مسکرانے سے باز نہ آئے۔ مشقت میں جُتے ہونے کے باوجود ایک مسکراہٹ اور ایک سلام عطا کر کے گزرے۔ خوش ہاش اور اپنے حال میں مست سادہ اور پیارے پیارے لوگ۔ شال میں کئی وادیاں ایسی ہیں جن کے باشندوں کے چہروں پر جو خوشی اور مسرت مسلسل چمکتی ہے، ہم تہذیب یافتہ روحوں کو اس کی سمجھ نہیں آتی۔ ایک انسان کے پاس ٹیوٹا یا ہونڈا نہیں ہے۔ ڈیفنس یا گلبرگ میں گھر نہیں ہے۔ گھر میں السیشن کتا نہیں ہے تو وہ انسان کیسے خوش رہ سکتا ہے۔ کمر پر گندم کا آدھا کھیت اٹھائے چلتا ہے۔ رات کے کھانے میں شائد اسے چند خوبانیاں اور ایک روٹی ملے۔ ایک کچی سرد کوٹھری میں ملے۔ پھر بھی وہ خوش ہو تو یقیناً فائز اٹھل ہوگا۔ مجھے وادی کا لاش کے کافروں کی بے مہار خوشی بھی سمجھ میں نہ آتی تھی۔

اور مجھے وادی ”چلو“ کے مسلمانوں کی بے پایاں مسرت بھی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ ہونڈا، ڈیفنس اور السیشن کے مالکوں کے چہروں پر بھی ایسی خوشی نہ ہوتی تھی۔ ایک منظم اور قبض شدہ خوشی ہوتی تھی۔

پار تو چلے گئے لیکن ایک ڈاکٹرانہ اور ایک منگیڑوں والی کشتی پیچھے رہ گئی۔

شیوک کے پار ہوئے، سالنگ کے گاؤں میں سے گزرے تو ہمیں کاندے کے نالے کا جوہل سیلاب میں بہہ گیا تھا، اس کی چٹا شروع ہو گئی۔ کیا ہم نالے پر ایسا تہ چند شہتروں کے پل پر سے گزر جائیں گے، اگر گزر جائیں گے اور پار جائیں گے تو کیا وہاں سے ہمیں ہوشے کے لیے جیپ مل جائے گی۔

اس لمحے مشارم کی برف پوشی نے ایک جھلک دکھا دی اور ہم اس کے دیدار میں محو ہو گئے کہ ہم نے اس چوٹی کے بیس کیسپ تک جانا تھا۔ اور پھر فوراً ہی خیال آیا کہ نہیں جانا۔ ہم نے تو سکرو میں اپنا پروگرام تبدیل کر دیا تھا اور اب ہم گندوگور کی چوٹی پر بقول شاہد پاکستان اور اسلام کو سر بلند کرنے کے لیے اسے فتح کرنے کو جاتے تھے۔

سالنگ کے بعد ایک ویرانہ آیا۔ کچھ چڑھائی آئی اور پھر چلو نظر آنے لگا۔

چلو ایک عجیب وادی تھی۔ بچھلے پہر کی دھوپ میں اٹھتی۔ جرمنی کے عظیم گوٹھک فن تعمیر کے کلیساؤں کی مانند۔ زرد دھوپ میں اٹھتی چٹانوں کے دامن میں۔ شیوک سے بلندی پر ایک ہرا بھرا۔ گندم سے بھرا ایک عجیب گاؤں تھا۔ جس کی خانقاہ کا تہتی مینار اور اس پر انکا ایک ستارادنی کی بلند ترین چٹانوں کے پس منظر کے ساتھ ذہلی دھوپ کی زرد لگا ہوں میں آیا ہوا ایک ایسی خوابناک تصویر تھا جو ہمہ موجود میں نہ تھی۔ بہت اور لدخ کے گئے زمانوں میں تھی۔

اسے زیادہ دیر تک دیکھنا ممکن نہ تھا۔

یہ خانقاہ بھی ترقی کا شکار ہو چکی تھی۔ اسی مقام پر ایک سینکڑوں برس پرانی خانقاہ کی عمارت تھی جسے ڈھاکر موجودہ خانقاہ کوئی بنیادوں سے اٹھایا گیا لیکن کرم یہ کیا گیا کہ اس کا طرز تعمیر جوں کا توں رکھا گیا۔ اس کے باوجود مجھے اس کا نیا پین ٹھکتا تھا۔

”یوسف۔“

”میں حسین ہوں سر۔ یوسف پیچھے چلا گیا ہے آرام کرنے کے لیے۔“

”تو حسین۔ تم ظاہر ہے تمام بلندیوں کی مانند شیعہ ہو۔“

”نہیں جناب۔“ اس نے احتجاج کیا۔ ”میں نور بخشی ہوں۔“

”کچھ فرق ہوتا ہے؟“

”بہت فرق ہوتا ہے سر۔“

مچلو کے ساتھ یہ بے حد زیادتی تھی کہ ہم اس میں سے سرسری گزرتے جاتے تھے اور ایک نسبتاً خشک اور بے روح گاؤں ہونے کی جانب صرف اس لیے جا رہے تھے کہ وہ مشاہیرم کے دامن میں تھا۔ گندوگورو کے راستے میں تھا۔

بس یہی وہ کھیل ہے جسے نصیب کہا جاتا ہے۔

ایک سوہنے لوگوں کے ماتھوں پر بھاگ نہیں ہوتے اور کرموں والیاں چناب میں ڈوب جاتی ہیں اور جو شکل والی نہیں ہوتیں، وہ پارا تر جاتی ہیں۔ یہی وہ کھیل ہے جسے نصیب کہا جاتا ہے۔

اگر آپ ناگہاں بہت کے زوہل چہرے کے راستے میں ترشک کا گاؤں ہیں۔ فیئری میڈو کے چہرے کے آغاز میں تا تو ایسی خشک اور دہیات ہستی ہیں تو ہر کوئی آپ کو جانتا ہے۔ کے ٹوکی پہلی منزل ہیں تو دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ مشاہیرم کے سائے میں ہیں تو ہوش رہا ہونے ہیں۔ را کا پوشی کے راستے میں مناہن ہیں تو آپ کی دھوم ہے۔

لیکن اگر آپ پر کسی بلند اور مشہور چوٹی کا سایہ نہیں تو بے شک آپ مچلو ہی کیوں نہ ہوں، تلس، کیرس، یا چلو بھی ہوں تو آپ کو کوئی نہیں جانتا۔ لوگ آپ میں سے سرسری گزر جاتے ہیں۔

ہم بھی اگرچہ سرسری گزرنے کے لیے گزرنے کو تھے لیکن ہمیں مجبوراً مچلو میں رکنا پڑا کیونکہ مخالف سمت سے آنے والی ایک جیپ کی کچھ ٹلپیں مچلو میں سے گزرنے والی کچی جیپ روڈ کے درمیان میں آ کر جواب دے گئیں اور وہ جیپ ہمارے سامنے ایک بے بس مردہ حالت میں تھمی کھڑی تھی اور ہمارا راستہ بلاک کئے ہوئے کھڑی تھی۔ چنانچہ ہمیں بھی مجبوراً رکنا پڑا۔

یہ ہمارا ڈرائیور حسین تھا۔ یا شاید اس کا بھائی یوسف تھا جو مچلو کے بازار میں جیپوں کا شہرہ آفاق ملکیت تھا، فوری طور پر اپنی جیپ سے اتر اور خراب شدہ جیپ کے نیچے سرک کر اس کے پیٹ کا تفصیلی معائنہ کرنے لگا۔

ہم کیا کرتے... جیپ سے اتر کر ادھر ادھر بکھر گئے۔

مچلو کے کھیتوں میں کام کرتے کسان۔ چھوٹے چھوٹے بچے اور بچیاں اور خواتین ہمارے ارد گرد ہو گئے اور ہمیں اپنی مسکراہٹوں اور مسرتوں سے جگمگانے لگے۔ یہ سب کے سب۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں یونہی بے وجہ خوش تھے، چہرے گلہار کے خوش تھے۔ میں نے

ایک نہایت غیر جانب دار تجزیہ نگار کی حیثیت سے درجنوں چہروں کا بغور مطالعہ کیا اور ان میں سے ایک بھی ایسا نہ تھا جس کا منہ لٹکا ہوا ہو۔ ہماری طرح اس کی بو تھی بنی ہوئی ہو۔

ایک دوشیزہ کمر پر شہوت کی ٹہنیوں سے بنی ہوئی مخروٹوں کی بو تھی۔ جھکی ہوئی کہ نوکری تازہ کچی پکی خوبانیوں سے لبریز تھی، حیرت بھری اور بچوں کی معصومیت ایسی کھلی کھلی آنکھوں کے ساتھ ہماری جیپ کے قریب ذرا رکی تو حسین صاحب خواہ خواہ شرمانے لگے۔

”تارڑ صاحب میں کچھ خوبانیاں خرید لوں۔ یہ لوگ مانسڈ تو نہیں کریں گے؟“

”یہ لوگ تو مانسڈ نہیں کریں گے کہ ہماری طرح بنیاد پرست نہیں ہیں اور ان کے دلوں میں بھی ہماری طرح کھوٹ نہیں ہے لیکن آپ کی بیگم نہ مانسڈ کر جائیں۔“

”نہیں جی۔ میں تو صرف خوبانیاں خریدنا چاہتا ہوں۔“

”پلیز گو اہیڈ۔ بلکہ میں آپ کی تصویر اُتارتا ہوں تاکہ سند رہے اور بھابھی کو بدگمان کیا جاسکے۔“

اب صورت حال کچھ یوں ہوئی کہ حسن صاحب شرماتے ہوئے اس دوشیزہ کی جانب بڑھے۔ ادھر دوشیزہ نے بھی جواباً شرمنا شروع کر دیا۔ مبصرین کا خیال ہے کہ اس شرمائے کے مقابلے میں حسن صاحب کہیں آگے نکل گئے تھے۔

”حسن صاحب۔“ میں کمرے کے لینز میں دیکھتا دیکھتا تھک چکا تھا۔ ”خدا کے لیے اب خوبانیاں خرید بھی لیجیے۔“

حسن صاحب نے اشاروں میں اس دوشیزہ کو بتایا اور ایک دو خوبانیاں اٹھا کر اسے سمجھایا کہ میں یہ خریدنا چاہتا ہوں۔

دوشیزہ کی آنکھوں کی چیریاں حیرت اور بھولپن سے بڑی ہو گئیں۔ وہ ایک اتنی معصوم روح تھی۔ آلودگی اور بُری نظروں سے یکسر ناواقف کہ وہ ڈرتی۔ اپنے رخسار مزید سُرخ کرتی۔ مسکراتی ہوئی کبھی سر کو جھکاتی کبھی حسن صاحب کو دیکھتی، ایک نا سنجھی کی کیفیت میں کھڑی رہی۔ حسن نے اس کی جھکی کمر پر بوجھ نوکری میں سے خوبانیوں کی مفتحیاں بھر بھر کر اپنی پی کیپ کو بھرا اور پھر دس روپے کا ایک نوٹ قیمت کے طور پر اس کی جانب بڑھا دیا۔

وہ دوشیزہ اس نوٹ کو دیکھ کر ایسے خوفزدہ ہوئی جیسے وہ ایک زہریلا بچھو ہو جو اُسے ڈس لے گا اور ہم کر پیچھے ہو گئی۔

اور یاد رہے کہ مچلو کے بہت سے لوگ.. ہماری جیب کے ارد گرد کھڑے ہوئے لوگ.. بچے.. بوڑھے اور جوان اور خواتین اس خوبانی تماشے کو دیکھ رہے تھے اور خوب انجائے کر رہے تھے..

دو شیزہ ہم کر پیچھے ہو رہی تھی..

ہم سب نے مشترکہ طور پر ایک باباجی سے درخواست کی.. یہ باباجی گندم کا ایک گٹھا اٹھائے اُدھر آئے تھے اور اب ایک پیڑ تلے سستار ہے تھے.. کہ بزرگو! اس بچی سے کہو کہ خوبانیوں کی قیمت وصول کر لے..

باباجی بھی باغی نکلے اور سر ہلاتے ہوئے.. نہیں نہیں.. کہنے لگے.. اور ان کی مسکراہٹ میں کوئی کمی نہ آئی..

”یوسف..“

”جی میں حسین ہوں.. یوسف تو خراب شدہ جیب کے بچے ہے..“

”تو حسین پلیز اس لڑکی سے کہو کہ ہم ان خوبانیوں کی قیمت ادا کرنا چاہتے ہیں..“

”ادھر روانہ نہیں ہے سر.. آپ مہمان ہیں..“

”نہیں یوسف.. میرا مطلب ہے حسین.. پلیز سفارش کرو..“

حسین نے اس دو شیزہ اور مقامی لوگوں سے طویل مذاکرات کئے اور تب جا کر نہایت جھجکتے ہوئے دو شیزہ نے وہ دس روپے کا نوٹ قبول کیا.. اور یوں قبول کیا کہ اس کی مسکراہٹ رکتی نہ تھی اور اس کے پیغمبری معصومیت والے سپید چہرے پر خوبانیوں، چیریوں اور مشاہیر کی سفیدی یک جا ہوتی تھی.. چھیڑ خوبانیوں سے چلی جائے اسد.. شنید تھی کہ میچے میدانوں سے لوگ آتے ہیں اور ایسے چیری چروں اور خوبانی رخساروں کو بیاہ کر لے جاتے ہیں.. میرے بیٹے بھی اگر شادی بیاہ کے معاملے میں میرے بس میں ہوتے تو میں انہیں یہیں لے کر آتا..

ہماری جیب کے پیچھے ایک اور جیب آ کر..

اس جیب کی کچلی نشست پر دو نہایت بے سنورے صاف ستھرے ڈینڈی نو جوان براجمان تھے.. سیاہ چشموں میں.. نیلی جینوں اور شوخ فی شرٹوں اور مہنگے جوگرز میں.. انہوں نے ہم ویسی کوہ نور دوں سے راہ درسم بڑھانے کو اپنے لیے مناسب نہ جانا.. اور وہ یقیناً اپنے سیاہ چشموں کے عقب سے ہم پر ایک چشمِ حقارت ڈالتے تھے.. وہ اپنی جیب سے باہر آئے.. آپس میں

انگریزی میں تبادلہ خیال کرتے ہوئے اور ہمارے ڈرائیور سے نہایت رعب سے پوچھا کہ.. اوئے تم نے ہمارا راستہ کیوں روک رکھا ہے.. جیب آگے کیوں نہیں لے جاتے.. یوسف جو ابھی ابھی خراب شدہ جیب کے میچے سے بے حد خراب شدہ حالت میں برآمد ہوا تھا، ان کی اونچی ہواؤں میں قیام کرنے کو بالکل خاطر میں نہ لایا اور نہایت بدتمیزی سے کہنے لگا.. ”سامنے کا جیب کا کچھ پلیٹ فری ہو گیا ہے.. جب تک وہ نہیں چلے گا تو ہم کیسے چلے گا.. آپ کو جلدی ہے تو اپنا جیب آگے لے جاؤ..“

ڈینڈی خوش لباس ستھرے نو جوان نے اپنی جیب کے ڈرائیور کو حکم دیا کہ آگے لے جاؤ..

اُن کے ڈرائیور نے جواب میں جانے کیا کہا اور ہلٹی زبان میں کہا کہ وہ دونوں نو جوان ٹھنڈے ہو گئے..

یہ دونوں اپنے تئیں فیشن ماڈل نو جوان ہنزہ کے باشندے تھے اور گائیڈ تھے.. اور دیگر وادیوں.. گمر.. دیا میر.. رُوپل یا بلتستان کے باشندوں کو اُسی چشمِ حقارت سے دیکھتے تھے جو انہوں نے ہمارے لیے وقف کر رکھی تھی..

ان میں سے ایک نو جوان خاصا چلیلا اور نسوانی تھا.. اگر امریکہ میں ہوتا تو کسی ”سمے“ تحریک کا بدنی کشش کا حامل ایک نمائندہ ہوتا.. وہ بولتا تو ایک آہ بھر کر عمدہ انگریزی بولتا..

بالآخر خراب شدہ جیب جس کے شارٹ ہونے کے امکان معدوم ہو گئے تھے، اسے وکیل کرا ایک کھیت میں اتار دیا گیا.. راستہ صاف ہو گیا.. ہم نکلے اور مچلو سے نکلے..

سفر پھر شروع ہو گیا..

ہم سمجھتے ہیں کہ اگر نقل یہ مطابق اصل ہے.. اور نقل بہت برس چلتی ہے نہ مرجھاتی ہے اور نہ اس کی شکل میں فرق پڑتا ہے تو پھر اصل کو اپنے گلدانوں میں سجانے سے فائدہ.. جو ایک دو روز میں مرجھ جاتی ہے اور اس کی مہک تمام ہو جاتی ہے.. ہم لوگ گھائے کا سودا کرنے والوں میں سے نہیں ہیں..

میں نے کچھ گھروں میں ہر صبح نقلی پھولوں پر ان کی اصل کے مطابق جو آرٹیفشل مہک ہوتی ہے، اس کا چمڑکاؤ ہوتا دیکھا ہے.. بس یہی.. تہذیب کا فرق ہوتا ہے..

تلس کے بعد.. جہاں پانی کم تھا اور بقول حسین یہ وادی مچلو سے بھی زیادہ پرکشش تھی، چڑھائی شروع ہو گئی.. دریا کے پار جواب ہوشے دریا کھلاتا تھا، ہوش رہا بلند چٹانوں کی ایک مسلسل دنیا تھی جو آسمان کی قربت میں تھی.. ان چٹانوں میں پوشیدہ وادیوں اور برفانی تودوں میں سے اترنے والے نالے تھے جو دریا میں شامل ہو رہے تھے..

یکدم یہ لینڈ سکیپ آشنا ہو گئی.. اپنی ہو گئی.. دیکھی ہوئی ہو گئی.. دس برس پہلے قلب علی کی عنایت کردہ پھارو جیپ میں ہوشے کو جاتے ہوئے.. اپنے خاندان کے ہمراہ سفر کرتے ہوئے میں اسی لینڈ سکیپ میں سے گزرا تھا.. ادھر ڈھلوان کی گھاس پر بیٹھ کر میر نے تصویر اتروائی تھی.. سلجوق نے ایک پھول دریافت کیا تھا.. یعنی نے ایک نیوٹا سینڈویچ کھایا تھا..

ویسے میر اس سفر بھی شروع نہیں ہوا تھا.. میں تو ہوشے تک جا چکا تھا.. جب اس کے آگے ایک قدم اٹھے گا تب میر اس سفر شروع ہوگا.. سورج ڈھل رہا تھا.. دریا پار کی چٹانیں اپنے رنگ بدل رہی تھیں.. ہوا میں بلندی کی خنکی اور ان جھاڑیوں کی مہک تھی جو ایک خاص بلندی کے بعد جنم لیتی ہیں..

”وادی تلس جو مچلو کی چھوٹی بہن تھی“

”مچلو.. بہت ہرا بھرا اور زرخیز ہے..“ میں نے حسین سے یا یوسف سے کہا.. ”ہاں صاحب.. ادھر پانی بہت ہے ناں.. اوپر تلس اس سے زیادہ خوبصورت وادی ہے لیکن ادھر پانی کم ہے.. فصل کم ہے.. گندم کم ہے..“ تلس آیا تو وہ بھی مچلو کی ایک چھوٹی بہن تھی..

ویسے ہی سوہنے اور خوش و خرم باشندے.. وہی معصومیت اور وہی مسکراہٹ آمیز موسم.. گھروں کی کچی دیواروں پر دھرے گملے تھے.. گھی کے خالی ٹین تھے جن میں بخشی پھول کھلتے تھے اور بالکونیوں میں مٹی ڈال کر وہاں پیلے پھولوں کی کیاریاں بہا رہی تھیں.. بلتستان میں پھول ایک کمزوری ہیں.. بلتیسوں کو جیسے بھوک لگتی ہے، پیاس محسوس ہوتی ہے، ایسے پھولوں کی بھی طلب ہوتی ہے.. انہیں ملتی لوگوں کو.. اگر کسی خطرناک ڈھلوان کے دامن میں کوئی ایک خوش رنگ پھول نظر آ جائے تو وہ اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر اس تک پہنچتے ہیں اور اسے اپنی ٹوپی میں سجالیاتے ہیں.. غریب ترین کپے گھروں میں بھی ایک آدھ بونا ایسا ہوگا جس پر پھول لگتے ہیں.. صرف ادھر بلتستان میں ہی نہیں پورے پاکستانی شمال میں یہ دیوانگی مغل ہے.. رُومل میں.. جمیل کروہر کے کناروں پر.. درکوت کے قصبے میں.. پیسر اور اسکولے میں.. ہر جگہ گلہوں میں رنگ بھرے ہادنو بہا رہی ہیں.. ہمارے کراچی، لاہور یا اسلام آباد کے گھروں میں.. نہایت مہنگے اور شاندار گھروں میں بھی آرٹیفشل فلاورز کے گلدان تو ہوں گے لیکن تازہ پھول صرف اسی صورت میں سجائے جاتے ہیں جب کوئی مہمان ان کو لے کر آ جائے.. یہ شائد تہذیب کا فرق ہے..

پھسلن والے ہو گئے ہیں۔ نیچے نہ دیکھئے کہ کیا گزر رہا ہے اور نہ پھسلے تو آپ بھی پار جاسکتے ہیں۔ لیکن اگر گرتے ہیں تارڑ صاحب۔ تو پھر بس گر جاتے ہیں۔ نیچے پانی بہت تیز ہے۔“

اس نے ”تارڑ صاحب“ کہا تو میں چونکا۔ ”آپ مجھے جانتے ہیں؟“

”جی۔“

”لیکن آپ نے پہلے تو ہمیں لٹ نہیں کروائی۔ بہر حال آپ تجربہ کار ہیں۔ آپ کا کیا مشورہ ہے؟“

”مشکل تو نہیں۔ لیکن پھسلتے ہیں تو جاتے ہیں۔ ویسے نالے کے پار دو تین جیتیں کھڑی ہیں ہوشے جانے کے لیے۔“

اس دوران اقبال آ گیا۔

وہ ذرا دیر سے آیا تھا کیونکہ اقبال تھا۔ ایک سکول لیچر تھا۔

”تارڑ صاحب آپ نے آگے جا کر کیا کرنا ہے۔ یہاں رات کریں۔ کل میں آپ کو دریا کے پار پانا ماہ اور تنگ ما کی وادیوں میں لے کر چلتا ہوں۔ وہ جوانا دریا میں گرتا ہے اس کے ساتھ ساتھ اوپر۔ دو دن کا سفر ہے اور اس سفر کے دوران آپ کے اوپر جو چٹانیں ہوں گی وہ اتنی قریب ہوں گی کہ آپس میں ملتی ہوئی دکھائی دیں گی۔ پھر ایک چراگاہ آئے گی جو گندوگور اور مشاہیرم کے قریب ایک سے ہزار گنا زیادہ خوبصورت ہے۔ چراگاہ کے اوپر ایک چوٹی ہے جہاں سے کے ٹو اور مشاہیرم دکھائی دیتی ہیں اور میں نے بقلم خود اس چوٹی کو اپنے نام پر ”اقبال ٹاپ“ کا نام دیا ہے۔ چلیں گے؟“

”نہیں۔ میں نے اس سے بیشتر مشاہیرم کو ترک کر کے گندوگور کا ارادہ کیا ہے۔ اب میرے پروگرام میں مزید تبدیلی نہیں ہو سکتی۔“

”تو پھر میرا یہ کارڈ رکھ لیجیے، اگر کبھی موڈ بنے تو میں آپ کو لے کر جاؤں گا۔“

کارڈ پر لکھا تھا ”اقبال قادری۔ ماؤنٹین گائیڈ اور باورچی۔ وائس چیئرمین یونین کونسل مچلو۔ گاؤں کاندے۔ ڈاکخانہ تھامس۔ تحصیل مشاہیرم۔ ضلع گھانچہ۔ سکرو، بلتستان۔ پاکستان۔“

”اور صاحب آپ نے اگر ہوشے سے گندوگور جانا ہے تو آپ کو پورٹر رکارہوں گے، وہ کہاں سے لیں گے؟“

”ہوشے سے۔“

”کاندے گاؤں۔ جسے سیلاب بہا لے گیا۔ ٹوٹا ہوا ٹیل۔“

اور پھر یکدم کاندے آ گیا۔

ایک مختصر سا گاؤں۔ چند گھر۔ ایک ہوٹل کا سائن بورڈ اور جیپ کھڑی ہوئی۔

آگے پتھروں کی دنیا کا ایک انبار تھا اور اس میں کہیں وہ نالہ وہ دریا بہتا تھا جس پر کوئی شہر تھا۔ شاید دو شہر تھے جو ٹیل تھے۔ جن پر سے گزر کر پار جاتے تھے۔ لیکن یہاں سے جہاں ہماری جیپ رکی تھی، نہ کسی دریا کی آواز آتی تھی اور نہ کوئی شہری ٹیل دکھائی دیتا تھا۔

جیپ کھڑی ہوئی تو اہل کاندے ہمارے گرد جھوم ہو گئے۔ اتنے زیادہ ہو گئے کہ میرے ساتھی ان میں گم ہو گئے۔ نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز۔ کاندے کی آبادی۔ وہ جتنی بھی تھی ہم پر یلغار کرتی تھی۔ ہمیں ملاحظہ کرتی تھی اور قدرے حیران ہوتی تھی کہ یہ کالا لوگ ادھر کیسے آ گیا ہے۔ ادھر تو گورا لوگ آتا تھا۔ سبھی لوگ تقریباً ایک آواز ہو کر ہمیں طرح طرح کے مشورے دے رہے تھے، سوال کر رہے تھے۔ دوایاں مانگ رہے تھے یا پورٹر کے طور پر ساتھ چلنے کو کہہ رہے تھے۔ رات گزارنے کے لیے دو عدد ہوٹلوں کی موجودگی کی اطلاع بھی فراہم کر دی گئی۔

ڈینڈی ہنزہ برادران ہم سے پہلے پہنچ چکے تھے اور پتھروں کے انبار کے آگے جا کر نالے اور ٹیل کا جائزہ لے کر واپس آ رہے تھے۔

انہوں نے مجھ سے کچھ کلام نہ کیا لیکن میں نے آگے بڑھ کر ان سے کلام کیا۔ ”یہ فرمائیے کہ آگے نالے پر جو ٹیل ہے، اس پر سے گزرا جاسکتا ہے؟“

چکلی کمر والے گائیڈ نے ذرا مزید چک کر نہایت غیر ملکی لہجے میں انگریزی میں جواب دیا۔ ”ہل تو نہیں ہے۔ دو شہر رکھے ہوئے ہیں نالے کے اوپر اور وہ اس بوچھاڑ سے گیلے اور

معلومات ایک اور سکول ٹیچر سخاوت حسین جہانگیر کی فراہم کردہ ہیں۔
ہم نے اقبال کی معرفت اپنا سامان پل کے پار لے جانے کا ڈیل تین سو روپے میں کیا۔
یہاں سے جہاں ہم نے حسین یا یوسف کی جیب چھوڑی تھی یہاں سے کاندے کا نالہ
دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ آگے پتھروں کی ایک دنیا تھی۔ اور اس کے اندر سے ایک آبی شورا بھرتا تھا
اور ہم آہستہ آہستہ چلتے اس کے قریب ہو رہے تھے۔ سامان پار لے جانے والے پورٹر اچھل
اچھل کر پتھروں کو ناپتے ہمارے آس پاس مڑوں کی طرح اچھلتے جا رہے تھے۔
اوپر کہیں بلند پہاڑوں سے کاندے کے سیلاب کے دوران جو ہزاروں بڑے بڑے
پتھر آئے تھے، ہم ان میں راستہ بناتے نالے کے قریب ہوئے۔

اور اس نالے پر دوپٹل تھا۔

اور کیا پٹل تھا۔

دو شہتروں والا ایک پاکھندی پل۔ اور واقعی شہتیر پانی کی بوچھاڑ سے اتنے بھگکے
تھے کہ ان پر بوٹوں کا ٹھہرنا محال لگتا تھا۔ اور شہتروں کے نیچے جو نالہ تھا بلکہ پر نالہ تھا اس میں بھی
پتھر لڑھکتے تھے اور اس میں جو گر گیا، وہ گیا۔ نیچے دریائے شیوک میں یا دریائے ہوشے میں اور
پتھروں کے پائوں میں پستا گیا۔ گیا ہی گیا۔

میں نے فوری طور پر بہادری اور جرأت کے جو چند ذرے مجھ میں تھے، انہیں سات
سلام کئے اور بنا سہارے اس پر قدم رکھنے سے انکار کر دیا۔

ایک نوجوان پورٹر جوان دو شہتروں پر سرکس کے بازی گروں کی طرح کرتب دکھا رہا
تھا، وہ آیا اور ہاتھ آگے کر دیا۔

اُس کے سہارے کے باوجود یہ ایک ٹانگوں کے ٹکڑے میں کھلبلی بچا دینے والی
کراسنگ تھی۔ اگلا قدم اٹھانے کے لیے شہتروں کو دیکھتے تھے تو نظران کے نیچے پاؤں لگتے
کے منہ سے نکلنے والی جھاگ پر چلی جاتی تھی جو کاندے نالے کے پانی تھے۔ سامنے دیکھتے تو
بھسلے کا خدشہ ہوتا تھا۔

اس ”پل“ کے پار ہو کر پھر پتھروں کی ایک دنیا تھی جس میں راہ بناتے ہم آگے ہوئے
تو آگے درختوں کے ایک جھنڈ میں چند چیتوں کی کھڑی تھیں۔

”ہوشے میں تو گندم اور جو کی کٹائی ہو رہی ہے۔ لوگ گھاس جمع کر رہے ہیں وہاں
سے تو آپ کو ایک پورٹر بھی نہیں ملے گا۔ یہاں کاندے سے لے کر جائیں۔ یوں بھی ہوشے والے
اچھے لوگ نہیں نکلتے ہیں۔ ہم اچھے لوگ ہیں بالکل تنگ نہیں کرتے۔“

اقبال نے اتنا کہا اور ہمارے گرد جو ہجوم تھا، وہ اقبال کے اسی اتنا کہنے کا منظر تھا کہ
پورٹر یہاں کاندے سے لے کر جائیں۔ جوانوں، بچوں، بوڑھوں نے مجھے زبردستی اپنے شناختی
کارڈوں کی فوٹو سٹیٹ کا پیاں تھمائی شروع کر دیں۔ شمال میں شناختی کارڈ کی کاپی ایک گارنٹی ہے
کہ یہ شخص جینوئن ہے اور مقامی ہے۔

”مجھے تو کوئی اعتراض نہیں لیکن یہاں سے پورٹر لے جاؤں تو کہیں ہوشے والے فساد
نہ کر دیں کہ کاندے سے پورٹر کیوں لائے ہو۔ یہاں سے کیوں نہیں لیے۔“

شمال میں یہ تماشا بھی اکثر ہوتا رہتا ہے۔

نا تجربہ کار کوہ پیما۔ کنکور ڈیا جانے کے لیے سکر دو سے پورٹر لے لیتے ہیں تو راستے میں
شکر والے دنگا کر دیتے ہیں کہ پورٹر ہمارے ہوں گے۔ شکر سے پورٹر لیں تو اسکو لے میں ہنگامہ
برپا ہو جاتا ہے۔

”نہیں صاحب میں گارنٹی دیتا ہوں کہ ہوشے والے اعتراض نہیں کریں گے۔“
”تو پھر میں یہاں سے چار پورٹر لیتا ہوں۔ اگر ہوشے میں پر اہلم ہوا تو واپس کر
دیں گے۔“

”پراہلم نہیں ہوگا۔ یہ میرا چاچا ہے اسے ضرور لے کر جاؤ۔ بہت اچھا چاچا ہے۔“

یہ چاچا بے دانت کا بوڑھا چاچا۔ میں ساتھ لے گیا۔

کاندے گاؤں میں ایک سو تیس گھرانے ہیں اور آبادی صرف آٹھ سو تیس افراد پر
مشتمل ہے۔ 1997ء اور پھر 2000ء میں ایک تباہ کن سیلاب نے تقریباً پورے گاؤں کو برباد کر
دیا۔ نالے کا پل بہہ گیا اور لوگوں نے یہاں سے دور کینڈاس ٹھنگ میں ایک بستی آبادی کر لی۔ وہی
بستی جہاں پانی نہیں ہے۔ پانی حاصل کرنے کے لیے گاؤں کی خواتین ایک گھنٹہ سفر کر کے نیچے
دریا تک پہنچتی ہیں جس کا پانی بے حد گدلا ہے اور مختلف بیماریوں کا باعث بنتا ہے۔ نورست ان
لوگوں کی آمدنی کا ایک ذریعہ تھے لیکن اب وہ نئے گھر بنانے اور پانی کے حصول میں اتنے مصروف
ہو گئے ہیں کہ سیاحوں کے ہمراہ پہاڑوں میں نہیں جاسکتے اور اسی لیے مقروض ہو چکے ہیں۔ یہ

کہ اپنے زور پر چلتی۔ فی پھیرا بارہ سو روپے چارج کرتا تھا۔ اتنے پھیرے لگاتا تھا کہ اس کی روزانہ آمدنی کا حساب اگر ڈالروں میں بھی لگایا جائے تو بھی قابل رشک تھی۔ البتہ جیب کے پچھلے حصوں میں سے احتجاج کی دہی دہی آوازیں آرہی تھیں۔ اس لیے کہ وہاں متعدد پورٹروں کے علاوہ وہ ہنزہ گائیڈ بڈی پچھ لوگ بھی فکس ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہمارے سامان کے علاوہ وہاں پانچ کنستریسے تھے جن کی موجودگی بہت جگہ گھیرے میرے ساتھیوں کی ٹانگوں کو اجیرن کر رہی تھی کہ وہ ان میں پھنسے ہوئے تھے۔

”حوالدار صاحب.. ان کنستروں کو تو اتار دیجیے۔ میرے ساتھی نہ بیٹھ سکتے ہیں نہ کھڑے ہو سکتے ہیں۔“

”صاحب انہیں بولو کہ تھوڑا گزارہ کر لو۔ آگے کینداس کے علاقے میں کاندے کے سیلاب میں تباہ ہونے والے لوگ گھر بنائے بیٹھے ہیں اور ادھر پانی نہیں ہے۔ میں یہاں سے ہر پھیرے میں اُن کے لیے پانی کے کنستریسے لے جاتا ہوں۔ تھوڑا تکلیف ہوگا لیکن ان کے پاس پینے کو بھی پانی نہیں ہوتا۔“

یہ علاقے امداد باہمی کی بے مثال مثال ہیں۔

ایک جیب ڈرائیور اپنا فرض سمجھتا ہے کہ اگر چند کلو میٹر دور لوگ پیاسے بیٹھے ہیں تو وہ ان کے لیے پانی لے کر جائے۔ اس طرح راستے میں کھیتوں میں کام کرنے والے لوگ جیب دیکھ کر روڈ پر آتے اور حوالدار کی جانب پلاسٹک کی بوتلیں اُچھالتے جو وہ ایک ہاتھ سے کھینچ کر لے جاتا۔

”صاحب یہ کاندے کے لوگ ہیں۔ گھروں سے دور کھیتوں میں کٹائی کرتے ہیں تو مجھے اپنا بوتل دیتے ہیں۔ میں ادھر آگے جا کر ان کے گھروں میں سے چائے بنا کر لاتا ہوں اور واپسی پر اسی طرح ان کی بوتلیں کھیتوں میں پھینک دیتا ہوں۔“

درخت اور جھاڑیاں کم ہو گئیں۔ راستہ بے حد گرد آلود ہو گیا۔ یہاں ایک مدت سے بارش نہیں ہوئی تھی۔

پھر بائیں جانب بڑی بڑی چٹانوں کے ایک نہایت ہی خشک اور صحرائی سلسلے میں کچھ پتھر لیے گھر نظر آئے۔ وہ نئے تھے کہ جن پتھروں سے وہ تعمیر ہوئے تھے، ان پر تیشے کی تازگی کی سفیدی تھی۔ کچھ تو چٹانوں کی کوکھ میں سے جنم لے رہے تھے اور باقی دیرانے میں بکھرے ہوئے تھے، انہی چٹانوں کو توڑ توڑ کر ان کے پتھروں سے یہ آماجگاہیں تعمیر کی گئی تھیں۔ چنانچہ کئی چٹانیں

”مولا جٹ کی جیب میں.. کینداس کا چٹانی گاؤں“

ایک ریٹائرڈ حوالدار کی نہایت ہی ریٹائرڈ جیب تھی جو ہمیں ہوشے تک لے جا رہی تھی۔ جیب میں ہمارا سامان اور کاندے کے وہ پورٹروں جنہیں ہم نے ہار کیا تھا، لوڈ ہو رہے تھے تو عام میرے پاس آیا۔ ”ٹائرڈ صاحب وہ دونوں ہنزہ گائیڈ.. درخواست کر رہے ہیں کہ ہمیں اپنی جیب میں ہوشے تک لے جائیں۔ اُن میں سے ایک اکرام بیگ کا کزن ہے۔“

یہ کیسا حسین اتفاق تھا کہ وہ دونوں نوجوان اب تک سر پھرے اور متکبر رہے تھے۔ ہم سے بات کرنا بھی مناسب نہ سمجھتے تھے اور اب اکرام بیگ کے عزیز ہوئے جاتے تھے۔ دیے تو آدھا ہنزہ بیگ کا کزن ہے لیکن میں جانتا تھا کہ وہ اپنی ذاتی جیب کاندے میں چھوڑنے کے بعد یہاں سے ہوشے تک ایک جیب ہار کر کے اپنی جیب ہلکی نہیں کرنا چاہتے تھے اور ایک فری رائیڈ کے متمنی تھے۔

شمال کی جیب کی ایک باکمال خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ایک چھوٹے موٹے گاؤں کا کل سامان اور بیشتر باشندے آسانی سے سما جاتے ہیں۔ اگر ڈرائیور کی مرضی ہو تو۔

”دے آرویکم۔“

کاندے سے ہوشے تک ایک گھنٹے کی مسافت بتائی جاتی تھی۔

جیب سنارٹ ہوئی تو میں پرسکون ہو گیا۔ مجھے شدید خدشہ تھا کہ شاید ہمیں کاندے میں ہی رکنا پڑے۔ لیکن اب ہم ہوشے کو جاتے تھے، اس لیے میں پرسکون ہو گیا۔

حوالدار ادھر کا نہیں نیچے سیلنگ کا رہنے والا تھا۔ ادھر ایک خیمے میں فروکش تھا۔ کاندے اور ہوشے کے درمیان اپنی شخصیت کے زور پر جیب چلاتا تھا اور نہ اس کی جیب میں اتنا دم خم نہ تھا

بٹھایا تاکہ واپسی پر میں اسے دیکھوں اور زندگی بھر بھول نہ پاؤں۔ اس کا نقش ہمیشہ کے لیے ثبت ہو جائے۔

”حوالدار صاحب! ادھر ہوشے کے راستے میں ہمارے دوست چنگیزی کی جیب ایک حادثے کا شکار ہوئی تھی۔ کسی گہری کھد میں گر گئی تھی۔ چنگیزی کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی اور اس کے ہمراہ جو جاپانی کوہ نور تھی، وہ ہلاک ہو گئی تھی تو آپ جانتے ہو کہ ان کی جیب کہاں گری تھی؟“

”یہ کس برس کی بات کرتے ہو صاحب؟“

”تقریباً تین برس پہلے کی۔“

”تب تو میں ادھر نہیں تھا۔“

”کدھر تھا؟“

”آپ کے پنجاب میں تعینات تھا۔ آہو۔ میں تو آدھا پنجابی ہو چکا ہوں۔ کی حال اے سوہنیو۔ نواں آیاں ایں سوہنیاں!“

اگر یہ بلی حوالدار مصطفیٰ قریشی کے ”مولا جٹ“ کے ڈائلاگ اتنے ضمیمہ لہجے میں بول سکتا تھا تو پنجابی میں اس کی قادر الکلامی میں کوئی شک نہ تھا۔ مجھے کچھ غفلت سی ہوئی کیونکہ دوران سفر میں نے اس کے تن و توش کے بارے میں اپنے ساتھیوں کو مخطوط کرنے کی خاطر پنجابی میں کچھ فقرے کہے تھے۔ جو ظاہر ہے اس تک پہنچے تھے لیکن وہ چپ رہا تھا۔

”بڑا چنگا حال اے سوہنیو۔“ میں نے ہنس کر شرمندگی میں ہنس کر جواب دیا۔

”آپ ادھر پہلی بار آئے ہو؟“

”نہیں۔ میں دس برس پیشتر اپنے بال بچوں کے ہمراہ ایک ڈے ٹرپ پر ہوشے آیا تھا۔“

”تو ہوشے تب کیسا تھا؟“

”چند ایک گھر تھے۔ کچے کوٹھڑی نما گھر تھے۔ ہزاروں برس سے جو کوہستانی تنہائی اور آزدگی تھی اس میں گم شدہ چند گھر تھے۔ بیشتر خواتین کے چہرے دھوئیں سے سیاہ ہو چکے تھے۔ ان کی مینڈھیاں جو شانہ بچپن میں گوندھی گئی تھیں، پھر نہیں کھلی تھیں۔ اور جو بھاری ادنی لبادے انہوں نے پہنے ہوئے تھے، وہ بھی برسوں سے پہنے ہوئے تھے، بچوں کے سر اُسترے سے اس طور موٹے تھے کہ درمیان میں صرف سادھو لوگوں کی مانند ایک لٹ لٹتی تھی جو شانہ ان زمانوں کا فیشن تھا۔ بوڑھے اپنی سفید ادنی ٹوپوں میں ایک چرٹری کے گرد اسے گھماتے ہوئے

ایسی تھیں جو کئی پھٹی اور بدن دریدہ تھیں۔ ایک نیا سکول بھی اس ویرانے میں نمایاں تھا۔ یہی کینڈاس تھیں جو ایک دشت تھا جہاں پانی کی ایک بوند نہ تھی۔ نہ کوئی چشمہ تھا اور نہ کوئی ندی نالہ۔ ہوشے دریا نیچے ایک گھنے کی مسافت پر واقع تھا اور اس کے پانی بھی پینے کے لائق نہ تھے۔

”ان لوگوں نے اس ویرانے میں گھر کیوں بنائے۔ راستے میں کئی ہرے بھرے میدان تھے جہاں پانی تھا۔“

”صاحب! ادھر کاشت کا زمین کم ہے۔ اگر کھیتوں میں گھر بنالیتے تو زمین کم ہو جاتا۔ کھاتے کہاں سے۔“

حوالدار نے کینڈاس کے گاؤں کے قریب جیب زدگی۔ پچھلے حصے میں پڑے پانی کے کنستراٹھا کر روڈ کے کنارے رکھے اور پھر جیب سٹارٹ کر دی۔

ان گھروں میں سے چند افراد نکلے۔ کچھ بچے روڈ کی جانب بھاگنے لگے۔ ایک بوڑھی عورت جو پتھر توڑ رہی تھی، اپنی سنگ پاشی کو ترک کر کے ہتھوڑی کچینک کر چادر سنبھالتی ادھر کو آئے گی۔

ہماری جیب بہت آگے نکل چکی تھی جب میں نے عقبی آئینے میں دیکھا کہ وہ لوگ۔۔۔ بچے اور وہ بوڑھی عورت خوشی خوشی کنستراٹھا رہے ہیں اور اپنے پیاسے گاؤں کو لے جاتے ہیں۔ اور ہاں اس لمحے میں نے کاندے کے بے گھر لوگوں کی اس نئی چٹائی بستی میں بلند ہوتی اس چٹان کو نہ دیکھا جو نئے گھروں میں سے نکل کر آسمانوں سے ہم کلام ہوتی تھی۔ آسمان کے رخساروں پر بوسہ دینے کے لیے بلند ہوتی تھی اور جس پر ایک سرخ جوڑے میں ملبوس لڑکی ایک جل پری کی مانند ناگلیں سیٹے براہمان تھی۔ جو میرے ذہن پر۔۔۔ میری یادداشت پر ایک مہر کی طرح۔۔۔ ایک سادہ دھات پر ثبت ہو جانے والی مہر کی طرح جو اسے عام دھات سے بلند کرتی اسے بدل کر ایک سکہ بنا دیتی ہے۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دوام بخش دیتی ہے۔ بھوری آنکھوں کا سلسلہ بے شک خاک در خاک ہو جائے لیکن وہ مہر قائم رہتی ہے۔ لیکن میں نے نہ اس چٹان کو دیکھا اور نہ اس جل پری کو۔ کہ میں نے یہ منظر اپنی واپسی پر اسی حوالدار کی جیب کی کھڑکی میں سے دیکھا تھا۔

شانہ ابھی وہ چٹان یہاں موجود ہی نہ تھی۔ اس کا ظہور نہ ہوا تھا۔ جتنی مدت میں نے ہوشے سے آگے کہیں بلند پہاڑیوں میں بسر کی اس دوران یہ چٹان زمین میں سے ایک بوٹے کی مانند پھوٹی۔ ابھرتی گئی۔ اور اپنی زیبائش کے لیے ایک سرخ لباس والی لڑکی کو اپنی چوٹی پر

اون لپٹتے تھے۔ ایک ہوٹل اور ایک مشاہیرم شاپ تھی۔ اور ہوشے والے ہمیں دیکھ کر سراسیمہ ہو گئے تھے اور ”انگریز۔ انگریز“ کہتے گھروں میں گھس گئے تھے اور میری بیگم نے بے حد برا مناتے ہوئے ان کا پیچھا کر کے انہیں جا پکڑا تھا اور کہا تھا۔ ہم موئے انگریز نہیں ہیں۔ پاکستانی ہیں اور مسلمان ہیں۔ لا الہ۔ اور خبردار جو ہمیں گندے ناکٹ پیپر سے اپنے آپ کو پونچھنے والے انگریز کہا۔ تو پھر وہ سب دوست ہو گئے اور ہمارے قریب آ گئے۔ یہ ہوشے تھا۔

”اب وہ ہوشے نہیں رہا۔“ حوالدار نے منہ میں رکھی اُس کے گالوں کو ابھارتی کسی شے کی چگالی کرتے ہوئے کہا۔ ”اب تو کے ٹو کی جانب سے دنیا جہان کا نور سٹ ہوشے میں اترتا ہے لیکن صاحب۔ ہوشے والا اب بھی نہاتا نہیں۔ پانی کو اپنا دشمن سمجھتا ہے، گندارتا ہے۔“

”ویسے تو ہماری ایک محسن میم صاحبہ ازاٹیل شاہ بھی یہی کہتی ہیں کہ ہوشے کے لوگ پورے شمال میں سب سے گندے ہیں لیکن۔ حوالدار صاحب آپ یہ بھی تو دیکھئے کہ وہ ہزاروں برس اس بلند تنہائی میں دنیا جہان سے کٹے رہے۔ سال بھر میں صرف ایک فصل ہوتی ہے اور اگر سردی شروع ہو جائے تو وہ بھی پکتی نہیں۔ پھلدار درخت بھی پھلتے نہیں۔ گندم، جو، شائع اور منر کے چند بوٹے اور بس۔ انہوں نے شدید برفباری اور بھوک کی آفتیں جھیلیں۔ ان کے پاس تو موسم سرما گزارنے کے لیے کافی لکڑی بھی نہیں تھی اور اس کے باوجود انہوں نے اپنی وادی کو نہیں چھوڑا۔ اگر گندے رہتے ہیں تو اپنے گھر میں رہتے ہیں۔“

حوالدار دل کھول کر اور جڑ اکھول کر ہنسا اور اپنا پورا بوجھ سٹیئرنگ پر ڈال کر جیپ کو دائیں جانب موڑ دیا۔ ”آپ تو ہوشے والوں کے طرف دار ہو گئے ہو۔“

”میں ان لوگوں کا طرفدار ہوں جو بھوک اور افلاس سہتے ہیں اور اپنے گھر نہیں چھوڑتے۔“ حوالدار میری اس گفتگو سے بور ہو گیا اور درمیان میں بیٹھے حسن سے مخاطب ہو گیا۔ ”آپ ادھر لاہور میں کیا کرتے ہو؟“

”بس جی۔“ حسن صاحب حسب معمول ڈراثر مان گئے۔ ”میں ایک بینک افسر ہوں۔“

”چھوڑا سا۔“

”کتابال بچہ ہے؟“

”دو بیٹے ہیں ماشاء اللہ۔“

”اوئے سوہنے۔“ حوالدار پھر سے ہنسنے لگا۔ ”صرف دو۔ میرے پانچ بچے ہیں اور ابھی

مزید آ رہا ہے۔ تو یاد دو تو بہت کم ہے اور پیدا کرو۔“

”وہ جی حوالدار صاحب۔“ حسن صاحب کو تو اللہ شرمائے کا موقع دے اور یہ کیا موقع تھا۔ ”وہ۔۔۔ بیگم نہیں مانتی۔“

”اچھا۔“ حوالدار نے مخدوش نظروں سے حسن کو دیکھا۔ ”تو آپ بیگم کو پوچھ کر بچہ پیدا کرتا ہے۔ ہم تو نہیں پوچھتا۔“

”ہور کی حال اے حوالدار جی۔“ میں نے فوری طور پر موضوع کی پٹری بدلنے کی کوشش کی۔ ”ہوشے کنساں دور اے؟“

”زیادہ دور نہیں سوہنے۔“

شام۔ رات کی تاریکی کی دہلیز پر کھڑی پل دو پل کی مہمان تھی۔ ابھی ہیڈ لائٹس جلانے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ جب ہم ذرا نیچے ہوئے۔ چٹانوں کی اوٹ میں چلے گئے اور نیچے ایک گہرائی میں ایک پل تھا۔

اور پھر مجھے بھی یاد آ گیا۔ یادداشت کی سکرین پر ایک فلم چل گئی۔ ہوشے کے عین نیچے ایک پل تھا جسے پار کر کے ایک زبردست چڑھائی آتی تھی اور پھر ہوشے آ جاتا تھا۔

”اس پل کے اوپر ہوشے ہے صاحب۔ یہاں تک کاندے والوں کا زمین ہے اور اس پل کے پار ہوشے والوں کا علاقہ ہے۔“ اس نے پل کے دوسری جانب جا کر پتھل گیر لگایا اور جیپ زبردست احتجاج کرتی۔ ہونکتی رکتی پھر سے دھچکے کھاتی چڑھائی پر چڑھنے لگی۔

اور اوپر جب جیپ کی ناک سیدھی ہوئی۔ ہم جو چڑھائی کی وجہ سے پیچھے گرے تھے، ہموار ہوئے تو ہوشے آ گیا۔

میں لا پرواہ تھیں..

ذرا سامنے ایک اور پھانک تھا.. جہاں کیمپنگ ٹبر دو تھی اور یہ اشرف کیمپ تھی اور وہاں گھاس نہ تھی اور کچھ گھسی گھسی سی بھی تھی لیکن سوائے ایک چھوٹے سے خیمے کے بالکل خالی تھی.. دیوار کے ساتھ ساتھ جو پائپر کے درخت اونچے ہوتے تھے، ان کے نیچے سورج کبھی کے چند پھول تھے..

ہوشے کی رات میں ہمارے خیمے سر اٹھانے لگے..

اشرف کی خیمہ گاہ کے کچن میں کچوان پکے لگے..

خیموں اور خوراک کے بندوبست میں کاندے سے آئے ہوئے پورٹر نہایت ٹھہرتیلے ہو رہے تھے کیونکہ وہ چار کی بجائے شاید چھ سات آگئے تھے اور اگلی صبح کو جب پورٹروں کا چناؤ ہونا تھا اس میں سے پنے جانے کے لیے ٹھہرتیلے ہو رہے تھے.. ان میں کچھ ہوشے کے بھی پورٹر تھے جو ہم میں گھل مل گئے تھے.. ان میں ایک حسین نامی شخص بھی تھا جو پورٹر ہونے کے علاوہ ماہر باورچی ہونے کا بھی دعویٰ کرتا تھا اور لاہور کے کچھ ریستورانوں میں کام کرنے کا حوالہ بار بار دیتا تھا.. اور بہت فرمانبردار اور مسکین شکل کا تھا اور ہم نے فیصلہ کر لیا کہ اس بے چارے کو تو ضرور ساتھ لے کر جائیں گے.. چاہے ہم انورڈ کر سکیں یا نہیں.. اور پھر جب ہم اسے ساتھ لے گئے تو فریک کے دوران ایسا عالم اور طوطا چشم ہوا کہ ہم سب بے چارے اور مسکین ہو گئے..

میں اس بار اپنا جو کم نصابی سا خیمہ ساتھ نہیں لایا تھا اور سلمان کے آسٹریلوی خیمے کے ایک گوشے میں حسن صاحب کی رفاقت میں اپنے سلسپنگ بیگ میں نہایت پرسکون استراحت فرما رہا تھا..

بقیہ ساتھی بھی اپنے اپنے خیموں میں کچھ نہ کچھ فرما رہے تھے..

اور باہر ہوشے کی رات تھی.. مشاہیرم سے اترتی رات تھی..

کچھ دیر استراحت فرمانے کے بعد میں اس خیمہ گاہ کے کچے اور کھستانی ماحول والے ڈائننگ روم میں جا بیٹھا.. گیس کی دودھیا روشنی اور کچھ انجانے چہروں میں جا بیٹھا.. کچی دیواروں پر بطور آرائش کوہ پیماؤں کی تصویریں اور کارڈ چسپاں تھے اور کسی کیلنڈر سے مستعار لیے ہوئے جاپانی دو شیزاؤں کے تقریباً ہوشربا پونڈ تھے.. تقریباً اس لیے کہ جاپانی اور چینی دو شیزاؤں کو شیش ہسار کے باوجود اپنی بدنی حالتوں کو براہ کشتی کے اس مقام پر نہیں لے جاسکتیں جسے مکمل طور پر ہوش رہا کہا

”ہوشے کی گلیوں میں اُنڈلس کے اجنبی“

شام کے بعد.. رات کی قربت میں ہم ہوشے میں داخل ہوئے..

یہ تو اب باقاعدہ ایک گاؤں تھا..

چند گھر نہیں.. گلیاں تھیں اور کچے نہیں کچے گھر تھے.. اور رونق تھی..

ہمیں بتایا گیا تھا کہ ہوشے میں اب تین خیمہ گاہیں تھیں اور ان میں کوئی حمزہ کیمپنگ یا لپلے پیک کیمپنگ بہترین تھی..

ہم اس کیمپنگ کے پھانک کے باہر کے تو اس کے اندر غیر ملکی سیاحوں کے اتنے خیمے تھے.. کہ وہ اہل کر ہوشے کی گلیوں میں آ رہے تھے..

اور یہ کیمپنگ سائٹ اگرچہ بہت مختصر تھی لیکن یہ سوئزر لینڈ کی جھیل لوگا نو کے کناروں پر ایک کیمپنگ سائٹ ہو سکتی تھی کہ اس کے اندر تمام تر خیمے اور چہرے اجنبی سر زمینوں کے تھے اور میں جب لوگا نو کی اس وسیع خیمہ گاہ کے گیٹ میں سے داخل ہو کر اندر گیا تھا تو استقبالیہ ٹھکرک نے میرے پوچھنے سے پہلے ہزاری سے کہہ دیا تھا.. ”کوئی جگہ نہیں.. سائٹ فل ہے..“

”میں تنہا ہوں اور میرا خیمہ بھی بہت چھوٹا سا ہے..“

”ایک چھوٹے سے خیمے کے لیے بھی جگہ تو چاہیے.. جو نہیں ہے.. سو رہی..“

اور یہاں ہوشے میں بھی بالکل یہی صورت حال تھی.. اور آج صرف میرا چھوٹا سا خیمہ ہی نہیں تھا بلکہ میرے چھ ساتھیوں کے بھی خیمے تھے.. اور جگہ نہیں تھی..

ویسے ہم نے بہت ہی ندیدے پن سے اس کیمپنگ کے اندر جھانکا کیونکہ اندر ماحول سراسر مغربی تھا اور کوہ نور دھوا تین پہاڑوں سے اترنے کے باوجود ابھی تک اپنے لباس کے بارے

ان دونوں نے البتہ میرا کارڈ گم نہیں کیا تھا اور ایک برس بعد انہوں نے مجھے اپنے پہلے بچے کی پیدائش کی خوش خبری بھیجی۔

ویسے پاکستانی شمال میں اس بار ایک عجیب تبدیلی سامنے آئی۔ اس کے پہاڑوں اور گلیشیرز میں بھٹکتے جتنے کوہ نور دئے، ان میں سے بیشتر کا تعلق ہسپانیہ سے تھا۔

کھانے میں کیا تھا یہ کچھ یاد نہیں لیکن حسین کی تیار کردہ وہ سلا دیاد ہے جو نہایت نچی ہوئی اور خوش نظر تھی۔

کھانے کے بعد ہم سب ہوشے کی گلیوں میں نکل گئے۔ دیواروں کو ٹوٹتے۔ اندھیرے میں احتیاط سے قدم رکھتے گلیوں میں نکل گئے۔ تاریک

رات کے سائے میں ناچناکی میں ان میں گھومتے رہے۔ یہ ایسی گلیاں نہ تھیں جن میں انسان گم ہو جائے۔ کہ وہ دو چار ہی تو تھیں۔ ہر گلی کے بعد ایک اترائی آتی اور کھیت شروع ہو جاتے۔ گندم کے بوٹوں کا سنہری پن تاریکی میں بھی دکھائی دیتا تھا۔

لیکن یوں بے مقصد بھٹکنے میں بھی ایک عجیب سستی تھی۔ اس لیے کہ ہم 7821 میٹر بلند مشاہیرم کی چوٹی کے دامن میں ہوشے میں تھے۔ اور اگر اس چوٹی کا حساب کتاب کیا جائے تو یہ دنیا میں چوبیسویں بلند ترین چوٹی تھی۔ یہ امر کی کوہ پیما تھے جنہوں نے پہلی بار 1960ء میں اس پر قدم رکھا۔

اور ہم نے مشاہیرم کو آج نہیں۔ دس برس پہلے بھی دیکھا تھا۔ یہاں سے نہیں۔ اس کے پار۔ دوسری جانب۔ کنکورڈیا کی جانب چلتے ہوئے جب ہم اردو کس سے نکلے تھے تو دائیں جانب برفوں کی ایک دنیا میں سے اٹھتی ہوئی اس دانت نما چوٹی کو دیکھا تھا۔ اور یہ حیرت ناک حد تک سوئٹزر لینڈ کی ماؤنٹ میٹر بارن سے مشابہ تھی۔ اگرچہ اس سے بلندی میں تقریباً دو گنی تھی اور اس کے گرد بادلوں کا ایک سفید گھیرا تھا۔ ہم اس کے برابر میں چلتے تھے اور اس کی شکل اور بلندی سے مرعوب چلتے تھے۔ اس کے دامن میں جو بہت ناک گلیشیر تھا، اس کے ڈر میں چلتے تھے۔

ایک برفانی عجائب گھر میں چلتے اسے دیکھتے جاتے تھے۔ اور تب نہیں جانتے تھے کہ اس چوٹی کے اندر ایک دژہ گندوگور نام کا ہے جسے عبور کر کے ہوشے پہنچا جاسکتا ہے۔ کوئی بھی

جاسکے۔ یہ رتبہ بلند صرف امریکی، ہندوستانی اور پاکستانی دو شیزاؤں کو ہی مل سکتا تھا۔

یہاں۔ اس ہوشے کے کچے گیس کی روشنی میں دو دھیا ہوتے ایک ہسپانوی جوڑے سے ملاقات ہوئی جو نہایت صاف ستھرے اور بے حد اہتمام سے لمبوس شدہ تھے۔ وہ بھی اب تازہ ترین فیشن کے مطابق اٹھکولے سے کنکورڈیا پہنچ کر۔ دژہ گندوگور عبور کر کے ہوشے پہنچے تھے۔ نہ صرف ان کا لباس ستھرا تھا بلکہ وہ خود بھی متاثر کن حد تک خوش شکل تھے۔

عامر انہیں دیکھ کر کہنے لگا۔ ”تارڑ صاحب نہ ان کے چروں پر کے ٹوئیس کیمرے کی ہاسٹ کا اثر نظر آتا ہے۔ نہ ان کی جلد اکھڑی ہوئی ہے اور نہ ہی ہونٹ اور ناک سو جے ہوئے ہیں۔ نہ ہی ایک طویل کوہ پیما کی اور خطرناک سفر کی کچھ تھکاوٹ ہے۔ اور ڈریس اپ بھی ایسے ہوئے ہیں جیسے ہیرس کی نائٹ کلب ”مولن روج“ میں ڈنر کرنے کے لیے جاتے ہوں تو انہیں پوچھئے کہ کیا واقعی یہ کے ٹوئیس کیمرے سے ہو کر ادھر پہنچے ہیں۔“

اور یہ حقیقت ہے کہ وہ ہسپانوی جوڑا ایک تروتازہ کھیرے کی مانند سرسبز اور ستھرا تھا۔ سورج کبھی کی مانند کھلا ہوا تھا۔

انہوں نے ڈائننگ روم کی چکی چھت پر۔ جہاں وہ ایک مخدوش سے زینے کی مدد سے پہنچے تھے۔ وہاں اپنا خیمہ نصب کر رکھا تھا تاکہ وہ ہوشے کے ”منظر“ کو انجائے کر سکیں اور ہم گہرائی میں۔ پاتال میں سفیدے کے درختوں تلے خیمہ زن تھے۔

میں نے انہیں متاثر کرنے کی خاطر اپنی کتاب ”اندلس میں اجنبی“ کا ذکر کیا تو وہ ضرورت سے زیادہ متاثر ہو گئے۔

”ہم تو پاکستان کو بھی نہیں جانتے تھے۔ صرف کے ٹو کو جانتے تھے اور یہ تو بالکل نہیں جانتے تھے کہ یہاں کوئی ایسا شخص ملے گا جس نے چین کے بارے میں ایک کتاب لکھی ہو۔“

انہیں کیا پتہ کہ ہسپانیہ ہم پاکستانیوں کے دلوں پر کہاں کہاں اثر کرتا ہے۔ بے شک بنیادی طور پر مورش چین اثر کرتا ہے۔ ہم ان کے قرطبہ، اشبیلیہ اور غرناطہ کو ان کی نسبت کہیں زیادہ عزیز رکھتے ہیں اور مزگ چوک کو اب قرطبہ چوک کہتے ہیں۔

وہ دونوں شاید میڈرڈ کے رہنے والے تھے اور ڈنکر تھے۔ شادی شدہ نہیں لگتے تھے ورنہ اتنے خوش نہ لگتے۔ اگلی صبح ان دونوں نے روانہ ہونے سے پیشتر میرے خیمے میں جھانکا اور اپنا کارڈ بڑھا کر مجھے میڈرڈ آنے کی دعوت دی۔ وہ کارڈ وہیں کہیں ہوشے میں ہی رہ گیا۔

نہیں.. یہاں تک کہ ہوشے والے بھی نہیں جانتے تھے اور وہ اسے ناقابل عبور سمجھتے تھے..

یہ درزہ دریافت ہوا تو ہوشے کی قسمت بدل گئی..

اس کی قسمت بدل گئی لیکن نہ نہانے کی عادت نہیں بدلی..

گئی رات ہم اشرف خیمہ گاہ میں لوٹے.. باہر ایک دکان کے کچے تھڑے پر چند

نوجوان گارہے تھے.. باتیں کر رہے تھے..

”کیسی باتیں کر رہے ہو؟“

”نوجوانی میں کیسی باتیں کرتے ہیں.. ہم لڑکیوں کی باتیں کرتے ہیں..“

ہم تھکاوٹ سے.. بلندی کے شمار میں یوں چور ہوئے کہ خیموں میں جاتے ہی بے سندھ

نیند میں اتر گئے..

کل سویر ہم نے گندوگور کی جانب سفر کرنا تھا..

گندوگور.. جو بقول میاں صاحب نہایت ہی فحش نام تھا..

”تخت لاہور کی گلیاں اور باقی رہ گئے... پانچ“

یہ ہوشے کی گلیاں نہ تھیں جن میں ہماری ویلن ٹریک کے شور میں.. چلتی جاتی تھی..

یہ تخت لاہور کی گلیاں تھیں..

ساجن کی وہ گلیاں تھیں جنہیں ہم چھوڑ گئے تھے.. اور اب واپس آئے تھے تو جی چاہتا تھا

کہ کاش ساجن ان بچھی ہوئی واپسات بوسیدہ اور گندی گلیوں میں نہ ہوتا.. ہوشے کی گلیوں میں ہوتا..

ساجن پر مینار پاکستان ایسے.. آنکھل نادور کی بھونڈی نقل ایسے سڑکچر کا سایہ نہ

ہوتا.. ہمارم کا سایہ ہوتا..

اور ہوشے کی گلیاں بھی ایسی تھیں کہ ان میں ساجن کے ساتھ گھومنے پر پولیس نکاح

نامہ طلب نہیں کرتی تھی.. وہاں پولیس ہوتی تو طلب کرتی..

البتہ ساجن کو لاہور سے ہوشے شفٹ کرنے میں بھی تو کچھ تکنیکی مسائل تھے..

ایک تو یہ کہ شہر لاہور کا عادی ساجن.. گھر سے باہر قدم رکھنے سے پیشتر میک اپ کی

پوری کسٹ ختم کر دینے والا اور ہونٹوں پر ڈبل شیڈ کی لپٹ سنک لگانے والا ساجن.. اقل تو لاہور

سے ہوشے جانے کے لیے راضی ہی نہیں ہوگا.. اور اگر بغرض محال رو میٹھک ہو کر چلا بھی جائے تو

چند روز میں بیزار ہو جائے گا کہ یہ کہاں آگئے ہم چمن سے نکل کر.. اور ایسی محبت سے ہم باز

آئے... وہ موسم سرما کی شدید برفباریوں میں.. ہوشے کی کسی کوٹھڑی میں آگ پر اپنا گورا چہرہ

سیکتا ساجن بہار کی آمد تک دھوکے سے کالا شاہ ہو چکا ہوگا.. اس کا حلیہ بگڑ چکا ہوگا.. وہ گورا رنگ

جس کی وجہ سے پورا پنڈ ویری ہو جاتا ہے.. وہ دھوکے کی کالک میں ایسے غائب ہوگا کہ ساجن کی

صرف آنکھیں دکھائی دے رہی ہوں گی جن کے کوئی ایکٹ لینز وہ لاہور میں بھول آیا ہوگا اور اب

چند ہیائی آنکھوں سے ہر سود کھتا ہوگا کہ.. کہاں آگئے ہم جن سے نکل کر..
چنانچہ ساجن کو لاہور کی گلیوں میں ہی رہنے دینا مناسب ہے..

میاں صاحب کو ڈراپ کرنے کے بعد ویگن اپنے سامنے ونڈ شیلڈ میں بادشاہی مسجد کے بے مثال گنبد و مینار اُتارتی.. شہر کے شور و غوغا میں بھیڑ کو چیرتی بھائی گیٹ سے نکل کر سول پیکر ٹریٹ سے دائیں جانب ہو کر کرشن نگر کی گلیوں میں آگئی.. وہ کرشن نگر جسے اب زبردستی اسلام پورہ کہا جاتا تھا..

زبردستی اس لیے کہ نام بدلنے سے بہتی کا مزاج اور اخلاق نہیں بدلتا..

یہ محض ایک پلاسٹک سرجری ہوتی ہے جس کے نیچے چہرہ وہی رہتا ہے..

اس حساب سے تو فوری طور پر شہر لاہور کا بھی نام بدل دینا چاہیے کہ یہ رام کے بیٹے ابو کے نام سے آباد ہوا تھا..

اس کا نام بھی لاکھ پور کے بجائے فیصل آباد میں بدلنے کی پاکیزہ روایت کی پیروی کرتے ہوئے کسی سعودی شہزادے کے نام پر.. بے شک پرنس فہد آباد رکھ دیا جائے تو کیا مضائقہ ہے.. ایک ایسا شہزادہ جو ایک سروے کے مطابق دنیا کے عیاش ترین لوگوں میں نہایت معتبر مقام پر ہے.. قصور بھی.. جو میرا سوہنا شہر قصور ہے.. رام کے بیٹے کا ہم نام ہے.. اسے بھی کسی اور شہزادے کے نام سے پکارا جائے تو کیا حرج ہے.. سعودی شہزادے تعداد میں اتنے کثیر ہیں کہ ہمارے شہر اور گاؤں ختم ہو جائیں گے، ان کی تعداد پھر بھی کم نہ ہوگی.. بے شک آپ مان سنگھ کے مانسہرہ.. ہری سنگھ ملوہ کے ہری پور.. ٹیک سنگھ کے ٹوبہ اور رشی گودھا کے سرگودھا کے نام بھی بدل دیں.. شہزادے پھر بھی سر پلس رہیں گے..

تو اس کرشن نگر.. اسلام پورہ کی ایک نہایت پرسکون اور زندگی بھری گلی میں.. جہاں ایک گھوڑا بندھا تھا اور کچھ گائیں آوارہ ہوتی تھیں.. وہاں حسن صاحب اُتر گئے..

اور کیسی بے تابی میں اُترے.. اپنے بچوں کے لیے اُداس.. بیگم کے لیے مرجھائے ہوئے.. اتنی بیتابی میں اُترے کہ ہمیں بھی بھول گئے یہاں تک کہ چلو کی خوبانیوں والی لڑکی کو بھی بھول گئے.. اتنی بے تابی سے جیسے لکا سے واپسی پر سینا کو رام ملتا ہے..
ویگن خالی ہوتی جاتی تھی..

اس کے اندر جو موسم ٹھہرے ہوئے تھے، وہ بھی رخصت ہوتے جاتے تھے.. اور شہر کی

کثافت آمیز دھواں بھری ہوا اس کے اندر ٹھہرے ہوئے موسموں پر غالب آتی جاتی تھی..
ہر ساتھی کے اُترنے کے ساتھ کچھ موسم بھی ویگن سے اُتر جاتے تھے..

ہم کہاں سے آئے تھے؟

تو کرشن نگر کی اس گلی میں جہاں ایک گھوڑا بندھا تھا اور کچھ گائیں آوارہ ہوتی تھیں اور حسن اُترے تھے یہ یقین نہ آتا تھا کہ ہم کہاں سے آئے تھے..

گئیں اور ہم نیچے کھیتوں میں اترنے لگے۔

ہمارے پورٹر جو خاصے دور چلے گئے تھے یہاں سے کھیتوں میں بھٹکتے ہوئے لگتے تھے۔
ہر سونہری راج تھا۔

اس کھلے سنہری پن میں کہیں کہیں ہریا دل ٹھہری ہوئی تھی۔

گندم پکنے کو تھی۔ اتنی نہیں پکی تھی کہ کاٹی جاسکے۔ اور کچھ گھیت ایسے تھے جن میں اس کے خوشے ابھی تک ہرے تھے۔

ہم کھیتوں کے درمیان میں ایک پگڈنڈی پر چلتے جاتے تھے۔ تازہ دم تھے اور چہلیں کر رہے تھے۔ بدلوں میں چلبلاہٹ تھی کہ وہ ابھی پسینے اور تھکاوٹ سے آشنا نہیں ہوئے تھے۔ خوش تھے کہ اس دنگن سے جان چھوٹی جو خیلو میں کھڑی تھی۔ جیپوں کی محتاجی کا اختتام ہوا۔ سب بیساکھیاں پیچھے رہ گئی تھیں اور اب ہم کسی بھی سہارے کے بغیر خود چلتے تھے، ایک پگڈنڈی پر جس پر ہم آج تک نہیں چلے تھے اور ایک پندرہ ہزار فٹ بلند درے کی جانب چلتے تھے۔ جو ہمارے لیے اتنا اجنبی تھا کہ ہم نے آج تک اس کی کوئی تصویر بھی نہیں دیکھی تھی۔

مخالف سمت سے کچھ پورٹر چلے آ رہے تھے۔

وہ تھکے ہوئے تھے۔ بوجھ تھے دے ہوئے تھے۔ یکدم انہوں نے اپنے بوجھ اُتارے اور پگڈنڈی کے برابر میں کھیتوں میں گھس گئے۔

کھیتوں میں کام کرنے والی خواتین نے بالکل ماسٹڈ نہ کیا کہ وہ گندم کو روند رہے ہیں اور اودھم مچا رہے ہیں بلکہ ان کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگیں کیونکہ وہ ہوشے کے تھے اور ان کے دور پار کے رشتے دار تھے۔

یہ پورٹر کھیتوں میں ٹھس کر گندم کے سنہری بُوٹوں کے بیچ کہیں کہیں نمودار ہونے والی مڑکی بیلوں کو تلاش کر رہے تھے۔ وہ اُن کی پھلیاں توڑتے اور انہیں کھول کر ان میں سے سبز دانے نکال کر منہ میں رکھتے اور خوش ہوتے تھے۔

وہ بس اتنی ذرا سی بات پر خوش ہوتے تھے۔

بلندی سے نیچے آنے والے یہ پورٹر۔ جانے کتنی طویل مسافتوں اور کتنے دنوں کے بعد نیچے آنے والے یہ پورٹر باسی روٹیاں، خشک پیاز اور نمین بند خوراکیں کھا کھا کر بیزار ہو چکے تھے اور ان کے تالو کسی تازگی کو ترستے تھے۔ تازہ کھیروں، ٹماڑوں اور پیاز کے لیے ترستے تھے اور یہاں

”وادی ہوشے۔ پھنگر پیک اور ٹریک کا پہلا دن“

ہر ٹریک کا پہلا قدم ہمیشہ بیجان خیز ہوتا ہے۔

پورٹر اپنے کاندھوں پر آپ کے بوجھ اٹھائے۔ آپ کے چوہے۔ پریشگر۔ دیسی گھی۔ دالیں۔ خوراک کے ٹین۔ پکوڑے تیلے کے لیے مین اور ٹیونا چھٹی وغیرہ اٹھائے لگتے ہیں اور جب آخری پورٹر آپ کے قریب سے گزر جاتا ہے تب آپ سب سفر کی دعا پڑھتے ہیں۔ اور بسم اللہ کہہ کر وہ پہلا قدم اٹھاتے ہیں۔

دراصل پہلا قدم ہی پوری کوہ نوری ہوتا ہے۔

جیسے کہا جاتا ہے کہ ناول کا پہلا فقرہ لکھنا سب سے مشکل ہوتا ہے۔ وہ لکھ لیجیے تو گویا ناول مکمل ہو گیا۔

جیسے چاند پر پہلا قدم۔ نسل انسانی کے لیے ایک عظیم بہت ہوتا ہے۔

جیسے سڑک پار کرتے ہوئے کسی کے ساتھ آپ کا ہاتھ چھو جائے تو گویا ایک عشق خاص کا آغاز ہو جاتا ہے۔

جیسے موت کے پہلے لمحے میں ہی قیامت آ جاتی ہے۔ کہ آپ کی آنکھیں بند ہونے کے بعد بے شک اربوں سال گزر جائیں، جب آپ کی آنکھ کھلے گی اور قیامت ہوگی اور آپ کہیں گے کہ میں تو ابھی ابھی مرا تھا۔

کچھ ایسے ہی ٹریک کا پہلا قدم۔ اور آپ منزل تک پہنچ جاتے ہیں۔

بس یہی پہلا قدم ہم نے ہوشے میں اٹھایا تو گویا گند و گورو کے بیس یکپ پہنچ گئے۔ ہوشے کی گلیاں کہاں تک ساتھ دیتیں۔ ایک ڈھلوان پر پہنچ کر جھک گئیں، پیچھے رہ

کوئلہ حال کرتے ہیں اور آپ اپنی فلاسک کو عزیز از جان.. جانتے ہیں کہ اس میں نمکول ملا پانی ہے جس کا ایک ایک گھونٹ آب حیات ہے اور جو آپ کے بدن کو ڈی ہائڈریشن سے بچا سکتا ہے.. پھر آپ ان ساتھیوں کو تلاش کرتے ہیں جو آگے نکل چکے ہیں جن میں برمانی بھی شامل ہے اور وہ چونکہ پہلی بار ہمارا ساتھی ہوا ہے اس لیے تازہ دم ہے اور کسی چولستانی آہوئے آوارہ کی مانند قلعہ نہیں بھرتا نظروں سے اوجھل ہو چکا ہے اور پھر ان ساتھیوں پر نظر کرتے ہیں جو آپ کے آس پاس آپ کو کوسے ہوئے پھٹ پھٹ بھاری قدموں کو بشکل اٹھارہ ہے ہیں۔ پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں تو کوئی ایک آدھ ساتھی ایسا ہے جو یہ منصوبہ بندی کر رہا ہے کہ گندو گورو پر لعنت بھیجو، یہیں سے واپس ہوشے لوٹ جاتے ہیں..

ہوشے سے ہماری اگلی قیام گاہ تک کا راستہ آسان ہونا چاہیے تھا کیونکہ گائیڈ بکس نے یہی اطلاع فراہم کی تھی اور اس قیام گاہ کا نام متعدد بار سننے اور دوہرانے کے باوجود مجھے یاد نہ ہوتا تھا.. صرف اتنا یاد رہتا تھا کہ اس کا نام کچھ چینی سا ہے اور چین کے ایک پرانے.. ایک وسیع جمیل کے کنارے چائے کے باغوں والے شہر ہانگ پو سے ملتا جلتا تھا.. لیکن میں اس لمحے ہانگ پو کو قطعی طور پر یاد نہیں کرنا چاہتا تھا.. کہ وہاں بیکنگ کی پتلی رہتی تھی..

ہوشے کے کھیتوں کا اختتام ہوا تو پتھر شروع ہو گئے.. خدا خدا کر کے وہ ختم ہوئے تو ایک دو نالے راستے میں آئے.. واجبی سی چڑھائی سے سابقہ پڑا..

ہمیں یہی اطلاع دی گئی تھی کہ آج کل چار سے چھ گھنٹے کا سفر درپیش تھا اور ہمیں چلتے ہوئے چھ گھنٹے تو بیت چکے تھے اور ابھی تک لنگ کے لیے بھی قیام نہ ہوا تھا.. پھر صنوبر کے کچھ درخت.. ٹھگنے اور چھدرے نظر آئے.. اور ان کے سائے میں کچھ بھاری اور سیاہ وجود حیرت نظر آئے..

میں نے جب پہلی ان ڈیو وجودوں کو دیکھا تو ڈر گیا کہ یہ کیا ہولناک چیزیں ہیں.. پھر کھلا کہ یہ تو بھولے بھالے یاک ہیں جو دھوپ سے بچنے کی خاطر صنوبر کے سایوں تلے استراحت فرماتے ہیں..

یہاں سے ہوشے دریا گہیں مشاہیرم کی جانب چلا گیا تھا وہاں سے اتر کر ہوشے کی جانب بہہ چکا تھا اور اب ہم چراگسار پر یا کو دیکھتے چلتے تھے..

ایک آبادی.. بلکہ متروک شدہ جھونپڑے آئے جو اوڈیگستان تھا.. کچھ باڑے تھے اور

صرف مڑکی پھلیاں تھیں اور تازہ تھیں تو وہ ان کے ہرے ذائقے کو منہ میں رکھنے کے لیے بے چین ہوتے تھے اور خوش ہوتے تھے..

ہم انہیں یہ معیاشی کرتے ہوئے چھوڑ کر آگے بڑھ گئے..
دائیں ہاتھ پر تہہ در تہہ کھیتوں کی اوپر خشک چٹانوں کی ایک دیوار چلتی تھی اور بائیں جانب بھی کھیت تھے اور ان کے آخر میں ایک گہرائی تھی جس میں ہوشے دریا بہتا تھا اور یہاں سے دکھائی نہیں دیتا تھا.. اگر ہم نے اپنے اولین منصوبے کے تحت مشاہیرم میں کیمپ میں جانا ہوتا تو ہم یہیں کہیں سے نیچے اتر کر ہوشے دریا کے پار جاتے اور اس کے ساتھ ساتھ سفر کرتے.. دریا پار ایک اور بہت بڑا نالہ بلندی سے اترتا آ رہا تھا اور اس کے آس پاس اس کے پانیوں میں سیراب ہونے والے ہرے بھرے کھیت تھے.. اسی جانب ایک ویران پہاڑ دکھائی دے رہا تھا جس پر ہوشے کی تین خواتین اور ایک مرد بکریوں کی مانند اوپر چڑھتے جاتے تھے.. وہاں نہ کوئی راستہ تھا اور نہ کوئی پگنڈی.. اور پھر بھی چڑھتے جاتے تھے کہ وہ اسی دنیا میں پلے بڑھے تھے.. وہ مجھ سے اتنی دور تھے کہ یہاں سے محض نکلے لگتے تھے جو کبھی کبھار حرکت کرتے تھے اور کبھی یوں ہوتا کہ میں کچھ دیر کے بعد اُدھر دیکھتا تو وہ جھاڑیوں اور گھاس میں گم ہو چکے ہوتے پھر غور کرنے سے دوبارہ نظر آتے.. وہ ایک خاص بلندی پر پہنچ کر ڈک گئے اور جھاڑیوں کو کانٹے لگے.. گھاس جمع کرنے لگے.. اور پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے اسے کمر پر بوجھ کر کے نیچے نالے کی جانب اترنے لگے.. شاید آپ سوچ رہے ہوں کہ اتنی دوری سے جہاں سے وہ محض نکلے لگتے تھے، میں نے کیسے جان لیا کہ ان چاروں میں سے تین عورتیں ہیں اور ایک مرد.. خواتین کے پیرا بن سرخ رنگ کے تھے اور وہ زیادہ آسانی سے پہاڑ پر چڑھتی تھیں..

ہم ابھی تک ہوشے کی دنیا میں تھے..
کھیتوں میں کہیں کہیں پتھرلی آماجگاہیں تھیں جن کے باسی ہماری نگاہوں سے چھپتے تھے البتہ بچہ لوگ ہاتھ ہلاتے تھے..

یہ تو درست کہ پہلا قدم سب سے مشکل ہوتا ہے لیکن اس سے بڑا کچھ یہ ہے اس پہلے قدم کے بعد ہی تو اصل آزمائش شروع ہوتی ہے.. سانس پھولنے لگتا ہے.. گھٹنوں میں درد ہونے لگتا ہے.. جو گزر پاؤں کو دبائے لگتے ہیں.. جرابوں میں اگر کوئی سلوٹ رہ گئی ہے تو وہ دکھ دیتی ہے اور پھر تیز دھوپ کے نیزے آپ کے بدن میں سوراخ کر کے نہ صرف پسینہ بہاتے ہیں بلکہ آپ

ایک کوٹھڑی مسجد تھی جس کے باہر وارننگ درج تھی کہ غیر مسلم یہاں داخل نہیں ہو سکتے۔ ہم سب اگرچہ اس کے اندر جانے کے ثمنائی تھے لیکن جبکہ گئے کہ کیا ہم اپنے آپ کو مسلمان کہہ سکتے ہیں۔ البتہ حسن صاحب بے دھڑک اندر چلے گئے کہ سر جی ہم اہل سادات میں سے ہیں۔

”اندرا کیا ہے؟“ ہم نے پوچھا جب وہ باہر آئے۔

”ایک چٹائی ہے اور ایک لوٹا ہے۔“

ہم پھر سے چلنے لگے۔ اس ٹریک میں آسانی یہ تھی کہ ہمیں راستہ تلاش کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آتی تھی۔ ایک چوڑی پگڈنڈی تھی جس پر بس چلتے جایئے۔

ذرا آگے ہمارے پور ٹر آرام کر رہے تھے۔

صنوبر کے درختوں تلے یا کوں کی مانند استراحت فرما رہے تھے۔

میں نے اپنا مختصر رک سیک اتارا اور ایک گنبے ہوتے صنوبر کے سائے میں ریگستا صرف اپنے چہرے کو دھوپ سے بچا رکھا اور لیٹ گیا۔

گرم سوپ۔ سارڈین۔ کچھ پیاز اور چائے۔

لنچ ٹائم۔

بائیں جانب جدھر ایک وادی دور تک جہاں تک نظر جاتی تھی، کھلتی جاتی تھی۔ مشاہیرم تھی۔ مشاہیرم کے برابر میں دو اور چوٹیاں تھیں جو چٹانوں میں سے جھانکتی اور ہوتی آسمان میں سفید ہوتی تھیں۔

”یہ پھنگر پیک ہے سر۔“ حسین نے اطلاع کی۔

برمانی تھنسس ہو گیا۔ ”سائیں۔ یہ پھنگر؟“ بلتی زبان کا کوئی لفظ ہے؟“

”نہیں سر۔ انگلش میں کہتے ہیں۔ پھنگر پیک۔ پھنگر۔“ اس نے انگلی کھڑی کر کے ہمیں بتایا کہ یہ والی۔ پھنگر!

معلوم ہوا کہ یہ چوٹی پھنگر۔ یعنی فنگر پیک اس لیے کہلاتی ہے کہ اس کی ساخت اور شکل دور سے ایک انگلی کی مانند اٹھی ہوئی دکھائی دیتی ہے بلکہ دو انگلیوں کی مانند کہ وہ دو چوٹیاں تھیں جو آسمان کو انگلی دیتے ہوئے کہتی تھی کہ خبردار ہم پھنگر پیک ہیں۔

اس پھنگر سے یاد آیا کہ ہوشے سے نکلتے ہی، ہم متعدد پروفیشنل قسم کے بچہ لوگ کی یاخار میں آگئے جو ہم سے بہ زبان انگریزی چاکلیٹ، سوپٹ، ٹافی وغیرہ کی ڈیمانڈ کرنے لگے۔

پروفیشنل اس لیے کہ شمال میں ہر وہ قصبہ یا آبادی جہاں سے بلند پہاڑوں کو راستے جاتے ہیں وہاں کے بچے جانتے ہیں کہ صبح سویرے غیر ملکی کوہ نور دوا پر جانے کے لیے نکلیں گے اور ان کے پاس چاکلیٹ اور ٹافیاں ہوتی ہیں جو ہمارے لیے ہوتی ہیں۔ چنانچہ وہ ایک طے شدہ شیڈیول کے مطابق اپنا حق وصول کرنے کے لیے آپ پر حملہ آور ہو جاتے ہیں۔

ہم نے ہوشے میں ایک بورڈ پر یہ عبارت پڑھی تھی کہ براہ کرم ہمارے بچوں کو ٹافیاں اور سوپٹس دے کر نہ فرخائے بلکہ انہیں کاپیاں اور پنسلیں تحفے کے طور پر پیش کیجیے تاکہ وہ تعلیم حاصل کر سکیں۔

ہمارے پاس ان بچوں کو فرخانے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ ہم اپنے ساتھ کاپیاں اور پنسلیں لانا بھول گئے تھے۔ چنانچہ انہیں ٹافیاں اور سوپٹس تاوان کے طور پر ادا کر دی گئیں۔ ان میں سے ایک بچے نے اپنا نام عمران خان بتایا اور دوسرے نے سینہ پھلا کر ایڑھیوں پر ڈرا بلند ہو کر کہا کہ میں۔ مشاہیرم خان ہوں۔

یہ مشاہیرم خان ابھی ایک میٹر کا بھی نہ تھا لیکن 7821 میٹر بلند چوٹی کی ہمسری کرنے میں کیا برائی ہے۔

چنانچہ ہم آسانی سے کہہ سکتے ہیں کہ مشاہیرم کو تو ہم نے ٹافیاں کھلائی تھیں اپنے ہاتھ سے۔ لنچ بریک کے دوران میں ایک تو ہم نے پھنگر پیک کو دریافت کیا اور اس کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوا کہ اس پیک کے برابر میں کوئی ایسا راستہ نکلتا ہے جو کھوہر سے میں جا اترتا ہے۔

”کے ٹو کہانی“ کے دوران۔ پائیو اور لٹی گو کے بعد ہالتور و گلیشیر کے کناروں پر جو ایک خیمہ گاہ تھی۔ جہاں ہم نے ایک اڈہ تے ہوئے گلیشیر کے سامنے رات کی تھی تو وہ خیمہ گاہ کھوہر سے تھی۔ اور یہ اڈہ تھا ہوا گلیشیر کھوہر سے کا تھا جو ہمارے قیام کے ایک دو برس بعد یوں اڈہ کہ اس خیمہ گاہ کو روندنا ہالتور و میں اتر گیا۔ اس سفر کے دوران ہر طور کے ٹوٹریک کے حوالے اتنے تھے۔ کیونکہ۔ یہاں واقعی ادھر تم ادھر ہم۔ والا معاملہ تھا۔ کنکورڈ یا کو جانے والے ہالتور و گلیشیر کا وجود ان چوٹیوں کے دوسری جانب چلتا تھا۔

صنوبر کے چھدرے سائے ہمیں آسودگی شدہ سکے اور ہم لنچ کھل کر پھر سے رواں ہو گئے۔ چراگسا دریا۔ صنوبر کے درختوں اور جھاڑیوں سے پرے بہتا تھا۔ اور پھر ہم اس کے کناروں پر آگئے۔ کناروں پر ڈورڈور تک پتھر تھے اور نرم ریت تھی۔

دو پہر خاصی دھل چکی تھی۔ لیکن ہماری منزل کا کچھ پتہ نہ تھا۔ کوئی نشان نہ تھا۔ جس منزل کا نام بھی یاد نہ رہے وہ بھلا کیسے آسکتی ہے۔

تھک سب چکے تھے لیکن اقرار کوئی نہ کرتا تھا۔

بے بس سب ہو چکے تھے لیکن شکایت کوئی نہیں کرتا تھا۔

کہ ٹریک کے پہلے روز ہی اگر اس قسم کے شکوے شروع ہو جائیں اور یہ بھی بتایا گیا ہو کہ یہ تو دو چار گھنٹے کا آسان راستہ ہے تو پھر کوئی بھی شکوہ کر کے اپنی مردانگی مجروح نہیں کرتا۔ دریا کے دھوار کناروں کے بعد اس کے پانی قریب آ گئے اور ہم موسیٰ نہیں تھے جو اس میں اپنی واکنگ سبک پیچنک کر اسے دولت ہو جانے کا حکم دیتے اور درمیان میں سے گزر جاتے۔ اس لیے ہم دریا پر معلق چٹانوں کے اوپر چڑھنے لگے۔

پہلی بار ایک قدرے مشکل راستہ قدموں سے آیا۔ جس میں اگرچہ بلندی کم تھی لیکن خطرناکی تھی۔ یعنی اگر پاؤں پھسلتا تھا تو ہم لڑھکتے ہوئے نیچے پانیوں میں جاتے تھے۔ اگرچہ یہ پانی بھی کم کم تھے نہ ہمیں بہا کر لے جاسکتے تھے نہ ڈبو دینے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ جان تو نہیں جا سکتی تھی ایک آدھ ہڈی چٹ سکتی تھی لیکن یہ بھی غنیمت تھا۔ اسی لیے یہاں پہنچ کر میاں صاحب پہلی بار جبکہ بلکہ خوشی سے نڈھال ہو گئے۔ ”شکر ہے کہ ایسا نام نہ نیم راستہ بھی آیا ہے۔ واہ جی واہ۔“

”کیوں واہ جی واہ۔“ میں نے اس راستے پر اپنے آپ کو قائم رکھنے اور نیچے نہ گرنے کی سعی میں جتلانا گواری سے پوچھا۔

”سہجی۔۔ ہوشے سے یہاں تک تو بس مشقت اور مزدوری تھی۔ طبیعت آواز ہو گئی تھی بے مقصد چلتے چلتے۔ اب کچھ کچھ خطرناکی کے آثار پیدا ہوئے ہیں تو بادشاہ ہو سوا آ گیا ہے۔“ میاں صاحب کی کوہ نوروی کی منطق یہ تھی کہ جب تک کہیں بلندی سے گر کر ہلاک ہو جانے یا دریا برد ہو کر موت کے سپرد ہو جانے کے امکانات پیدا نہیں ہوتے تھے، انہیں سوا نہیں آتا تھا۔ یہ نیم ہلاکت خیز راستہ بد قسمتی سے فوراً ہی تمام ہو گیا اور پھر سے صوبہ کے درختوں اور جھاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

ہم ایک مدت تک ان میں چلتے رہے۔ ہمارے برابر میں دریا چنگھاڑتا تھا اور ہمیں مزید بہرا کرتا تھا۔

”مارڈ صاحب۔“ غامز میرے برابر میں چلتا تھا۔ کے نو کے بعد پہلی بار کسی ٹریک میں

چلتا تھا اور ابھی تک اس کی سختی سے مقاومت نہیں کر پایا تھا۔ ”ہمیں اس دریا کے پار جانا ہے؟“

”پتہ نہیں۔“

”دریا کے پار ایک بہت بڑا گلیشیر دکھائی دے رہا ہے جو گندوگوروی ہو سکتا ہے تو کیا

ہم نے وہاں تک جانا ہے اور کل صبح اس کے اندر جانا ہے؟“

”پتہ نہیں۔“

”ویسے آپ کو پتہ کیا ہے؟“

”پتہ نہیں۔“

اور یہ حقیقت ہے کہ مجھے کچھ پتہ نہ تھا کہ ہم نے آج کہاں جانا ہے۔ صرف یہ پتہ تھا

کہ کہیں نہ کہیں جانا ہے۔

”کچھ تو پتہ ہوگا۔“

”صرف یہ پتہ ہے کہ کسی ایسی جگہ جانا ہے جس کا نام چین کے شہر ہانگ چو سے ملتا

چلتا ہے۔“

ہم جھاڑیوں اور بلند گھاس میں چل رہے تھے۔

”اگر تو ہم نے اس دریا کے کناروں پر سفر کرنا ہے تو مجھے آگے کوئی راستہ دکھائی نہیں

دیتا اور اگر ہم نے اس کے پار جانا ہے تو یہ اس مقام پر برالڈو جیسا ہے اور ہم درجن بھر

پورٹروں کے کندھوں پر سوار ہو کر بھی اس کے پار نہیں اتر سکتے جب تک کہ اس پر ایک ٹیل نہ

ہو۔۔ جو نہیں ہے۔“

”ہاں ٹیل تو نہیں ہے۔ اگر ہوتا تو نظر آ جاتا۔“

اور میں اس لمحے جب عامر نے یہ کہا کہ۔۔ جب تک اس پر ایک ٹیل نہ ہو۔۔ جو نہیں

ہے۔۔ اور میں نے جواب میں ابھی یہی کہا تھا کہ ہاں ٹیل تو نہیں ہے۔ اگر ہوتا تو نظر آ جاتا۔ ایک

ٹیل نظر آ گیا۔ جھاڑیوں کی اوٹ میں سے ایک نہایت نیچنی کھڑکی کا ٹیل دکھائی دینے لگا۔

”یہ تم پہلے ہی کہہ دیتے کہ اس دریا کو ایک ٹیل کے بغیر پار نہیں کیا جاسکتا تو یہ ٹیل پہلے

ہی نمودار ہو جاتا۔“

چرا کہ سادریا کہیں پیچھے سے چلا آ رہا تھا اور سامنے جو گندوگورو کا عظیم اور ہیبت ناک

گلیشیر دکھائی دے رہا تھا، اس میں سے اسی نام کا دریا اتر رہا تھا اور یہاں دونوں دریاؤں کا شگم تھا

اور اس پر ایک ٹیکنی کمر پل تھا۔

یہ پل اگر گریں اور ہوتا تو اس کے شوے رنگ ذوق جمال کو شدید طور پر زخمی کرتے لیکن یہاں گلگت، سکرو، چلو اور ہوشے سے بھی کہیں آگے جہاں یا کون کے ڈیر صنوبر کے سایوں میں پڑے تھے۔ اور مہنگر پیک تھی اور چراگسا ایسے نامعلوم دریا بہتے تھے وہاں یہ پل ایک ورک آف آرٹ تھا۔

اسے عجیب سا ٹیکنی ڈیلک قسم کے رنگوں سے پینٹ کیا گیا تھا۔ لگتا تھا کہ اسے پینٹ کرنے کا ٹھیکہ ٹھل جی کو دیا گیا تھا جس نے اپنے سلوڈیو میں جتنے بھی بچے کچے رنگ تھے، وہ اس پر تصویب دیئے تھے۔

بہر حال یہ ایک باقاعدہ پل تھا۔ کاندے کے نالے پر رکھے دو ستیر نہ تھے۔ اگرچہ اس کا لباس ہمارے گھر میں صفائی کرنے والی اس اماں کے لباس کے اس رنگ کا تھا جو وہ کمرس کے موقع پر چرچ جانے کے لیے زیب تن کرتی تھی۔

اور یہ عیسائی اماں جس کا ناک نقشہ ”بھاؤ“ کی دراوڑ پاروشنی ایسا تھا۔ بے حد دانا اور اُن پڑھ ہونے کے باوجود دانش رکھنے والی اماں تھی۔ ایک بار میرے بچوں نے پوچھا کہ اماں آپ مسلمان کیوں نہیں ہو جاتیں تو اس نے کہا۔ ”جیسا میں مسلمان ہو جاؤں تو بھی کیا آپ مجھے اپنی چارپائی پر برابر میں بیٹھنے دیں گے۔ تو جہاں مجھے برابر میں بیٹھنے دیا جاتا ہے وہیں کیوں نہ بیٹھی رہوں۔“

چراگسا اور گندوگور دیوؤں کے سنگم پر جو ٹیکنی کلر پل تھا، ذرا دیکھنے کو ہاں لاہور میں ہمارے گھر کے فرشوں پر گھسٹتی اُن پر ناکی پھیرتی اماں کیسے آگئی۔ اس پل پر قدم رکھا تو نیچے سے پانیوں نے اک ہوائے سرد ہمارے استقبال کو بھیجی جس کی خوشگوار ٹھنڈک سے لطف اندوز ہونے کے لیے ہم کچھ دیر اس کے درمیان میں کھڑے ہو کر لمبے لمبے سانس لیتے رہے۔

برمائی اور مسلمان کہیں آگے دفع ہو چکے تھے۔

لیکن پیچھے میاں صاحب، شاہد اور حسن تھے۔

اور ہم۔۔ میں اور عامر پل پر کھڑے لمبے لمبے سانس لیتے تھے۔

پل کے پار ایک معمولی سی چڑھائی تھی اور اس کے اوپر جھاڑیوں۔۔ بے ترتیب پودوں کا ایک گنناذ خیرہ تھا جہاں پر ہم رُک گئے۔

ایک دورا ہا آگیا تھا۔

ہم رُک گئے۔

آس پاس کوئی نہ تھا جس سے یہ پوچھتے کہ بھائی صاحب ہمیں یہ تو معلوم نہیں کہ ہم نے کہاں جانا ہے۔ اور جدھر بھی جانا ہے تو ان دور استوں میں سے کونسا راستہ ہے جدھر ہم نے جانا ہے۔ ہم دونوں۔۔ وہ درویش تھے۔۔ جو ایک دورا ہے پر کھڑے ہو گئے تھے۔

کوئی درویش تھے؟

شاہد ”تذکرہ غوثیہ“ یا ”سکینہ اولیاء“ میں یہ قصہ درج ہے کہ۔

دو درویش ایک گھنے اورتار یک جنگل میں جا رہے تھے۔ ایک بابا درویش تھا یعنی سرشد اور دوسرا بابا کا درویش تھا یعنی مرید۔ سامنے ایک ایسا ہی دورا ہا آگیا تو بابا کا درویش رُک گیا۔ بابا درویش نے پوچھا کیا بات ہے، رُک کیوں گئے ہو؟ اس پر بابا کے نے کہا کہ بابا میں سوچ رہا ہوں کہ اب ان دور استوں میں سے کونسا ایک راستہ اختیار کروں۔

اس پر بابا درویش نے فوری طور پر بابا کے درویش کے لمبے چوٹے کی تلاش لی۔ اس کی اندرونی جیب میں سے ایک چوٹی برآمد ہوئی جو بابا درویش نے نکال کر پھینک دی اور پھر پوچھا۔ ”ہاں بابا کے۔ اب بتاؤ کدھر جانا ہے۔ کونسا راستہ اختیار کرنا ہے؟“

بابا کے نے کہا ”اب تو کسی بھی راستے پر چل دیں، کیا فرق پڑتا ہے؟“

بابا کا اسی لیے رُکا تھا کہ اس کی جیب میں ایک چوٹی تھی اور وہ ڈرتا تھا کہ کہیں اس راستے میں۔۔ یا اُس راستے میں ڈاکو نہ ہوں اور مجھے لوٹ نہ لیں۔ میری چوٹی نہ چھین لیں۔ جب چوٹی نہ رہی تو تمام راستے ایک جیسے ہو گئے۔

ہم دونوں کی جیبوں میں بھی ایک چوٹی تھی اور ہم ڈرتے تھے کہ اب کونسا راستہ اختیار کریں۔

یہ چوٹی۔۔ وہ منزل۔۔ وہ خیمہ گاہ تھی جہاں ہم پہنچنا چاہتے تھے۔ اور ہم اسے کھونا نہیں چاہتے تھے۔ چنانچہ فیصلہ یہ ہوا کہ ہم دونوں اس دورا ہے سے الگ الگ راستوں پر کچھ دور۔۔ کچھ دیر چلیں اور پھر دیکھیں کہ کونسا راستہ اس چوٹی کی جانب جاتا ہے۔

میں دائیں ہاتھ ہو گیا اور عامر بائیں راستے پر چڑھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد ہم دونوں ایک دوسرے کی نظروں سے اوچھل ہو گئے۔ پھر جھاڑیوں میں سے ہکلاتی عامر کی آواز آئی۔

”تارڑ صاحب آپ صراطِ مستقیم پر ہیں.. یہ والا راستہ تو آگے سے بند ہو گیا ہے۔“
میں نے بھی آواز لگائی کہ.. زندگی میں پہلی بار صراطِ مستقیم پر چلا ہوں.. اب تمہارا انتظار
کرتا ہوں.. واپس آ جاؤ..

میں نے انتظار کیا اور وہ آ گیا..
ہم چند قدم آگے چلے ہیں تو سامنے منظر یوں کھلا جیسے راضی بہ رضا محبوب کے بند قبا
کھلتے ہیں..

”شائی چوکا خیمہ شہر.. ندیاں اور صنوبر کے ٹھکنے درخت“

سامنے.. ایک جھاڑیوں بھرا.. ندیوں بھرا وسیع میدان ہے جس کے پس منظر میں کچھ
برف پوش بلندیاں ہیں جو بہت نا آشنا اور پُر فریب ہیں اور یہ میدان رنگ رنگ کے درجنوں خیموں
سے بھرا ہے.. لگتا ہے کہ یہاں بھی ہوش کی مانند ہمیں خیمے لگانے کے لیے جگہ نہیں ملے گی، یہ اتنا
خیموں بھرا ہے.. ایک پتھر لی آماجگاہ بھی دکھائی دے رہی ہے جس میں گورا اور گوری لوگوں کا
تکٹھا پتہ نہیں کیا کر رہا ہے.. ہم دونوں نیچے ایک پُر شور نالے کی سطح پر آئے تو وہاں ایک بڑے
پتھر پر ایک گورے کو گیان دھیان میں غم پایا.. وہ پانیوں کو دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا یعنی اپنے ہی قبیلے کا
قہار پاگل تھا.. ہم اسے دیکھتے اس کے قریب سے گزرے تو اسے خبر بھی نہ ہوئی کہ ہم گزرے
ہیں.. وہ بھی گزرا ہوا لگتا تھا..

ذرا آگے ہوئے.. ایک ندی کو پھلانگ کر عبور کیا تو اس پُر جھوم خیمہ بستی میں داخل ہو
گئے اور اس بستی کا نام اب کہیں مجھے یاد ہوا ہے.. یہ ہانگ چڑ نہیں شائی چوٹھی..
ظاہر ہے ہم تو اس خیال میں مست تھے کہ وادی خیموں سے آگے.. چلو اور تلس سے
پرے یہاں تک کہ ہوشے ایسے دور افتادہ گاؤں سے بھی کہیں آگے ایک پیدل مسافت کے بعد
جب ہم شب کے لیے کسی خیمہ گاہ میں پہنچیں گے تو وہاں ایک بڑی ویران گم غم تنہائی ہوگی.. بس ہم
ہوں گے اور کوئی نہ ہوگا اور ہم آسمان سے باتیں کرتے پہاڑوں سے باتیں کریں گے.. عام طور پر
تو یہی ہوتا تھا.. لیکن یہاں پہنچتے ہیں تو خیموں کا ایک گھاؤں آباد ہے.. نصف یورپ کے کوہ نور
یہاں خیمہ زن ہیں.. اور گورے اتنی تعداد میں گھومتے اور مسخریاں کرتے پھرتے ہیں کہ ٹریفک جیم
ہو رہا ہے.. وہ جو پتھر لی آماجگاہ ہے تو دراصل کچھ ٹول سا ہے جس کے برآمدے میں میم لوگ

نالگیں پھیلائے کافی پیتا ہے اور اپنے مدت سے ان نہائے بدنوں کو کھجلی وغیرہ کرتا ہے۔

ہماری آمد کو مجال ہے کسی نے بھی نوٹ کیا ہو۔ ہوٹل کے قریب ندی کے اوپر ایک کھوکھا سا بنا ہوا تھا جس پر TWILIT لکھا ہوا تھا اور اُس مینٹر کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا جس نے گندو گورو نالے والے پل کو چنٹ کیا تھا۔ اگر آپ کی انگریزی کمزور ہے تو آپ کی اطلاع کے لیے یہ ”ٹائلٹ“ لکھا ہوا تھا۔ ندیوں کے بیچ کچھ ریتلے جزیرے سے ہیں جن میں مختلف گروپوں کے رہائشی ٹینٹ، ڈائمنگ ٹینٹ اور بکن ٹینٹ ایستادہ ہیں۔ اس جہان خیمہ جات میں ہم کھوسے گئے کہ ہم کدھر جائیں کہ نہ ہمیں کہیں اپنے خیمے نظر آ رہے تھے اور نہ پورے کھائی دیتے تھے۔

یہ تمام گورو لوگ اسکو لے سے کے ٹوبیس کیپ تک جا کر پھر واپس وڑے گندو گورو کے راستے یہاں شاکی چو پھنچے تھے اور یہ ایک بہت ہی طویل اور سخت کوہستانی سفر کا اختتام تھا، اس لیے وہ ریلیکس کر رہے تھے۔ مزے کر رہے تھے۔

ایک چھوٹی سی ندی کے کنارے ایک بلند قامت جرمن خاتون ٹائٹ جین اور بلاؤز میں پھنسی کھڑی ہے، سنہری بالوں والی ہے لیکن نہایت مردانہ شخصیت کی مالک ہے اور وہ اپنی آٹھ سالہ بیٹی کو جو بالکل اپنی ماں کی آٹھ سالہ ہو ہو ہے۔ ترقیب دے رہی ہے کہ یہ ندی خود پھیلاؤ کر پار جاؤ۔ بچی اپنی پونی ٹیل ہراتی بڑے مزے سے چھلانگ لگا کر دوسری جانب چلی جاتی ہے۔

”تارڑ صاحب۔“ عام بلی ہار بولا۔ ”یہ بچی بھی تو گندو گورو وڑے عبور کر کے آئی ہوگی۔ رستوں کے سہارے نیچے اتری ہوگی۔ تو یہ لوگ اگر اس عمر میں ہی اس قسم کی حرکتیں شروع کر دیتے ہیں تو ذرا جوان ہونے پر یہ کے ٹوبا اور سٹ کی چوٹی پر بھی تو یومی چھلانگیں لگاتے پہنچ جاتے ہوں گے۔“

”یہ لوگ ہر قسم کی حرکتیں اسی عمر سے شروع کر دیتے ہیں اور نو جوان ہوتے ہیں تو استاد ہو جاتے ہیں۔ ہم یہ حرکتیں اول تو کرتے ہی نہیں، اگر کرتے ہیں تو نو جوانی کے ڈھلنے پر شروع کرتے ہیں اور پھر ہمارا وہی حال ہوتا ہے جو۔ ہمارا اب ہو رہا ہے۔“

ہم خیمہ بستی میں سے گزرتے۔ ندیاں۔ بلکہ چھوٹی چھوٹی برفانی نالیاں پار کرتے ہلا خر شاکی چو کے کناروں پر آگئے جہاں ابھی سورج کی تمازت تھی اور ہمارے خیمے تھے۔ لیکن ٹینٹ قائم ہو چکا تھا اور اسحاق باورچی ایک بہت ہی شور کرتے سنو پر آلو کے قتلے فرانی کر رہا تھا۔

علی موسیٰ ایک نہایت ہی غلیظ جگ میں ٹینگ کے زرد پانی گھولنا ہمارے پاس آ گیا۔ یہ گندنا جگ۔ چند دنگچیاں۔ ایک کڑھائی۔ روٹیاں گرم رکھنے کے لیے ایک غلیظ پلاسٹک کا ہاٹ پاٹ۔ لیکن ٹینٹ کے لیے ترپال وغیرہ مسلمان نے ہوشے سے کرائے پر حاصل کئے تھے۔ ہم نے تب تو ان کی مخدوش بودار حالت کو دیکھ کر نہایت ناگواری کا اظہار کیا تھا لیکن جوں جوں ہم بلند ہوتے گئے، یہ آلات ہمیں عزیز تر ہوتے گئے۔ کیونکہ جگ میں ٹینگ کا زرد جوس گھولا جاتا تھا۔ کڑھائی میں قہقے اور ہلا خر پکڑے تھے جاتے تھے اور ہاٹ پاٹ میں ہمارے پراٹھے گرم رہتے تھے۔ مسلمان بھالو اور چوٹی زیریں کا تازہ دم گھوڑا برفانی پہلے آ چکے تھے۔ پھر میں اور عامر پہنچے۔ جس صاحب آئے اور پھر میاں صاحب اور شاہد لو بڑی کی طرح چبکتے پیار کرتے وارہ ہوئے۔

”واہ جی واہ۔“ میاں صاحب کے کسے ہوئے کسرتی چہرے پر ایک ایسے کوہ نور کی مسکراہٹ پھیلی جو در بدر ہوتا ایک ایسے مقام پر پہنچتا ہے جس کے سامنے انجانی چوٹیوں کی برفیں بلند ہوتی ہیں اور وہ اپنی تھکا کاٹ بھول جاتا ہے۔ ”واہ جی واہ۔ شاؤ چو چو کی کیا بات ہے۔“

”یہ شاؤ چو چو نہیں ہے میاں صاحب۔“ مسلمان نے ہنس کر کہا۔ ”شاکی چو ہے۔“

”اوئے سُل مان۔ تو پہلے کبھی ادھر آیا ہے؟“

”نہیں میاں صاحب۔“

”تو پھر تمہیں کیسے پتہ ہے کہ یہ شاکی چو چو ہے یا شاکی چو ہے؟“

”ویسے شاکی چو ہے میاں صاحب۔“ مسلمان نے کھسیانے ہو کر کہا۔

”ہوگا شاکی چو۔ لیکن ایسی زبردست نامہ نیم جگہ ہے کہ اس کے ساتھ ایک اور ”چو“ لگا دیں تو کیا حرج ہے۔ بزرگوں کو ٹوکنا نہیں کرتے۔ بھالو بچے۔“

”میاں صاحب۔ بھالو بن کر دکھاؤں؟“

”دکھاؤ۔“

مسلمان نے ہاتھ اونچے کر کے اپنی دیوں ہتھیلیاں نیچے کر لیں جیسے رچھہ ناچتے ہوئے کر لیتے ہیں۔

”تم بہت اچھے بچے ہو۔“ میاں صاحب نے نہایت محبت بھرے انداز میں داد دی۔

”میں بہت اچھا بھالو ہوں۔“

انہوں نے ہماری آمد اور ہمارے خیموں کو ناپسند کیا کیونکہ ہم نے ان کا منظر ہلاک کر دیا تھا۔ اور یہ منظر، اجنبی اور نا آشنا برقی چوٹیوں کا دل کش اور سحر انگیز تھا اور اب ہمارے خیموں کے بالکل سامنے، ایک بڑے گلہ شیر اور ایک بڑی ویرانی سے پرے یوں بلند ہوتا تھا جیسے وہ صرف ہمارے لیے ہی ہو۔

کچن ٹینٹ میں ہمارا نیا خرید کردہ چولہا دھڑ دھڑ جلتا تھا اور اس پر رکھی کڑھائی میں سے آلو کے گرم گرم قندے اتر رہے تھے جو ٹماٹو ساس کے ہلکے سے سب سے بچ کے ساتھ اپنی گرمی ذرا سی بچا کر ہمارے منہ میں اترتے تھے اور ہم خیموں کے آگے شانت بیٹھے سامنے کے منظر کو دیکھتے جاتے تھے۔ ابھی ہم سامنے میں بیٹھنا چاہتے تھے اور ابھی دو پہر ڈھل گئی۔ تمازت رخصت ہوئی تو اس کی جگہ ایک سرد ہوا چلنے لگی۔

”کیا بات ہے شانی چوچوکی“ میاں صاحب نے پھر دادوی۔

میاں صاحب میں... بے لگام قدرتی اور پہاڑی منظر کو اپنے سر آپے میں وصول کرنے کی ایک ایسی حس ہے کہ وہ ان میں کھو جاتے ہیں۔ اور انہیں بیان کرنے کے لیے گفتگو میں موقی پر رونے کی کوشش نہیں کرتے بس ایک ”واہ جی واہ“ یا ”کیا بات ہے“ کہہ کر اپنا مکمل اظہار کر دیتے ہیں۔ مجھے یاد ہے جب بڑے دیوسائی سے مرتضیٰ کیمپ میں اترتے ہوئے جیب کی اگلی نشست پر براجمان جب ہم دونوں کے سامنے یکدم چھوٹے دیوسائی کی سرسبز، حیرت انگیز، ایک وادی میں اترتی سفید ندی اور اس پر سفید بادلوں کے پرے کے پرے... اور قطعی طور پر ناقابل یقین حسن کی دنیا دکھائی دی تو ہم دونوں نے ”سبحان اللہ... سبحان اللہ“ کا ورد شروع کر دیا تھا۔ اس کے سوا ہماری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ہم کیا کریں، کیا کہیں؟ تو یہاں بھی ان کا یہی کہنا کہ... کیا بات ہے شانی چوچوکی۔ اس منظر کو بیان کرنے کے لیے کافی تھا۔

علی موسیٰ ایک ہلکی ہلکی پورٹر... میں اُس سے سوال کر رہا تھا اور وہ مجھے سامنے والے پہاڑوں کے بارے میں بتا رہا تھا۔ ”صاحب... یہ جو برف والا دو چوٹی ادھر شانی چوچو سے بہت نظر آتا ہے۔ اُس پتھر لے ابھار اور پھر ایک بڑا گلہ شیر کے آخر میں، قریب نہیں... لیکن قریب نظر آتا ہے تو یہ کچھ سیکس اور کچھ سیون کا چوٹی ہے۔ بہت لوگ ادھر شانی چوچو میں اس لیے آتا ہے کہ ادھر ان چوٹی کے میں کیمپ میں جائے، صاحب ہم تو ادھر گیا ہے بہت خوبصورت جگہ ہے ناں۔“

”مسلمان تم مانسٹر نہیں کرتے جب تمہیں بھالو کہا جاتا ہے؟“ شاید نے نہایت سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”شاید صاحب یہ مانسٹر کر جانے والے شے کے انچارج آپ ہیں... یاد ہے جب آپ دیوسائی ٹریک کے دوران پائینچے چڑھائے جرابوں کے بغیر جو گرز پہنے میرے آگے آگے چلتے تھے اور میں نے کہا تھا کہ شاید صاحب آپ علاقہ... کر کے آئے ہیں تو۔“

”ٹٹ آپ مسلمان۔“ میں نے اسے ڈانٹا۔

”سوری سر۔“

مسلمان ابھی ایک جنگی سا بھالو تھا۔ اور نہیں جانتا تھا کہ سینئرز کے ساتھ اس قسم کی بے تکلفی نہیں کیا کرتے۔ ہم اسے سدھانے کی پوری کوشش کر رہے تھے۔

دیوسے کیا ہم سب میں اتنا بڑا دل تھا کہ ہم مسلمان کی طرح اقرار کر لیں کہ ہم کیا کیا تھے۔ کیا میاں صاحب اپنے آپ کو ایک شاطر شتر مرغ کہہ سکتے تھے... میں اپنے آپ کو ایک محراب الاخلاق گدھ قرار دے سکتا تھا۔ شاید ایک عیار کو مزہ ہونے کا اقرار کر سکتا تھا۔ برہانی ایک سحر انگیز آنکھوں والا کوبرا ہو سکتا تھا۔ عام کہہ سکتا تھا کہ میں ایک سوچ میں گم رہنے والا ادبیات آنو ہوں۔ البتہ حسن صاحب کچھ بھی ہو سکتے تھے۔

ہم سب میں کوئی نہ کوئی جانور ہوتا ہے لیکن ہم اقرار نہیں کرتے۔

مسلمان اقرار کر لیتا تھا۔

ہم شانی چوچوچنے پر... خوش ہو گئی تھی۔

شانی چوچو... کسی حد تک کے ٹوٹیک کے دوران اٹھکولے کے بعد آنے والی خیمہ گاہ کو دونوں سے مشابہ تھا۔ وہاں بیافو کی بوجھی، خیمہ گاہ پر معلق بادلوں اور دھند میں تھی اور اُس میں سے جوندیاں نکلتی تھیں، وہ نیچے رہنے میدانوں میں اترتی اور پھیلی تھیں اور یہاں جوندیاں تھیں وہ گندوگور و گلہ شیر میں سے نکل کر شانی چوچو میں رواں ہوتی تھیں۔ ندیاں تھیں۔ جھاڑیاں اور صنوبر کے ٹھکنے درخت تھے لیکن یہاں ہجوم بہت تھا۔ کورونوں میں... کم از کم اُس شب... صرف ہم تھے۔

ہمارے خیمے شانی چوچو کے کناروں پر... ایک برفانی اور بہت ہی خاموش سی ندی کے کنارے اپنے رنگ رنگ و وجودوں کے ساتھ ایسا دھوپ چکے تھے اور ہم گھر والے ہو چکے تھے۔ اس ندی کے پار... جدھر سے ہم آئے تھے اس جانب کسی ہسپانوی گروپ کے بے شمار خیمے تھے اور

پھاڑی ہے ناں۔ آدھے گھنٹے میں اُدھر پہنچے گا۔ پھاڑی سے آگے ایک گلیشیر ہے اُس پر چل کر پہلی رات کرے گا اور اس سے اگلے دن کے سکس کے میں کیمپ پہنچ جائے گا۔ یہ۔ لمبا لمبا گھاس ہے صاحب اور جمیل ہے اور۔“

یہاں پر ہم نے علی موسیٰ کی زبان بندی کر دی کیونکہ ہم پھر بے ایمان ہونے کو تھے۔ کہتے ہیں جس سروے کرنے والے نے ان شمالی علاقوں کو نقشے پر لانے کے لیے یہاں کی چوٹیوں کی بلندی کا حساب کتاب کیا۔ اُس نے چوٹیوں کے ایک پورے سلسلے کا نام ”کے“ سے شروع کیا اور پھر اپنے تئیں جو سب سے بلند چوٹی تھی، اُسے کے دن کا نام دیا۔ اس کے بعد جو کم بلندی کی چوٹی تھی اُسے کے نو کہا۔ اور پھر تھری فور فائیو کے بعد کے سکس اور کے سیون کو شناخت ملی۔

بہت بعد میں جب ذرا تفصیل سے بہتر آلات کی مدد سے بلندیاں ناپی گئیں تو معلوم ہوا کہ بلند ترین بلکہ دنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی کے تو تھے۔ چنانچہ ہمارے سامنے زرد اور بجھتی کرنوں کے گہنوں سے لدی جو دو چوٹیاں تھیں، وہ کے نو کی بہنیں تھیں۔ اور یہ کبخت بہنیں اتنی سوہنی تھیں کہ اس سے اس سردیلی شام میں شامی چوکی شام میں اُن کے بلاوے آتے تھے۔

کہتے ہیں کہ اُدھر سے۔ مقامات مقدسہ کی جانب سے بھی بلاوے آتے ہیں تب انسان اُدھر کوچ کرتا ہے یہ اپنے بس کی بات نہیں ہوتی۔ کے سکس اور کے سیون بھی حجر اسود کی مانند ایک بلاوے کی قوت رکھتی تھیں کیونکہ دونوں میں کم از کم پتھر ہونا مشترک تھا۔

ہم کوشش کر رہے تھے کہ اس بلاوے پر دھیان نہ دیں۔ اس لیے اُدھر دیکھنے سے اجتناب کرتے تھے۔ اُدھر اُدھر دیکھتے تھے۔ چنانچہ اس کوشش میں کسی نے دائیں جانب جو پہاڑ تھا اس کے اوپر چلتے ہوئے دو یا کوں کی نشاندہی کی اور حیرت کا اظہار کیا کہ یہ کبخت وہاں تک کیسے پہنچ گئے ہیں۔

”جیسے وہ ہمیں نیچے یہاں دیکھتے ہوئے ایک دوسرے سے پوچھتے ہوں گے کہ یہ کبخت یہاں کیسے پہنچ گئے ہیں۔“

شامی چوٹی میں اگرچہ ہر طرح سے خیریت رہی لیکن ایک چھوٹا سا سانحہ ہو گیا۔

”تو کیا گندو گورو درے کے میں کیمپ سے بھی زیادہ خوبصورت جگہ ہے؟“

”تو اور کیا صاحب۔ گندو گورو کا میں کیمپ تو کچھ بھی نہیں۔ فضول ہے۔ اور پھر بھی سب لوگ اُدھر جاتا ہے۔ اُدھر کے سکس اور کے سیون کا جو میں کیمپ ہے اُدھر جمیل ہے اور میدان ہے۔ اور میدان میں یہ اتنا بڑا بڑا اونچا گھاس ہے کہ اس میں بندہ چھپ جاتا ہے۔ ایسا گھاس ہے۔“

”اچھا؟“ ہم میں سے کسی کا منہ کھل گیا۔

”جمیل ہے اور بہت بڑا بڑا گھاس ہے علی موسیٰ۔“ کسی اور نے ایک آدھی بھری۔

”ہاں ناں۔“

”تارڑ صاحب۔ یہ کیسا ہے گا۔ گندو گورو نہ جائیں اُدھر کے سکس اور کے سیون کے میں کیمپ میں چلیں جدھر جمیل ہے اور لمبا لمبا گھاس ہے۔“ کسی نے صلاح دی۔

”اُدھر لمبا لمبا گھاس کیوں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”اس لیے صاحب کہ اُدھر تک موٹی نہیں پہنچ سکتا۔ راستہ مشکل ہے تو موٹی مری جاتا ہے۔ اس لیے اُدھر لمبا لمبا دنیا جہاں کا گھاس ہے۔“

”اگر اُدھر موٹی نہیں پہنچ سکتا تو ہم کیسے پہنچ سکتا ہے علی موسیٰ؟“

کوہ نور دوں کا ایمان بڑا کمزور ہوتا ہے۔ انہیں پہاڑوں کا کوئی انجمنی خواب دکھا دیا جائے تو وہ فوراً بے ایمان ہو جاتے ہیں۔ ایسے مدیدے بچے ہوتے ہیں کہ ایک ٹانی ہاتھ میں ہے اور دوسری دیکھتے ہیں تو رال ٹپکے لگتی ہے۔ ہم نے ایک بار مشاہیر کو ترک کر کے گندو گورو کو چن لیا تھا اور اب ایک مرتبہ پھر بے وفائیاں ہونا چاہتے تھے۔

ویسے اس لمحے ہمارے ارد گرد شامی چوٹی میں شام ہی شام تھی لیکن سامنے کے سکس اور کے سیون اسی شام کی آخری کرنوں کے سونے سے اپنے لیے برفانی ٹھیکے، جہاں جریں اور نکلن بنا رہی تھیں۔ زرد رنگ کے ایسے برفانی گہنے بنا رہی تھیں کہ ہم میں سے کوئی بھی ان زرد شہزادیوں کے عشق میں مبتلا ہو کر گندو گورو جانے سے انکاری ہو سکتا تھا۔ اور اگر کوئی ایک ہو جاتا تو ہم سب ہو جاتے۔ اور پھر ان زرد شہزادیوں کے دامن میں ایک جمیل بھی تھی اور لمبا لمبا گھاس بھی تھا۔

”نہیں نہیں پہنچ سکتا ہے صاحب۔ گندو گورو سے آسان ہے۔ دیکھیں ہمارے ٹینٹ کے آگے جو ایک میدان سا ہے جس کے ایک طرف دریا ہے تو اس میدان کے آگے وہ چھوٹا خشک

میاں صاحب نے وہ خیمہ نصب کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ایسا نامرد تھا کہ ایسا وہ ہونے سے انکاری ہوتا جاتا تھا۔ بیٹھیں بھی پوری نہیں تھیں اور ٹٹا میں بھی ٹوٹی ہوئی تھیں اور میاں صاحب اسے زبردستی کھڑا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میاں صاحب اس پر پتھر رکھ کر اسے قائم رکھنے کی سعی کر رہے تھے۔

”یہ تو ذرا سی ہوا کے چلنے سے گر جائے گا میاں صاحب۔“

”نہیں گرتا تارڑ صاحب۔ میں نے بہت سارے خیمے دکھ دیے ہیں۔ اگر گر بھی جاتا ہے تو اندر سونے والا ہلاک تو نہیں ہو جائے گا۔ اس کے گرنے سے آپ ذرا ملاحظہ کریں کہ اب بھی اس کے لیے میں ہی خیمہ لگا رہا ہوں اور یہ۔ یہ شاید مزے سے بیٹھا مسکرائے جا رہا ہے میری ہیلپ نہیں کرتا۔“

میاں صاحب قلم فارم میں تھے۔

اُن سے بحث کرتا فضول تھا۔

بالآخر جب وہ خیمہ کچھ نیم ایسا وہ سا ہو گیا تو شاہد کو اس میں دھکیل دیا گیا۔ شاہد اُس کے پردوں میں سے سر نکال کر ہمیں انتہائی حسرت سے دیکھنے لگا۔

برمانی کہنے لگا۔ ”گلتا ہے شاہد صاحب سیلاب زدہ ہیں اور خیراتی خیمے میں پناہ لیے ہوئے امدادی کھانے کا انتظار کر رہے ہیں۔“

شاہد نے حسبِ عادت اپنے چند بال نہایت ہتھام سے سنوارے۔ ٹینک اتاری اور چندھیائی ہوئی آنکھوں سے ہمیں دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ”جی سر۔ بڑا ظلم ہوا ہے سیلاب میں سب کچھ بہہ گیا ہے۔“

اس سانحے کے دوران کے ٹوکی دونوں بہنیں اپنے زرد گبنے اتار کر نیند میں چلی گئی تھیں۔ شاکی چو میں ایک سرد ہوا آتری اور ہم اپنی گرم جیکٹیں تلاش کرنے لگے۔

کھانے کے بعد جو بہت سی واجبی کھانا تھا۔ ہم سب اپنے اپنے خیموں میں چلے گئے۔ البتہ شاہد کا سر اس کے امدادی خیمے کے پردے میں سے نظر آتا رہا۔

شاکی چو کی خیمہ گاؤ۔ اور ہم تو اس کے کناروں پر مقیم تھے۔ بارونق تھی۔ کہیں کہیں گیس لیمپ روشن تھے اور اجنبی زبانوں کے فقرے ہوا کے دوش پر تیرتے ہمارے کانوں تک آتے تھے اور ان میں وصول کی تھا پ بھی رگ رگ کر آتی تھی۔ جیسے کافرستان کی رات میں برون گاؤں سے

میاں صاحب نے اپنے خیمے سے شاہد کو دھکیل کر باہر نکال دیا۔ اس کا ساز و سامان، سلپنگ بگ وغیرہ باہر پھینک کر اُسے خیمے سے عاق کر دیا۔ ”خان صاحب اپنا بندوبست خود کرو۔ میں تو کر لگا ہوا ہوں تمہارا کہ اپنا خیمہ لاؤں۔ اسے خود لگاؤں اور پھر تمہیں سلاؤں۔ اور پھر تم رات کو خراٹے مار کر میرا پھنوس اُڑا دو۔ ہوشے میں میں ساری رات سو نہیں سکا۔ آج چلنے میں سب سے پیچھے تھا۔ کیوں؟ صرف تمہارے نامہ نیم خراٹوں کی وجہ سے۔“

شاہد اپنے پورے بستر پر ایک اُداس پناہ گزین کی طرح بیٹھا تھا۔

”میاں صاحب۔“ میں نے قلم و رتا معقولات کرنے کی کوشش کی۔

”بس جی آپ لیڈر ہوں گے تو اپنے گھر ہوں گے۔“ انہوں نے مجھے بھی جھاڑ پالا دی۔ ”میں کل ساڑی رات سو نہیں سکا۔ ایسی یاڑی مجھے وائز نہیں کھاتی جس میں خوائے ہی خوائے ہوں۔“

میاں صاحب واقعی جلال میں تھے کیونکہ اُن کی ہر ”ز“ جو تھی وہ ”ز“ میں بدل رہی تھی۔

”لیکن میاں صاحب آپ دونوں تو برسوں سے اکٹھے سوتے آئے ہیں۔“

”وقت وقت کی بات ہے جناب۔ اب بڑداشت نہیں ہوتا۔ نہ میں جب خیمہ لگانے لگتا ہوں تو یہ ادھر ادھر ہو جاتا ہے اور جب خیمہ تیار ہو جاتا ہے تو کہیں سے نمودار ہو کر کہتا ہے۔ میاں صاحب کچھ ہیلپ کرو۔ میرے تو اوپر نیچے کے بال جل جاتے ہیں یہ یمن کر۔ تو جناب گڈ بائے ہے میری طرف سے۔“

”میاں صاحب کو بلندی ہو گئی ہے تارڑ صاحب۔ ان کی باتوں کا ماسٹڈ نہ کریں۔“ شاہد نے کھسپانے ہو کر ذرا سرگوشی میں مجھ سے کہا لیکن میاں صاحب نے سن لیا اور چمک اُٹھے۔ ”نہ میں تم سے کہہ رہا ہوں تو ماسٹڈ تم نے کرنا ہے کہ تارڑ نے۔ اوئے بھائی مجھے تو کنگور ڈیا میں بلندی نہیں ہوئی تھی یہاں شاکی چو چو میں کیسے ہو جائے گی۔ بس میری آنکھیں ٹھکل گئی ہیں۔ لیکن یاڑی کا معاملہ ہے، میں تمہارے لیے کچھ بندوبست کر دیتا ہوں۔“

میاں صاحب نے سامان میں سے ایک خیمہ نکالا جو برمانی اپنے ساتھ لایا تھا اور جس پر ”پاکستان زندہ باد“ لکھا ہوا تھا اور صرف اس مقصد کے لیے ساتھ لایا تھا کہ اگر کہیں ٹائلٹ ٹینٹ کی ضرورت پڑے تو اسے استعمال میں لایا جائے۔ ورنہ وہ کوئی ایسا خیمہ نہ تھا جس میں کوئی خود دار شخص رات گزار سکے۔

”مُجرا ان شائی چو.. بابا فلاکت زدہ اور رقص کرتے حسن صاحب“

وصول کی تھاپ مسلسل آتی تھی..

اور اس کے ہمراہ کچھ نامانوس گیت تھے جو سرد ہواؤں کے ساتھ سفر کرتے آتے تھے.. میں ابھی ہوش سے آیا تھا، چنانچہ ہوش سے نیند میں مدہوش ہونے کے مراحل میں کہیں ہچکولے کھارہا تھا جب مجھے ایک مدہم سی آواز آئی۔ ”تارڑ صاحب.. تارڑ صاحب..“
خیمے کے باہر کوئی تھا..

میں نے اُسی نیم مدہوشی کے عالم میں کہا۔ ”کون ہے؟“
”میں ہوں قادر..“

”کون قادر؟“

”نسر.. اشرف امان کا کزن.. جس نے آپ کے لیے ”یاک سرائے“ کے سفر کے لیے وادی اشکو من تک جیپوں کا بندوبست کیا تھا.. سوری ٹوڈ سٹرب پوسر..“
”یار مجھے اب جیپوں کی ضرورت نہیں.. تم یہاں کیسے آ گئے ہو؟“ میں نے ہزاری سے کہا۔

”صاحب مجھے تو ابھی ابھی معلوم ہوا ہے کہ آپ ادھر شائی چو میں پہنچے ہو.. میں اپنا گروپ لے کر ادھر کے ٹو سے گندوگورو کے راستے ادھر آتا ہوں تو.. صاحب ادھر ہوٹل کے پاس سارے پورٹر لوگ اور گائیڈ لوگ مڑا کرتے ہیں.. وصول بجاتے ہیں اور ناپتے ہیں تو ان کو بھی معلوم

وصول کی آواز نیچے وادی میں رُک رُک کر اترتی ہے..

”کل ہم نے کس مقام پر پہنچنا ہے سلمان؟“

سلمان نے ایک کروٹ بدلی جو کسی بھونچال کی چھوٹی ہشیرہ تھی اور بولا ”دل سنگ پا“
”کیا؟“ عجیب و اہیات نام تھے اس ٹریک کے..

اُس نے پھر دہرایا..

”دل سنگ پا؟“

”نہیں سر ہمارا دل اتنا تنگ نہیں.. یہ دل سنگ پا ہے جہاں ہم نے پہنچنا ہے اور اس کا مطلب ہے..“ پھولوں کے کھیت.. کل ہم وہاں جائیں گے..“
”واہ“ میں نے کہا..

تھکا ہوا تھا.. پھولوں کے کھیت کے خیال میں ٹم.. دھیرے دھیرے اُس نیند میں اترنے لگا جسے میں کبھی ایک عارضی موت سے تشبیہ دیتا تھا لیکن اب.. اس عمر میں اس کی بے گشتی کے بھی امکانات تھے..

حسن صاحب ہلکے ہلکے خرائے لینے لگے.. دو اتنے بلند نہ تھے کہ انہیں خیمہ بدر کر دیا جائے..

حیرت انگیز طور پر سلمان نہایت بے آواز سوتا تھا.. اور یہ ثابت کرتا تھا کہ صرف انسان خرائے لیتے ہیں بھالو نہیں..

کے باطن میں اور شائقین لگے تھے اور ان سب کی ہتھیلیاں ان کی آنکھوں کی سطح پر تھیں اور تالیاں بجاتی تھیں۔ درجنوں پورٹر گاڑیڈ، نور آ پر پٹر۔ باورچی۔ بانی پورٹر۔ کوئی ہنزہ کا۔ کوئی گھر کا۔ گھگٹ کا۔ وادی شکر یا اشکو لے کا۔ سب کے سب آپس میں مقامی مفاہمت رکھنے کے باوجود اس شب شادی چو میں مسرت سے چھلکتے تھے۔ خوشی سے بے خود ہوئے جاتے تھے۔ ناپختے تھے۔ تالیاں بجاتے تھے۔ گاتے تھے، ذوق بجاتے تھے۔ کنستروں پر تھاپ لگاتے تھے اور شور مچاتے تھے۔

دراصل آج کی شب ان کے لیے کوہ نور دی کی مزدوری اور مشقت کی آخری شب تھی۔ وہ سکرو سے چلے تھے۔ اشکو لے کے راستے کے ٹوئیں کیمپ تک پہنچے تھے اور پھر مشاہیر گلشیر عبور کر کے وزہ کندہ گورو پار کرتے ہوئے نیچے یہاں شادی چو میں پہنچ گئے تھے۔

اور کل انہوں نے ہوشے میں ہو جانا تھا۔ جہاں ان کے لیے بھینس منتظر تھیں۔ انہوں نے فارغ ہو کر، اجرت کے نوٹوں سے گرم جیبوں کے ساتھ اپنے گھروں کو لوٹا تھا۔ ان کی سرخوشی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انہیں آج طے شدہ مزدوری ادا کر دی گئی تھی کہ یہ ٹریک کا آخری پڑاؤ تھا۔

تماشا بینوں اور رقاصوں میں کچھ فرق نہ تھا۔

ہر تماشا بین کبھی نہ کبھی رقص ہو جاتا تھا۔

اس اکھاڑے کے بیچ اگرچہ ہر کوئی گود جاتا تھا لیکن ان میں سنا پر فارم ایک ہی ہوتا تھا جو اپنے کمال رقص دکھاتا سب کی توجہ حاصل کر لیتا تھا۔ وہ مرد میدان تھک جاتا تو ایک اور دم سے اکھاڑے میں گود پڑتا۔ بلکہ مرد میدان بہت تھے اور میدان ان کے لیے مختصر تھا۔

اس اکھاڑے میں ایک ایسے صاحب تھے جو مسلسل تھے اور رقاصوں اور گویوں کو بلا شیری دینے پر مامور تھے۔ جیسے امریکی فٹ بال یا بیس بال کے بیچ میں چیئر لیڈر ہوتے ہیں جن کا کام ہی یہی ہوتا ہے کہ وہ عوام کو اشتعال دلاتے رہیں۔

یہ چیئر لیڈر اتنا آن تھک اور رومانی مسرت سے لبریز تھا کہ اگلے دو گھنٹوں میں میں نے اسے ایک لمحے کے لیے غیر متحرک نہ دیکھا۔ نہ اس کی چوڑی بے مہار مسکراہٹ کو سٹ کر ہونٹوں میں غائب ہوتے دیکھا اور نہ اس کی تالیاں بجاتی ہتھیلیوں نے ایک پل بھی آرام کیا۔ وہ مسلسل تالیاں بجاتا۔ رقص کرتا ایک مست درویش تھا جو ہر رقاص کی آمد پر بے پناہ مسرت کا اظہار کرتا۔ اس کے رقص کی بے پناہ داد دیتا بے خود تھا۔ تماشا بینوں میں جو پورٹر اور گاڑیڈ رقص کے ماہر تھے، وہ ان کے ہاتھ پکڑ کر انہیں میدان عمل میں لے آتا۔ اس کی سرخوشی دیکھنے کے لائق تھی۔ پتہ

ہو گیا کہ آپ ادھر ہو تو وہ کہتے ہیں کہ تارڑ صاحب کو درخواست کر۔ کہ آ جاؤ۔ آ جاؤ صاحب۔ مہربانی ہو گا۔

میں آنکھیں ملتا اپنے سلیپنگ بیگ میں سے کھسکتا نہایت مشقت کرتا پیسے سے باہر آیا تو اندھیرے میں ایک بارش قادر کھڑا تھا اور مسکرا رہا تھا۔

”سوری سر۔ آپ سو گیا تھا۔؟“

”نہیں ہم کبڈی کھیل رہا تھا۔“

”جی۔؟“

”نہیں۔ نہیں سو یا تھا۔ کیسے ہوا دور؟۔ واڑھی میں اچھے لگتے ہو۔“

”تھینک یوسر۔ تو تشریف لائے گا۔“

”صرف میں نہیں پورا ٹیم تشریف لائے گا۔“ میں نے سوچا اگر میری نیند برباد ہوئی ہے تو بقیہ حضرات کیوں خواب خرگوش کے مزے لوٹیں۔ چنانچہ میں نے ٹیم ممبران کو پکارنا شروع کر دیا۔ میری آواز پر صرف سلمان، میاں صاحب اور حسن نے لبیک کہا اور گرتے پڑتے خیموں سے باہر آ گئے۔

باہر سردی تھی۔

”کدھر کا دور؟“ کیونکہ اندھیرے میں کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ یہ محفل جو بھی ہے تو

کدھر بھی ہے۔

”میرے پیچھے آ جائیں صاحب۔“ قادر اندھیرے میں ندیاں پھلانگنے لگا۔ اور ہم بھی جو نیت امام کی کے مصداق اس کے پیچھے پیچھے اندھاؤ خند پھلانگیں لگانے لگے۔ کبھی اندازہ نہ ہوتا تو کسی برفانی نالی کے پار جانے کی بجائے اس کے درمیان میں لینڈ کر جاتے، جو گرز بھگوتے گرتے پڑتے رقص گاہ تک پہنچ گئے۔

یہ تو وہی جگہ تھی گزرے تھے ہم جہاں سے۔ جہاں گوریاں ناگئیں پھیلائے کافی پتی تھیں اور ندی پر براجمان ایک کھوکھے پر TWILIT لکھا تھا۔

ہمارے لیے جگہ بنائی گئی۔ بیچ اور کرسیاں خالی کر دیے گئے۔ ان کے سامنے شادی چو کی شب میں مردانہ نچرا اور ہاتھ۔

پتھر لی آماجگاہ کے برآمدے میں ایک چھپرے تے کرسیاں لگی تھیں اور ان پر طرح طرح

نہیں اس کی اس بے مہار مسرت کا سبب کیا تھا۔ اس کی خوشی کس منہ سے پھوٹی تھی۔ مسلسل حرکت کرتا۔ ناچتا۔ کبھی ڈھول والے کو داد دیتا اور کبھی ہنسی لڑائی تال پر ناچتا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اتنا خوش کیسے ہو سکتا ہے۔

شائد اس لیے کہ میں جس گھٹنے ہوئے بے روح معاشرے سے یہاں شائی چونک آیا تھا وہاں اتنی بے پناہ مسرت کا۔ بلکہ بے جواز مسرت کا رواج نہ تھا۔

ڈھول کی تھاپ شائی چو پر تھرتی اس کی ندیوں اور صنوبر کے درختوں کو ہماری طرح اندھا و ہند پھلا گئی کے سکس اور کے سیون کی برفوں تک جاتی تھی۔ عام پورٹ۔ دریدہ دامنوں والے۔ پچھے پیرا ہنوں والے۔ پاؤں میں کینوس شوز جرابوں کے بغیر۔ وہ بھی اپنے ساتھی پورٹوں کے رقص کرنے پر ان پر نئے نوٹ بے دریغ بٹھا کر رہے تھے۔ غربت میں بھی۔ اتنا بڑا دل رکھنا انہی اہل شمال کا خاصا ہے۔ ایک غریب مزدور خون پسینے کی کمائی کو بھی سینے سے لگا کر نہیں رکھتا۔ شائی چو کی رات میں کسی اجنبی رقص پر لڑتا ہے۔ وہ کسی ایک نوٹ سے اپنے لیے ایک عمدہ بوٹ خرید سکتا ہے۔ چند نوٹوں سے ایک گرم جیکٹ حاصل کر سکتا ہے لیکن وہ پچھے ہوئے بوٹوں اور چھتھرا جیکٹ میں رہ سکتا ہے۔ اپنی مسرت کے اظہار کے طور پر اکھاڑے میں ناچتے کسی شخص پر نوٹ پھینکنے سے نہیں رو سکتا۔

میں نے کہیں پہلے بھی لکھا ہے کہ اہل شمال میں رقص کی ایسی جس ہے ان کے بدن میں ایک ایسی ردھم ہے جو بقیہ پاکستان میں کم کم ہی پائی جاتی ہے اور ان کے رقص میں کہیں بھی نسوانیت کی لچک کا رنگ نہیں ملتا۔ انہیں دیکھ کر یہ یقین ہو جاتا ہے کہ رقص تو صرف مردوں کے کرنے کی چیز ہے اور عورتوں کو اس کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔

مسلسل تالیاں بجانے والے اور مسلسل مسکرانے والے شخص نے زمین پر پھسکڑا مار کر بیٹھتے ہوئے ایک باباجی سے درخواست کی کہ وہ میدان میں آئیں۔ باباجی نے کچھ دھیان نہ دیا۔ ان سے پھر گزارش کی گئی لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئے بالآخر ان کی منت سماجت کی گئی اور اس کے ساتھ شائقین نے بھر پور تالیاں بجا کر انہیں مجبور کر دیا کہ وہ میدان میں اتر آئیں۔

یہ باباجی نہایت فلاکت زدہ تھے۔

پچھے پرانے کپڑوں میں تھے۔ بھوری آرمی جیکٹ کی سب جیبوں کی زبا میں لٹک رہی تھیں۔ کسی گورے کی عطا کردہ پتلون جو پا جامہ ہو چکی تھی، باباجی کے گھٹنوں کی نمائش کرتی

تھی۔ ان کی میلی جیکٹ اونی ٹوپی میں بھی سوراخ تھے۔ یہاں تک کہ ان کے دانت بھی پورے نہ تھے۔ لیکن جب وہ اٹھے تو کل مخلوق نے نعروں اور تالیوں سے شائی چو کا آسان جو ہلندی کی وجہ سے نیچے آچکا تھا، اسے سر پر اٹھالیا۔ وہ کسی نہ کسی فن میں کوئی نہ کوئی کمال تو رکھتے تھے۔

بابا فلاکت زدہ نے نہایت سنجیدگی سے اپنے اعزاز میں بیٹی جانے والی تالیوں کا نمجک کر شکر یہ ادا کیا جیسے وہ ایسے استقبال کے عادی تھے۔ انہوں نے دو چھوٹے چھوٹے ٹبلہ نما ڈھول جو شائد انہوں نے خود بنائے تھے، اپنے سامنے رکھے اور شہوت کی دو چھڑیوں سے انہیں جل ترنگ کی مانند بجانے لگے۔ ان پر ایک خاص لے میں ضرب دینے لگے۔ اور تالیوں میں مزید اضافہ اور تحسین کے نعرے۔ اور پھر منہ کھول کر۔ اتنا منہ کھول کر کہ ان کے بقیہ ماندہ۔ اور جو چیدہ چیدہ دانت تھے، گنے جاسکتے تھے۔ گانے لگے۔ اب جو بابا فلاکت زدہ نے پہلی تان اٹھائی ہے تو غدر مچ گیا۔ یوں جیسے اُم کلثوم سٹیج پر آ گئی ہو۔ نور جہاں نے ”آواز دے کہاں ہے۔“ شروع کر دیا ہو اور مہدی حسن نے ”گلوں میں رنگ بھرے“ چھیڑ دیا ہو۔ ایسے غدر مچ گیا۔

میرے برابر میں بیٹھے ایک ہارٹس بزرگ جو اگر سبز چوڑے زب تن کر کے لاہور کے کسی پاش علاقے میں دھرتا مار کر بیٹھ جاتے تو ہیر سائیکس ہو جاتے اور معتقدین ان کے پاؤں دھو دھو کر پیتے۔ بقیہ ناظرین کی مانند مسلسل تالیاں پیٹنے میں مصروف تھے۔ انہوں نے کھڑے ہو کر بابا فلاکت زدہ کا استقبال کیا۔ وہ موسیقی اور اس کی تال سے اتنے سرکش اور مسرت ہو رہے تھے کہ دوران گفتگو میں نے پوچھ ہی لیا۔ اور اسی لیے پوچھ لیا کہ اتنی سرستی اور بے خودی تو نشے کی کسی بند بوتل کو کھول کر ایک ہی سانس میں چڑھا جانے کے بعد ہی ممکن ہوتی ہے کہ۔ بزرگو آپ فُن ہو؟

بزرگوں نے پہلے تو میرے لاہوری محاورے ”فُن“ کی رمز نہ پائی اور جب میں نے ذرا کھول کر بیان کیا تو انہوں نے اپنی ہتھیلیوں کو تالیاں پیٹنے سے لمحہ بھر کے لیے فارغ کیا اور انہیں ریش مبارک پر پھیرتے ہوئے بولے ”نہیں تارڑ صاحب۔ اب تو نہیں۔ اب تو میں نے حج کر لیا ہے۔“

”اور جب آپ نے حج نہیں کیا تھا تو۔“

”رات گئی بات گئی۔“ حاجی بابا ہنس کر بولے۔ ”جوانی میں تو سب چلتا ہے۔ اب

تائب ہو چکا ہوں۔“

”تو بزرگو یہ بے حساب سرخوشی اور سرستی ابھی تک کیسے قائم ہے؟“

حسن کے کمرے میں قلم ختم ہو گئی تو وہ بانپتا ہوا میرے پاس آ کر بیٹھ گیا اور چونکہ وہ مقامی پانی نہیں پیتا تھا۔ اپنے معدے کا خیال رکھتا تھا اس لیے ہمہ وقت اپنے بیگ میں منرل واٹر کی ایک بوتل سنبھالے پھرتا تھا۔ کہنے لگا ”سرجی.. میں نے آج شام نوٹ کیا تھا کہ آپ خیموں کے نزدیک جوندی ہے، اس میں سے اپنی اوک بھر بھر کر پانی پی رہے تھے تو سرجی.. یہاں آلودگی بہت ہے۔ آپ کا پیٹ یقیناً خراب ہو جائے گا۔ اس لیے اس منرل واٹر کے چند گھونٹ بھر لیجیے۔“ میں نے بھر لیے۔

”سرجی اگر آپ اجازت دیں تو میں بھی اس اکھاڑے میں کود پڑوں اور بھالو ناچ کا مظاہرہ کروں؟“ یہ سلمان ہی ہو سکتا تھا۔

”کیسے؟“

”ایسے..“ اس نے پھر اپنے ہاتھ اونچے کر کے ہتھیلیاں نیچے کر دیں اور منہ کھول کر بھالوؤں کی مانند ہانپنے لگا۔

”نہیں..“ مجھے اپنی ہنسی ضبط کرنے میں بہت دشواری ہوئی.. سلمان اتنا فربہ نہ تھا جتنا کہ وہ اپنے آپ کا.. اپنی فربہی کا مذاق اڑاتا تھا۔

اور تب قادر میدان میں آیا.. پہلے میرے سامنے جھک جھک کر آداب بجالاتا، سلام کرتا آیا اور پھر کسی جنوبی ہندوستان کی رقاصہ کی مانند چلتا.. ہاتھ بلند کر کے گردن دائیں بائیں جھکاتا.. کمر مڑکا تا میدان میں آیا۔

قادر کے شیخ پر آنے پر بھی ایک مرتبہ پھر غدر برپا ہو گیا.. اس کے رقص کے انداز میں کبھی دھنکی مالا دکھائی دیتی اور کبھی وحیدہ رحمان کا رنگ نظر آتا.. اور کبھی تو وہ امراؤ جان ادا ہو جاتا.. جس نے آوارگی میں زمانے کی سیر کی تھی۔

”سرجی..“ سلمان نے چپکے سے اپنا ہنڈی کھول کر اس میں سے کچھ نوٹ برآمد کئے اور چپکے سے مجھے ہما دیئے۔ ”لاہوریوں کی عزت بے عزتی کا سوال ہے.. آپ بھی ذرا ویل دینی شروع کر دیں.. قادر پر کچھ نوٹ لگا دیں.. بہت ضروری ہے۔“

چونکہ نوٹ سلمان کے تھے، اس لیے میں بھی بے دریغ اٹھا اور اکھاڑے میں جا کر چند نوٹ حسب دستور قادر کے ناپتے قدموں میں ڈالے.. کچھ اس کے سر پر دارے اور بقیہ ہوا میں اچھال کر واپس ہونے کو تھا کہ شائی چو کی اس دھنکی مالا یعنی قادر نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

”یہ تو ایام جاہلیت میں جو شمار ہوئے تھے، ان کا اثر ابھی تک چلا آتا ہے۔“

میں نے نوٹ کیا کہ بابا فلاکت زدہ پر بھی نوٹ فچھا اور کئے جا رہے ہیں.. کبھی کوئی چاہنے والا ان پر نوٹ وار کے ہوا میں اچھالتا تھا اور کبھی کوئی سنجیدہ شوقین ان کے وصول کے نیچے چپکے سے کچھ رقم رکھ آتا تھا.. بابا فلاکت زدہ البتہ اپنی دیوانگی میں بھی ہوشیار تھے اور ان نوٹوں کو سمیٹ کر اپنی جیکٹ کی جیب میں اچھی طرح سنبھال لیتے تھے.. اور کسی ایک نوٹ کو بھی آگے پیچھے نہیں ہونے دیتے تھے۔

بابا اُم کلثوم عام طور پر ہلتی لوک گیت گا کر دوا وصول کرتے تھے لیکن کبھی کبھی کوئی چالو فلمی گیت شروع کر کے اسے ہلتی کاری مکس بنا دیتے تھے.. جیسے ”جن میرے کھاناں“ کا اپنے حساب کتاب سے ری مکس کر لیا گیا ہے.. چنانچہ ایک گیت.. آپ یقین کریں یا نہ کریں.. ”بچو بادرا“ کا ”بچپن کی محبت کو دل سے نہ جدا کرنا“ سے شروع ہوا اور اس کے بعد اس کا ہلتی ترجمہ پیش کیا جانے لگا۔ پھر جانے کہاں سے ”ویر میرا گھوڑی چڑھیا“ آ گیا اور ویر صاحب اور جس گھوڑی پر وہ چڑھے تھے ہلتی زبان میں منتقل ہو گئے.. دھن وہی جاری رہتی لیکن زبان بدل جاتی.. ”شہباز قلندر“ کی بھی باری آئی اور وہ بھی بلتستان میں دھمال ڈالنے لگے۔

میں نے پائو میں رہنماں کا ”وے میں چورنی چورنی“ کا ہلتی ری مکس بھی سنا تھا.. بابا فلاکت زدہ کہیں بلند پہاڑوں میں.. کہیں شائی ٹو میں ایک پاپ سار تھے.. لیکن یہ حقیقت تھی کہ بابا فلاکت زدہ ایک اُن پڑھ اور عام پہاڑی پورٹر ہونے کے باوجود ردھم میں تھے.. جزواں طلبہ نما چھوٹے چھوٹے دھولوں کو شہتوت کی ٹہنیوں سے جل ترنگ کی طرح بجاتے بے سُرے نہیں ہوتے تھے نہ صرف یہ کہ ان کی پٹھنی ہوئی جیکٹ کی جیبیں نوٹوں سے ٹھنسی پڑی تھیں بلکہ ان کی سوراخ زدہ اونٹنی ٹوپی میں بھی نوٹ اُڑے ہوئے تھے۔

ویسے.. یہ بھی حقیقت ہے کہ جیسے وہ مگن ہو کر ڈوب کر گاتے تھے، میں نے صرف پٹھانے خان کو اتنی موبت سے ”میرا عشق وی توں“ گاتے ہوئے دیکھا تھا۔

حسن صاحب دھڑا دھڑا تصویریں اُتار رہے تھے۔

سلمان ایک بھدی سی اونٹنی ٹوپی میں تالیاں بجا رہا تھا۔

اور میاں صاحب نے اپنی آنکھ مووی کیمرے کے ویو فائنڈر سے ایک لمحے کے لیے بھی جھانک لی تھی۔

”تارڑ صاحب.. رُک جائیں۔“

اب میں وہاں رُکا ہوں تو حسن اور سلمان بھی میری مدد کے لیے میدان میں آ گئے اور اپنی اپنی اوقات کے مطابق.. ایک بڑے ڈھول کی تال پر.. ایک بھری کی نے پر.. بابا فلاکت زدہ کی تانوں پر.. اور اس کے جڑواں ڈھولوں کی روحم پر.. جنھو نے گئے..

ہم تینوں کا استقبال.. قادر اور بابا فلاکت زدہ کی میدان میں آمد سے کم نہ تھا.. یوں نعرے لگائے گئے.. تالیوں کا شور اُٹھا جیسے ہم سب مہاراج کھٹک ہوں.. حالانکہ مجھ میں رقص کی کوئی رقم باقی نہ تھی.. چالیس برس پیشتر جو ایسے قدموں میں اعتدال تھا وہ مضحل ہو چکا تھا.. اور میرا موجودہ وجود چند قدم اٹھانے سے بے وجود ہو جاتا تھا اور ہاپنے لگتا تھا..

حسن صاحب ہاتھ فضا میں بلند کئے ایک چترالی ٹوپی میں.. کسی ایسی انجانی روحم پر رقص کرتے تھے جو کہیں اور تو نہیں شاید کرن گھمراہور میں کہیں راج تھی اور سلمان.. جوانی کے شمار میں تھا.. یہ شمار ہی دنیا کی سب سے بڑی روحم تھا.. اس عمر میں تو جو قدم اٹھتا ہے گرم خون کی گردش میں آیا ہوا سر میں اٹھتا ہے.. اور یوں بھی وہ اس ٹریک پر آنے سے چند روز پیشتر نکاح شدہ ہوا تھا اور ایک منکوحہ روحم میں رقص کرتا تھا.. اس نے ناچتے ناچتے میرے قریب ہو کر کہا.. ”سرجی میں بھالو بن کر دکھاؤں؟“ میں اور سلمان تو اپنی ڈیوٹی دے کر فوراً ہی واپس آ گئے.. اور ہاں مجھ پر بھی کچھ نوٹ.. جو زیادہ تر قادر کی جیب میں سے برآمد ہوئے تھے، پنجاہ اور کئے گئے.. لیکن حسن صاحب اپنی سرمستی میں مست الست رہے اور ناچتے رہے..

اور وہ اس شب بابا فلاکت زدہ کے ہمراہ سارا آف وی ایوننگ تھے.. ان کی چترالی ٹوپی میں سوسو کے متعدد نوٹ بہا کر دکھا رہے تھے اور یہ ان کے متعدد مداحین نے ناچتے ہوئے ان کی ٹوپی میں اُڑ سے تھے..

بابا فلاکت زدہ البتہ حسن کو قدرے ناپسند کر رہے تھے کیونکہ وہ ان کے ٹوٹوں میں شریک ہو گئے تھے..

اس لمحے مجھے ایک نادر خیال آیا.. کہ اگر کبھی ٹیم کی مالی حالت بالکل دگرگوں ہو جاتی ہے.. کیش کم ہو جاتا ہے تو ہم اس کیش کی کمی کو پورا کرنے کے لیے آسانی سے حسن صاحب کو نچا سکتے ہیں..

اس رات میں.. شانی چوکی اس رات میں.. ایک لمحہ آیا..

ایسا لمحہ جب یکدم میں اس منظر، اس مقام اور اس رات سے الگ ہو گیا.. آوازیں.. تالیاں.. ڈھول کی تھاپ.. بابا فلاکت زدہ کی آواز سب کے سب معدوم ہو گئے.. ایک مکمل لُپ کا سنا چھا گیا جس میں وہ شام.. بابا فلاکت زدہ اور پورٹ اور گائیڈ اور ہم سب تو تھے کوئی آواز نہ تھی.. جیسے ایک خاموش فلم چل رہی ہو.. اس سنائے میں.. میرا سنا ہوا.. میرا آس پاس خالی ہو گیا.. صرف میں تھا جو ایک بچہ پریشاں اس رات میں تھا اور خاموشی میں تھا.. اور اس چپ میں سے ایک آواز آئی ”تم کہاں ہو؟“

”پتہ نہیں..“

”تم شانی چو میں ہو..“

”ہاںگ چو میں؟“

”نہیں.. تم وہاں نہیں ہو جہاں پیکنگ کی پتلی تھی.. وارث شاہ کی پتلی پیکے دی تھی.. یہ تو ہوشے سے آگے ایک مقام ہے جس کا نام تمہیں یاد نہیں رہتا..“

”یہ اچھا ہے کہ مجھے مقام یاد نہیں رہتے.. صرف کیفیت یاد رہتی ہے.. اک گوند بے خودی کے دن رات میں کیا فرق پڑتا ہے کہ انسان کہاں ہے..“

”فرق تو پڑتا ہے.. آج شب جب تم خیمے میں اپنے پہلے دن کی مشقت کے بعد بے سُدھ پڑے تھے تو تمہارے خیمے کے پردے کے پار.. بالکل سامنے.. K₀ اور K₇ کی چوٹیاں جب غروب کی کرنوں میں زرد ہوتی تھیں تو تم بے سُدھ پڑے تھے اور تم نہیں جانتے تھے کہ ان چوٹیوں پر سونا پکھل رہا ہے..“

”میں اتنا بے سُدھ بھی نہیں تھا.. میں جانتا تھا کہ وہاں جھانجھریں اور بازو بند تخلیق ہو رہے ہیں.. میرے اندر بھی تو ایک سونے کی شہزادی تھی جو کبھی پکھلتی تھی اور کبھی شاہ گوری کی برفوں کی مانند خمد ہو جاتی تھی.. میں اتنا بے سُدھ نہیں تھا..“

”سنو تم نصیب والے ہو کہ ابھی تک سُدھ بُدھ میں ہو.. تم شہر ابھی تک اتنی شگفتی ہے کہ تم شانی چو تک پہنچ جاتے ہو.. اپنے رب کا شکر ادا کرو..“

مجھ میں.. میرے بدن میں شکرانے کی ایک عجیب سنناہٹ نے جنم لیا اور پھر یکدم اس خاموش سنائے میں بے پناہ تالیوں اور ڈھول کی آواز نے ایک ایسی دراڑ ڈالی کہ میں پھر سے شب شانی چو میں تھا..

جہاں بابا فلاکت زدہ اپنے جڑواں ڈھولوں پر شہوت کی چھڑیوں سے ضرب دیتا گاتا تھا۔ منہ کھولے اپنے چند دانتوں والے منہ کو کھولے لگاتا تھا۔

اکثر شب تنہائی میں.. کچھ دیر پہلے نیند سے..

اکثر شب شائنی چو میں.. کچھ دیر پہلے نیند سے..

کچھ دیر پہلے نیند سے.. اس شب.. جیسے کے سکس اور کے سیون کی چونیاں میرے خیمے کے کھلے پردوں میں سے اندر آئیں اور میرے ساتھ میرے سلیپنگ بیگ میں سو گئیں.. ان کی برفیں میرے پہلو میں خوابیدہ ہو گئیں.. ان کے دامن میں جو بلند گھاس تھی جہاں موسیقی نہیں پہنچ سکتے تھے اور ایک جھیل تھی.. تو اس گھاس کی ہریا دل میرے تختوں میں آتی تھی اور جھیل کے پانی مجھے بھگوتے تھے.. گیلا کرتے تھے.. برفیں، گھاس، پانی.. مجھے بلندی کی ایک لوری سنانے لگے..

کچھ دیر پہلے نیند سے..

اور کچھ دیر بعد میں نیند میں چلا گیا..

”شائنی چو سے آگے جہاں اور بھی ہیں..“

شائنی چو گندو گورو گلیشیر کے دامن میں آباد تھا..

جیسے کورونون بیا فو گلیشیر کے اختتام پر.. ندیوں، ریت اور ٹھکنے درختوں میں روپوش تھا.. ہم شائنی چو سے اٹھے اور ظاہر ہے صبح سویرے اٹھے اور پھر ناشتے کے بعد اٹھے اور گندو گورو کا جو بلند جھاڑیوں اور درختوں سے ڈھکا کنارہ تھا اس پر اٹھنے لگے..

مجھے شائنی چو تو یاد ہو گیا تھا لیکن اب یہ یاد نہیں ہو رہا تھا کہ اگلے پڑاؤ کا کیا نام ہے.. دل شک پایا دار جیلنگ شاسم کا کوئی مقام تھا جہاں ہمیں شام تک پہنچنا تھا..

گلیشیر کے کنارے تک پہنچے تو شائنی چو نیچے رہ گیا تھا کہ ہم اُس سے کہیں بلند ہو چکے تھے.. سامنے جو پہاڑ تھا اس پر وہ دو پاک ابھی تک دکھائی دے رہے تھے.. پتہ نہیں سوئے ہوئے تھے یا جاگ رہے تھے..

پہلا دھچکا تو ہمیں عوشتے میں لگا جب ہم نے اُس اپنے تئیں دور افتادہ اور سوئے ہوئے گاؤں کو یوں جاگتے ہوئے پایا کہ اس کی خیمہ گاہیں غیر ملکوں سے چھلکی پڑتی تھیں..

دوسرا دھچکا شائنی چو میں لگا جہاں ایک دنیا آباد تھی..

اور تیسرا.. اور یہ آخری نہیں تھا ہمیں گندو گورو کے کناروں پر چڑھتے درختوں اور جھاڑیوں میں جو راستہ تھا اس پر چلتے ہوئے لگا..

ہم تو یہی سمجھتے تھے ناں کہ شائنی چو سے نکلتے ہیں تو اب ایک نا دیدہ اور اجنبی جہان کے اندر جا رہے ہیں.. ایک ایسی بلند ویرانی میں جہاں کسی اور ذی روح کے قدم کہاں پہنچے ہوں گے.. اس کی ان چھوٹی تنہائی میں صرف ہم ہی ہم ہوں گے اور ہمارے ارد گرد جو برف اونچائیاں..

سے ایک خشک ہو چکے نالے کے پتھر پورے علاقے میں پھیلے تھے۔

چند پتھر پٹے گھر بھی دکھائی دے رہے تھے۔

دراصل یہ گندوگورو تھا۔

کیسے تھا؟

گندوگورو کا دروازہ تو ابھی دو روز کی مسافت پر تھا تو یہ گندوگورو کہاں سے آ گیا۔

یہ ایسے تھا کہ گئے زمانوں میں.. یہ میدان اور چراگاہ ہی گندوگورو کہلاتے تھے اور یہاں سے اوپر دو دن کی مسافت پر جو ایک دروازہ تھا، اس کا کوئی نام نہ تھا کہ وہ شمال کے دروں میں کوئی زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا۔

اور جب وہ دروازہ اہم ہو گیا تو اس کا نام اس چراگاہ کے حوالے سے گندوگورو رکھ دیا گیا۔ اس لیے یہی اصلی اور بڑا گندوگورو تھا جسے میں نے بمشکل ملے کیا کیونکہ یہاں کوئی سایہ نہ تھا۔ کڑی دھوپ کا سفر تھا اور یہ میدان ختم ہونے میں نہ آتا تھا۔

کل ہوشے سے شائی ٹیپنگ کے سفر میں مجھے زیادہ دشواری نہیں ہوئی تھی کیونکہ راستہ تقریباً ہموار تھا اور ہر صبح ماڈل ناؤن پارک کے ٹریک پر چھ کلومیٹر چلنا میرا معمول تھا۔ لیکن آج شروع سے ہی چڑھائی کا سامنا ہو گیا اور چند قدم اٹھانے کے بعد ہی میرا بولورام ہو گیا۔ ظاہر ہے ایک بنیاد پرست مسلمان ہونے کے ناطے سے میں یہ نہیں جانتا تھا کہ رام کیسے بولتا ہے۔ جیسے بھی بولتا تھا بس ویسے ہی بولتا ہوگا جیسے چڑھائی چڑھتے ہوئے آس پاس کہیں بولتا تھا۔

میں اپنی حیاتی کے اس برس میں.. جو پچھلے برس سے ایک برس زیادہ تھا۔ اور میں اس پچھلے ایک برس میں کچھ مزید زوال پذیر ہوا تھا۔ مجھ میں بہت کم ہوتی تھی اور چہرے پر کم از کم ایک جھری کا اضافہ ہوا تھا تو میں اپنے اندر ایک جھک رکھتا تھا کہ کیا پتہ یہی وہ آخری برس ہو جب مجھ سے بہت چھن جائے۔ میں ایک ایسا قدم اٹھاؤں جو اٹھ نہ سکے اور میری کوہ نور دیوں کا اختتام ہو جائے۔ لیکن اس برس بھی کہیں نہ کہیں وہ بہت موجود تھی.. میں اسے بہت مرادوں تو نہیں کہوں گا کیونکہ مرادگی کے محض چند برس ہوتے ہیں، اس کے بعد پشیمانی شروع ہو جاتی ہے۔

اگرچہ چڑھائی چڑھتے ہوئے بولورام ہو گیا تھا لیکن اب وہ رام خاموش تھا اور مجھے چلنے میں دقت نہیں ہو رہی تھی۔

ابستہ میاں صاحب کے غٹھے میں موج آگئی تھی اور وہ اس پر ایک پٹی باندھ کر قدرے

ندیاں، جھرنے اور پتھر ہوں گے وہ ہمارے اعزاز میں جھک جھک جائیں گے۔ ندی نالے ختم جائیں گے اور کہیں گے۔ جھینک یو تارڑی۔ آپ نے یہاں قدم رنجہ فرمایا، ہم اتنی مدت سے آپ ہی کے منتظر تھے۔ اور یہ تیسرا دھچکا یوں لگا کہ اوپر سے درجنوں نہیں بلکہ سینکڑوں غیر ملکی کوہ نور دھڑ دھڑ اترتے آتے تھے۔ ایک بے قابو یوز کی مانند یلغار کرتے آتے چلے جاتے تھے۔ ہمیں ان کو راستہ دینے کے لیے رکنا پڑتا اور نہ وہ ہمیں روند کر اتر جاتے۔ پہلے پہل تو ہم بے حد خوش مزاجی سے انہیں گڈ مارنگ وغیرہ کہتے لیکن ان میں سے اکثر ہمیں لٹ نہ کرواتے اور ہمیں راستے کے پتھر جان کر پھلا گتے جاتے۔ کوئی ایک آدھ نمونہ ایسا ہوتا جو جواب میں گڈ مارنگ وغیرہ بولتا دیتا ایسے جیسے ہم پر احسان کر رہا ہو۔ وہ ہمیں باقاعدہ دھکیلے ہوئے گزر جاتے۔

ان گورالوگوں نے ہماری انا کو شدید طور پر مجروح کیا۔

وطن ہمارا تھا اور دندناتے یہ پھرتے تھے۔

یہ سایہ دار راستہ اختتام کو پہنچا تو آگے ایک پتھروں سے بھرا میدان تھا۔ گندوگورو گلشیئر کے دامن میں.. گلشیئر اب نظر نہیں آتا تھا کیونکہ ہم اس کے دامن میں تھے۔ بلکہ میں اس کے دامن میں تھا کیونکہ غیر ملکی کوہ نور دوں کی یلغار نے ہمارے ڈسپلن کا ستیاناس کر دیا تھا اور ہم تتر بتر ہو چکے تھے۔ برمانی کا بے مہار شتر پورٹروں کے ہمراہ کہیں آگے جا چکا تھا اور جب میں نے اسے ایک بار ٹوکا تھا کہ وہ ذرا آہستہ خرام ہو جائے اور بقیہ ہم کے ہمراہ خراماں خراماں چلے تو اس نے اپنے دفاع میں یہ دلیل دی تھی کہ ”ہارڈ صاحب یہ میری قدرتی چال ہے۔ اگر میں اپنے آپ کو روک کر چلتا ہوں، بریکیں لگا کر چلتا ہوں تو پھر میں یکدم ڈھے جاؤں گا۔ مجھے یونہی بے مہار چلنے کی اجازت دیجیے۔“

”اجازت ہے۔“ میں نے مغل اعظم کے انداز میں ایک گہری گونج دار آواز بناتے ہوئے کہا تھا۔

پہاڑوں میں.. کہیں بلند پہاڑوں میں وہاں جانا جس کا نام آپ جانتے ہوں.. مشکل ہوتا ہے۔

اور پہاڑوں میں وہاں جانا جس کا نام آپ نہ جانتے ہوں، بہت مشکل ہوتا ہے۔ پتھروں کے انبار پھلا گتے کے بعد ایک بہت وسیع میدان سامنے آیا۔ ریتلا اور خشک.. کہیں کہیں نوکھ چکی ندیوں کی گزرگاہیں تھیں۔ دائیں ہاتھ پر کچھ فاصلے پر جو چٹانیں تھیں، ان کی آغوش میں

آہستگی سے چلتے تھے۔

میاں صاحب نے صرف پچھلی شب شاید کو اپنے خیمے سے بے دخل کر دیا تھا بلکہ پوری ٹیم کے سمجھانے کے باوجود وہ اپنے سستے سے جوگرز تبدیل کرنے پر رضامند نہ ہوئے تھے جو انہوں نے دس برس جوشر کے ٹورٹیک کے لیے خرید کئے تھے۔ یا شاید اس سے پہلے خرید کئے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ جوگر جن کے تنگ کس چکے تھے اور جن کی شکل پر مردہ چوہوں جیسی ہو چکی تھیں۔ یہ جوگر جوگر نہیں رہے تھے بلکہ ان کے پاؤں ہو چکے تھے جن کے ساتھ وہ پاک سرائے اور یہاں تک کہ سنولیک ٹریک کے دوران بھی سرخرو ہوئے تھے۔ اس لیے اس بچہ ٹریک کی ان کے سامنے کیا حیثیت تھی۔

ویسے یہ حقیقت ہے کہ وہ ان جوگرز میں نہ کبھی پھسلے نہ گرے اور ہمیشہ بہت اچھا چلے۔ ہم میں سے جو لوگ نہایت قیمتی اور امپورٹڈ ایڈی ڈاس اور ٹانگے وغیرہ میں چلتے تھے، ان سے کہیں بہتر چلے۔

شنید تھی کہ وہ بھائی گیٹ کے کسی ایکسپرت موچی سے ان جوگرز کی تجدید کر داتے رہتے تھے۔ بلکہ شاید صاحب کا بیان تھا کہ اور پچھلے جوگر تو کب کے غائب ہو چکے تھے اور میاں صاحب اب جوگرز کے نام پر جو کچھ بھی پہنتے تھے، وہ بھائی گیٹ کے موچیوں کا کمال تھا۔

عامر کے نو کا وزن پہلے سے بڑھ چکا تھا۔ ایک آسودہ اور آرام طلب صنعتی زندگی کی آسائش کے بعد وہ اتنے برسوں کے بعد پہاڑوں میں آیا تھا تو اسے چلنے میں کچھ دشواری پیش آرہی تھی جسے وہ اپنی جوانی کے زور سے زیر کرتا چلتا جاتا تھا۔ اور حسن صاحب کا کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ چل بھی رہے ہیں یا نہیں۔ وہ ایک عجیب رو بوٹ انداز میں وانگ وانگ کیٹے ٹھپ ٹھپ چلتے جاتے تھے اور کہیں نہ کہیں پہنچ جاتے تھے۔

شاہد کی حالت بھی وگرگوں تھی لیکن وہ حسب عادت نہ ماننا تھا نہ اقرار کرتا تھا اور اکیلا چلتا جاتا تھا۔ اپنے آپ میں غم۔ اپنے آپ کو دوسروں سے پوشیدہ رکھتا ہوا۔ تنہا چلتا جاتا تھا۔ اور میں۔ اب اکیلا چل رہا تھا۔

چل کیا رہا تھا۔ ایک اپانچ کی مانند اپنے آپ کو گھینٹا آگے آگے ہوتا جاتا تھا کہ اب سورج تباہ کرتا تھا۔ پیاس فز کرتی تھی۔ پسینہ بہتے بہتے بدن کو خالی کرتا تھا۔ اور بلندی اپنا اثر دکھاتی تھی، سانس نہیں لینے دیتی تھی۔

ہائیں ہاتھ پر ایک بلند کنارے کے نیچے گندوگور و تھا۔ برف ہی برف تھی لیکن وہاں سے کوئی سرو سندی نہیں آتا تھا اور دائیں ہاتھ پر میدان کے پار چٹانی بلندیاں تھیں جو دھوپ میں بہت ہی برہنہ اور بے حیا لگ رہی تھیں۔ میری دائر بول میں نمکول ملا پانی کم ہو رہا تھا۔

نیچے ہمارے میدانوں میں یہ معتمد کسی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنی بلندی پر برفوں اور اونچائیوں پر اتنی تیز دھوپ کیسے ہو سکتی ہے کہ وہ جلا ڈالے یا بدن خشک کر کے مار ڈالے۔ جیسے آپ ایک صحرا میں ہوں۔

لیکن بلندی کی دھوپ صحرائی دھوپ سے کہیں بڑھ کر جان لیوا ثابت ہوتی ہے۔ ہوا کی بارش کی۔ آکسیجن کی کمی اور الٹرا وائلٹ شعاعیں آپ کے بدن میں سے نمی کا آخری قطرہ بھی خشک کر دیتی ہیں۔

چنانچہ آپ اپنا سر لیٹ کر چلتے ہیں۔ نمکول ملے پانی کے گھونٹ بھرتے جاتے ہیں۔ میں چلتا جاتا تھا۔

اور ایک مقام پر اس بلندی اور دھوپ نے مجھ پر کچھ اثر کیا اور مجھے خدشہ ہوا کہ نہ تو کوئی میرے پیچھے آ رہا ہے اور نہ کوئی مجھ سے آگے نکل گیا ہے اور میں بالکل تنہا ہوں۔ ایک وسیع دھوپ بھرے ویرانے میں۔

گورا لوگوں کے جو غول اوپر سے اترتے تھے، وہ سویرے سویرے اتر چکے تھے اور اب آگے کوئی ذی روح نہ تھا۔ بس ایک بڑی تنہائی تھی۔

ان کو کیا خاطر میں لائیں گے۔

لیکن جب میں اس آہ وزاری کے منہ کے قریب ہوا ہوں۔ چلتا ہوا ایک بلند کنارے پر چاہنچتا ہوں تو اس تنہائی اور بلندی پر نیچے کیا دیکھتا ہوں کہ ایک نہایت پر خشونت اور پر وحشت نالہ جھاگ اڑاتا ہے اور جھاگ بھی اس کی باجھوں سے بہتی ہے کہ وہ پاگل ہے۔ اس پاس کوئی نہ تھا۔

کچھ آگے نکل گئے تھے اور کچھ پیچھے رو گئے تھے۔

میں اور یہ آبی آفت آنے سامنے تھے۔

میں بلند کنارے سے نیچے اتر کر اس کے آبی شور کے قریب ہوا تو وہ کان بہرے کرتا تھا۔ میں اسے بہت دیر تک ایک مبہوت حالت میں بکتا رہا کہ اسے کہاں سے اور کیسے پار کروں۔ نہیں یہاں سے نہیں۔ یہاں یہ اپنے پورے زور میں ہے۔ پانیوں میں سے کوئی ایک پتھر بھی نہیں ابھرتا جس پر پاؤں رکھ کر پار جایا جاسکے۔ یہاں سے نہیں تو اس کے بہاؤ کے نیچے جا کر چپک کریں کہ وہاں کوئی ایسا مقام ہو جہاں سے سیاں جی بخیریت پار اتر سکیں۔

میں بہت نیچے تک گیا لیکن اترائی پر تو اس کا زور بڑھتا جاتا تھا۔

میں پھر اوپر اس جگہ پر واپس آ گیا۔

بہت ہی غور و فکر کے بعد ایک مقام مناسب لگا۔ یہاں نالے کے کنارے سے کچھ پرے پانیوں میں ایک پتھر ابھرا ہوا تھا۔ اگر انسان اس پر جا کھڑا ہو تو وہاں سے کچھ فاصلے پر ایک اور ترچھا سا پتھر پانی میں سے کبھی کبھار نمودار ہوتا تھا تو اس پر چھلانگ لگا دی جائے۔ اور اگر نہ پھسلا جائے تو۔ اگر پھسلا جائے تو لاہور واپسی کھنائی میں پڑ سکتی تھی کہ اس نالے کے پانی سیدھے گند و گور کی برفوں میں جا گم ہوتے تھے۔

میں ایک مرتبہ پھر نہ صرف اس پہاڑی نالے کا بلکہ کسی بھی ایسے بدترندیب نالے کا محل وقوع گوش گزار کرنا چاہوں گا۔

یہ نالہ کبھی بھی دور سے دکھائی نہیں دیتا۔ قریب ہونے پر سنائی دیتا ہے کہ ہمیشہ گہرائی میں ہوتا ہے۔ اونچے کناروں کے درمیان بہتا ہے۔ چنانچہ آپ اپنے راستے پر پھٹتے ہوئے اس کے کنارے پر آتے ہیں اور پھر آہستہ آہستہ اپنے آپ کو سنبھالتے۔ اپنے جوگر بہاتے نیچے

”کچھ دیر بعد مٹی آگئی۔۔۔ اور مجھے پار لے گئی“

اور اس تنہائی اور دھوپ کی یکسانیت سے جب میں اکٹا چکا تھا تب ایک نالے کا شور میرے کانوں میں اُترا۔

جو مکمل سکوت میرے آس پاس خیمہ زن تھا اس میں کسی آبی گزرگاہ کی روانی کا شور سنائی دینے لگا۔

میرے کان ایسے شور کے عادی تھے اور فوری طور پر چوکتے ہو جاتے تھے کہ شور سے قطعی طور پر اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ آگے درگتھ کی مرگ صداؤں والی ندیاں ہیں یا کوئی معصوم سا در بانالہ ہے جس کے پار جانا۔ بچوں کا کھیل ہے، بہر طور ایسا آبی شور ایک مرتبہ تو آپ کے قدموں سے زمین نکال دیتا ہے اور پھر وہی رام بولنے لگتا ہے۔

لیکن میں نا حق ڈر کے سننے میں آ گیا تھا۔ آگے۔ ایک بلند کنارے کے نیچے جو نالہ شور و غوغا کرتا تھا، نہایت ناتواں تھا۔ اس کے پانیوں میں بہت سے ایسے پتھر تھے جن پر قدم رکھتے ہوئے آپ آسانی سے پار اتر جاتے تھے۔

چنانچہ میں آسانی سے پار اتر گیا۔

ابھی کچھ دور اور چلا ہوں۔ اور اپنے بچے کچھے سانس سمیٹتا ہوا۔ تنہا چلا ہوں تو پھر میرے کانوں میں ایک نالے کی آہ وزاری بلند ہونے لگی۔

درگتھ کی ندیوں کے بعد مجھے کسی اور ندی نالے کا خوف نہیں رہا تھا۔ بقیہ نالے تو نومو لو د بچہ لوگ تھے۔

پہل صراط پر سے گزر جانے والے نالہ چلکھو یا کوہ سلمان کی راکھی ندی پر جو پل ہیں،

والدین انہیں لے جا چکے ہیں اور صرف وہ باقی رہ گیا ہے۔ گلے میں بستہ ڈالے آبدیدہ ہونے کو ہے کہ جانے میری مٹی مجھے لینے کب آئے گی۔

کچھ دیر بعد مٹی آگئی۔

یہ مٹی ایک پورٹری صورت میں سامنے کے کنارے سے نیچے اترتی۔ اس پورٹری نے نالے کے کنارے پر پہنچ کر پانیوں کا ایک جائزہ لیا۔ یہ جانچا کہ اسے کہاں سے عبور کیا جاسکتا ہے اور پھر وہ بھی اسی مقام پر پہنچا جہاں میں کچھ دیر کھڑا رہنے کے بعد پسپا ہو گیا تھا۔ اس نے ان دونوں پتھروں کو پیل بنا کر ایک چھلانگ لگائی اور پھر میرے پاس لینڈ کر گیا۔ ذرا سنبھلا۔ مجھے ایک نظر دیکھا اور سلام دعا کئے بغیر کنارے پر چڑھنے لگا۔ یکدم مجھے خیال آیا کہ یہی تو وہ اتفاقی مٹی ہے جو مجھے گھر لے جاسکتی ہے۔ ”ہیلو۔۔ اوئے بھائی۔۔ بھائی جی ذرا سنئے۔“

وہ رُک گیا۔

میں نے اشارے سے اسے پھر سے نیچے آنے کو کہا۔

وہ آ گیا۔

”بھائی ذرا امداد کرو۔ ہم ذرا ڈرپوک اور موٹا ہے۔ نالے کے پار جانا ہے۔“

”آپ پاکستانی ہوں؟“ وہ ذرا حیرت زدہ ہوا۔

”آہو۔۔ یار امداد کرو۔ ہم فریاد کرتا ہے۔“

شمال میں فریاد کرنے کا مطلب ہے کہ ہم تمہارے پاؤں پڑتا ہے۔ منت سماجت کرتا ہے۔

”پاکستانی ہو تو ادھر کیسے آ گیا۔ ادھر تو صرف گورالوگ آتا ہے۔“

”یار غلطی سے۔۔ پھر نہیں آئے گا۔“

اب وہ پھر سے پانیوں کو پھلانگتا دوسری جانب چلا گیا اور اس پتھر پر کھڑا ہو گیا جو میری پہنچ سے باہر تھا۔ اور ہاتھ آگے کر کے کہنے لگا۔ ”آ جاؤ۔“

میں پھر اسی پتھر پر کھڑا تھا اور اس نے اپنا ہاتھ میری جانب بڑھا رکھا تھا لیکن میں نے جو ہاتھ بڑھایا وہ اس کے ہاتھ سے ایک فٹ کے فاصلے پر رہ گیا۔ اور اس ایک فٹ کی دراڑ کے نیچے نالے کے پانی منہ کھولے جھاگ اڑاتے تھے۔

”نہیں یار! میں نہیں آ سکتا۔“

اُترتے ہیں اور اس کے پانیوں تک پہنچتے ہیں تو دنیا جہان سے کٹ جاتے ہیں۔ کیونکہ آپ ایک کنارے سے نیچے گہرائی میں آتے ہیں اور نالے کے پار بھی ایک کنارہ بلند ہو رہا ہے اور آپ ان دونوں کناروں کے درمیان ایک پاتال میں حیران، پریشان اور جنگل بیابان میں کھڑے ہیں اور صرف پانیوں کا پاگل جھاگ اڑاتا شور ہے اور ان میں گڑگڑاتے بہتے پتھروں کی گونج ہے۔ پانیوں کی نمی ہے جو ہوا میں شامل ہے اور آپ کے چہرے کو بھگوتی مرگ بو سے دیتی ہے۔ اور اس کیفیت میں اگر آپ بالکل تنہا ہیں تو سونے پر سہاگہ ہو جاتا ہے۔

اور اس عمر میں میرا سونا جو ہتھیل کا ہو چکا تھا اس پر بھی سہاگہ ہو رہا تھا۔

چنانچہ میں نے قدم بڑھا کر اپنے آپ کو اس پتھر پر کھڑا کیا جس کے آگے نالے کا ایک تند اور منہ زور حصہ جھاگ اڑاتا تھا اور اس کے پار اس پتھر کو تادیر غور سے دیکھا جس پر مجھے چھلانگ لگا کر پہنچنا تھا اور وہ پتھر کبھی زیرِ آب چلا جاتا تھا اور کبھی اس کی گیلیا بہت سورج کی کرنوں سے چمکتی تھی۔ اس پتھر کا زاویہ ایسا تھا، اس پر لینڈ کرنے والا جو گر آسانی سے پھسل سکتا تھا۔

میں نے بہت حساب کتاب کیا۔ ناپ تول کیا کہ اگر میں جست بھرتا ہوں تو کیا اس پتھر تک جا بھی سکتا ہوں یا نہیں۔ اگر جا سکتا ہوں تو پھسلنے کے کیا امکانات ہیں۔ کافی دیر غور و خوض کرنے کے بعد فیصلہ ہوا کہ نہیں بھائی جان تمہارے پھسلنے کے امکانات بہر طور ہیں۔ اگر پھسل کر نالے میں گرتے ہو تو خود سے تو اٹھنے اور باہر آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور اس مکمل تنہائی میں آس پاس کوئی بچانے والا بھی نہیں تو بہتر یہی ہے کہ بے شک بقیہ عمر اس کنارے پر گزار دو لیکن یہ رسک نہ لو۔ جب تک کہ کوئی ساتھی پیچھے سے نہیں آ جاتا۔ اور ساتھی بہت پیچھے تھے اور سورج کی تمازت میرے بدن کو پسینے سے بھگوتی تھی اور اس پسینے میں کبھی کبھار نالے کا سرد چھینٹا پڑتا تھا۔

میں نے اپنی دائرہ بوتل میں سے ایک اور گھونٹ بھرا۔ وہی بوتل جو شانہ سلوک یا سیر کے سکولوں کے دنوں کی یادگار تھی۔ ایک گھونٹ بھرا اور ایک پتھر پر بیٹھ کر امدادی پارٹی کا انتظار کرنے لگا۔

میں بہت دیر بیٹھا رہا۔

اس نالے کی شوکتی شور شرابے والی تنہائی میں دنیا سے کتنا ہوا ایک ایسے بچے کی مانند اداس اداس اور بے بس بیٹھا رہا جس کے سکول میں کب سے چھٹی ہو چکی ہے۔ دیگر تمام بچوں کے

”آسان ہے آ جاؤ.. ہم کچھ لے گا.. آ جاؤ..“

”اور اگر گر گیا تو..“

”وہ تو اللہ کا مرضی ہے..“

میں پھر سے حساب کتاب لگانے لگا کہ کیا کروں.. چھلانگ لگاؤں یا نہ لگاؤں.. اگر اس کا ہاتھ میرے ہاتھ کی گرفت میں نہیں آتا تو کیا یہ اتنا قی اور عارضی می مجھے ہالے کے پانیوں میں سے نکال لے گی..

قطعی طور پر نہیں نکال لے گی، چاہے یہ می مجھ سے کتنی ہی محبت کیوں نہ کرتی ہو کیونکہ میں تو پیل دوپیل میں کہیں کا کہیں بہہ جاؤں گا.. گندو گور و گیشیر میں اتر جاؤں گا.. میں تو دریا ہوں، سمندر میں اتر جاؤں گا..

اس حساب کتاب اور غور و غوض کے دوران ایک مسئلہ ہو گیا کہ اس پتھر پر کھڑے کھڑے ہالے کی دہشت اور چٹکناڑ کے خوف سے میری ٹانگیں لرزنے لگیں.. میرے قابو میں نہ رہیں.. اب اگر میں فوری طور پر چھلانگ نہیں لگاتا تو آٹو میٹک طور پر یوں بھی ڈھے کہ غرق نہ ہو جاتا ہوں چنانچہ میں نے مجبوراً چھلانگ لگا دی.. لیکن اللہ اللہ کرتے ہوئے..

شمالی علاقوں میں کوہ نور دی کا ایک روحانی پہلو یہ بھی ہے کہ اللہ اللہ کرنے کے مواقع اکثر پیشتر ملتے رہتے ہیں اور انسان پارسا ہو جاتا ہے لیکن صرف چند لمحوں کے لیے.. وہ لمحے گزر جاتے ہیں تو پھر سے رند ہو جاتا ہے کہ یہی حضرت انسان کی خصلت ہے..

بہر حال یہ عارضی پارسائی میرے کام آئی اور دوسرے پتھر پر کھڑے پورٹر کا ہاتھ میرے ہاتھ میں آ گیا.. میرے جو گر کیلے پتھر پر اگرچہ پھسلے اور یہ ثابت ہو گیا کہ اگر میں اپنی بہادری کے زعم میں یہاں خود سے چھلانگ لگا دیتا تو منزل ما.. دور نیست تھی.. پورٹر می میری ڈرپوکی سے اتنا ہیزار ہو چکا تھا اور اسے آج ہی شمالی پونجی پانچنا تھا کہ اس نے مجھے شکر گزار ہونے کا موقع بھی نہ دیا اور فوراً عازم سفر ہو گیا..

”موت چٹانوں کی صورت ہمارے سروں پر معلق تھی“

میں بھی دوسرے کنارے پر چڑھ کر اوپر گیا اور چند منٹ کے لیے ہی عازم سفر ہوا تھا کہ میں نے سامنے ایک بڑے پتھر کی اوٹ میں چند جھاڑیوں کے ناکافی سائے میں ایک شکر دوپہر میں اپنے سامان کو بکھرا دیکھا.. پورٹروں کو بے سندھ سوتے دیکھا اور ان میں ایک پتھر سے ٹیک لگائے ہوئے برمانی کو بڑھی ہوئی دائرہ کھجالتے اور اس کے علاوہ بہت کچھ کھجالتے دیکھا.. یعنی ہم پر قیامت گزر گئی ہے اور یہ لوگ یہاں جنت کے مزے لوٹتے ہیں..

میں نے اپنی اس کوہ نور دی کے دوران پہلی بار اپنے بلند پریش کو وحشی ہو جانے دیا اور ان پر برس پڑا.. پہلے پورٹروں پر برسنا.. شمالی پونجی سے چلتے ہوئے میں نے سب کو بولا تھا کہ راستے میں جہاں کہیں بھی دشواری ہوگی آپ لوگوں نے ٹھہرنا ہے.. ہماری مدد کے لیے رکنہ ہے.. اگر راستے میں کوئی بڑا نالہ آتا ہے تو وہاں ہمارا انتظار کرنا ہے.. کیوں نہیں کیا؟“

پورٹروں میں ایک ایسا حسین تھا جسے بے شک پیسا ہو پھر بھی کبھی پانی نہیں دینا چاہیے تھا.. یہ ایسا حسین تھا.. یہ وہی حسین تھا جو ہوشے میں نہایت مسکین اور درخواست گزار تھا اور بے حد منت سماجت سے ہماری نیم میں شامل ہوا تھا.. کہ صاحب ہم تو پورٹر بھی ہوگا اور آپ کا باورچی بھی.. ہم کو ساتھ لے جاؤ.. ہم نے آپ کے لاہور میں چینی، جاپانی اور پاکستانی ریستورانوں میں باورچی کا کام کیا ہے.. آپ کو یہ سب کھانا کی ورائٹی کھلائے گا.. اور پورٹر بھی ہوگا، ہمیں ساتھ لے چلو..

لیکن یہاں وہ کوئی اور حسین تھا.. باقی ہو گیا تھا اور مجھے ایک طوطے کی چشم حقارت سے دیکھتا ہوا کلام کرتا تھا.. کیوں؟

صرف اس لیے کہ کاندے کا اسحاق بھی ہمارے ہمراہ تھا۔ یہ اسحاق شروع میں تو نہایت شوخا اور بدتمیز تھا۔ نہایت لچر گفتگو کرتا تھا اور بے حد فربہ ہوتا تھا۔ پھر میں نے اسے فوری طور پر فارغ کر کے ہوشے واپس بھیجنے کی دھمکی دے کر سیدھا کر لیا تھا۔ یہ اسحاق بھی کسی حد تک باورچی تھا۔ اور حسین جو کہ ہوشے کا تھا، اس کے لیے یہ ڈوب مرنے کا مقام تھا کہ اس کے بچن ٹینٹ میں کاندے کے کسی باورچی کا عمل دخل ہو۔ اس نے آج صبح یہ ڈیکھ کر دیا تھا کہ صاحب ایک تو آپ نے کل رات مجھے سوکھے چاول کھائے۔ اور یہ سوکھے چاول چکن پلاؤ تھا۔ اور دوسرے یہ اسحاق ادھر بچن ٹینٹ میں کیوں آتا ہے۔ تو میں نے ایک نہایت خوشامدانہ تقریر کی تھی کہ حسین بھائی میں تم سے معافی مانگتا ہوں کہ بچھلی شب تمہیں سوکھے چاول کھانے کو ملے۔ آئندہ تم پہلے کھاؤ گے اور پھر ہم۔ اور جہاں تک اسحاق کا سوال ہے تو یہ محض ایک پورٹر ہے۔ ٹیم کے سرکاری باورچی تم ہو لیکن اسے اپنے ساتھ مدد کے لیے رکھو تو کیا حرج ہے۔

حسین کو یہ بھی گوارا نہ تھا اور اس کی عزت نفس اتنی مجروح ہوئی تھی کہ مجھے کسی بھی پہاڑی نالے کے پانیوں میں بردہ ہوتے دیکھتا تو مسرت سے تالیاں بجاتا۔

تو یہی حسین۔ ایک مجروح اور آنکھیں بدل لینے والا حسین کہتا ہے۔ ”صاحب ہمارا کام بوجھ اٹھانا ہے۔ آپ کا پد کرنا نہیں ہے۔“ اور وہ بدستور ایک پتھر سے ٹیک لگائے مکمل بیگانگی سے بیٹھا رہا۔

میرا بلڈ پریشر تمام حدود عبور کر گیا اور مجھے حیرت ہے کہ اس لمحے میرے دماغ کی کوئی رگ کیوں نہ پھٹ گئی۔

میں نے اس لمحے یہ محسوس کیا کہ مجموعی طور پر کاندے کے پورٹرز زیادہ سادہ اور ہمدرد تھے جب کہ ہوشے سے جتنے بھی پورٹر بھرتی کئے گئے وہ قدرے لاپرواہ اور بیگانے تھے۔ کوہ نور دوں کی بے پناہ آمد نے ان کا دماغ خراب کر دیا تھا۔

”برمانی۔“ حسین پر جب کچھ اثر نہیں ہوا تو میں ڈاکٹر پر حملہ آور ہو گیا۔ ”تم ان پورٹروں کے ساتھ تھے۔ میرے منع کرنے کے باوجود قلائد نہیں بھرتے ہوئے آگے نکل گئے تھے تو تم نے اس نالے کے کنارے بقیہ ساتھیوں کا انتظار کیوں نہیں کیا۔“

برمانی پہلی بار مجھے اس حالت غضب میں دیکھ رہا تھا۔ ”سر۔ میں نے حسین کو کہا تھا کہ یہ نالہ خطرناک ہے۔ وہ لوگ مدد کے بغیر اس کو پار نہیں کر سکتے۔ تم یہاں ٹھہرو۔ لیکن یہ وہاں

نہیں ٹھہرے۔ کہتے تھے جب ٹیم ادھر تک آئے گی تو ہم پھر آ جائیں گے۔ اور یہ یہاں آ کر لیٹ گئے۔“

”اور پھر تم بھی بھول گئے کہ کچھ آلو کے پٹھے ابھی اس نالے پر اتریں گے اور اسے دیکھ کر اپنی جان کو روکیں گے کہ پار اتنا ممکن نہ ہوگا۔ یہ لوگ اگر یہاں آ کر لیٹ گئے تھے تو تم بھی کیوں لیٹ گئے تھے۔ تمہارا فرض تھا کہ تم وہاں رک کر ہمارا انتظار کرتے۔ ڈیم ایٹ برمانی میں مرتے مرتے بچا ہوں۔ اگر میری مٹی وہاں نہ آ جاتی تو میں ابھی تک یا تو دوسرے کنارے پر بیٹھا اپنی قسمت کو کوس رہا ہوتا یا ڈوب چکا ہوتا۔“

”آپ کی مٹی سر؟“ برمانی، ڈاکٹر تھا۔ جان گیا کہ میرا بلڈ پریشر کے ٹو سے بھی اونچا ہو چکا ہے۔ اور میرے دماغی غلیبوں میں کھلبلی مچ چکی ہے۔ ”میں آپ کو نبھوس پلاتا ہوں۔“

”تم موضوع بدلنے کی کوشش مت کرو برمانی۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ میں اس نالے کو ایک مٹی کے سہارے کے بغیر پار کر سکتا تھا۔“

”ہرگز نہیں تارڑ صاحب۔“

”تو پھر بیٹھے میرا منہ کیا دیکھتے ہو۔ پورٹروں کو ساتھ لے کر فوراً نالے کے نیچے پہنچو۔ بقیہ لوگ آتے ہی ہوں گے۔“

”ویسے تارڑ صاحب آپ نے کمال کر دیا۔ سب سے پہلے پہنچ گئے۔“

”میری خوشامد کرتے ہو؟“ میں نے چمک کر کہا۔ ”مجھے آلو کا پٹھا سمجھتے ہو؟“

”بالکل نہیں۔“

برمانی نے نہایت تحمل کا مظاہرہ کیا۔ اپنی بلوچ رگ کو ذرا بھر پھڑکنے نہ دیا اور پورٹروں کو ہانک کر نالے کی جانب چلا گیا۔

مجھے نکیر، خوشحال، امت اور صد پارہ کے علی جیسے پورٹر یاد آنے لگے جو بھائیوں کی طرح ہمارا خیال رکھتے تھے۔ کہیں کوئی راستہ ذرا خطرناک اٹھان رکھتا تھا تو ٹھہر جاتے تھے۔ کہ صاحب آئے گا تو اسے مشکل نہ ہو۔ کوئی نالہ آتا تھا تو مجھے اپنے جوگر اتارنے نہ دیتے تھے اور اپنے کندھوں پر اٹھا کر پار لے جاتے تھے۔ شام ہوتی تھی تو زبردستی بدن دہاتے ہماری تھکاوٹ اتارتے تھے اور پھر آلو کے گرد قفس کرتے گیت گاتے دوستوں سے بڑھ کر دوست ہو جاتے تھے۔ اور کسی بھی معاوضے یا لالچ سے برتر ہو کر۔ ایک نفیس اور شاندار انسان کی صورت میں۔

ہر کوہ نور کی مہم میں جو پورٹر ہائز کئے جاتے ہیں، ان میں بقول منیر نیازی کچھ ضیبت روئیں ہوتی ہیں اور کچھ طیب۔

پورٹروں میں بھی یہی دو قسمیں پائی جاتی ہیں۔

ابھی تک تو ہمیں ضیبت روئوں سے پالا پڑا تھا۔ لیکن دژہ گندوگورو کے بیس کیپ تک پہنچتے پہنچتے دو تین طیب پورٹر بھی ظاہر ہو گئے۔

جب میری بقیہ ٹیم۔۔۔ برمانی اور پورٹروں کی مدد سے نالے کے پار ہوئی اور وہ سب مجھ تک پہنچے تو میرا بلڈ پریشر کے نوے سے اتر کر میدانی علاقے کی سطح پر تو نہیں البتہ ناگہا پرست۔۔۔ جو دنیا کی نویں بلندی ترین چوٹی ہے۔ وہاں تک اتر چکا تھا۔

ہم نے بڑے پتھر کے سائے میں خوراک کے نام پر کچھ زہر مارا کیا اور کچھ دیر اوتگھتے ہوئے آرام کیا۔

اس بڑے پتھر کے برابر میں۔۔۔ یہ ایک بلند کنارہ تھا تو اس کے نیچے گندوگورو کا گلیشیر کروٹیں بدلتا تھا۔ اور اس کی برفوں سے جدا ہو کر جو پتھر پاتال میں گرتے تھے، ان کی آواز ہم تک پہنچتی تھی اور لگتا تھا کہ ہم ایک بڑبڑاتے ہوئے آتش فشاں کے دہانے پر بیٹھے ہیں۔۔۔ بلکہ اوتگھ رہے ہیں۔

وہاں سے چلے تو ذرا مشترکہ طور پر چلے۔ ایک دوسرے کو نظر میں رکھتے ہوئے چلے۔ شائی ٹیو سے چلتے ہوئے علی موسیٰ نے ہمیں اطلاع دی تھی۔ اور یہ وہی علی موسیٰ تھا جس نے ہمیں بدگمان اور بے ایمان کر کے گندوگورو کی بجائے کے سکس اور کے سیون کی بڑی بڑی گھاس اور جھیل کی جانب لے جانے کی کی کوشش کی تھی تو اسی ٹین ایچ پورٹر نے ہمیں اطلاع کی تھی کہ صاحب راستہ ویسے تو آسان ہے۔۔۔ آگے میدان ہے۔۔۔ صرف ایک تھوڑا چڑھائی آئے گا۔

چڑھائی آئے تو آجائے۔ ہم نے سوچا تھا۔ آخر کتنا چڑھائی ہوگا۔ کیا یہ نوخیز مرد ناداں نہیں جانتا کہ ہم ”سنو لیک“ کے دوران سپر گلیشیر کے کناروں پر چلتے ہوئے تین عظیم برفانی گلیشیرز کے کناروں سے اُتار کر انہیں پار کر کے دوسرے کناروں پر چڑھ چکے ہیں جہاں صرف جیونٹیوں اور مکوڑے ہی چڑھ سکتے تھے تو ان کے مقابلے میں یہ کیا چڑھائی ہوگی۔ اور کتنی ہوگی۔

لچکے زہر مار کے بعد ذرا آگے گئے ہیں تو سطح بالکل ہموار ہو گئی۔ اور ہمیں چلنے میں دشواری پیش آنے لگی۔ کیونکہ ہمیں چڑھائی کی ایسی عادت ہو گئی تھی کہ میدان میں ہمارے پاؤں

بے ربط ہوتے جاتے تھے۔ دائیں ہاتھ پر۔۔۔ جہاں ہم چلتے تھے۔ وہاں سے خاصے فاصلے پر ایک عظیم چٹان سر بلند تھی اور اس کے دامن میں چند خیمے نصب تھے۔

چٹان کے ایک بڑے اور وسیع دامن میں دو پہر کی دھوپ میں چلتے خیمے تھے۔

ان خیموں میں جو کمین تھے اور ظاہر ہے غیر ملکی تھے۔ انہوں نے شاہ خیموں کے پردے اٹھا کر ہمیں وہاں سے گرتے پڑتے چلتے دیکھا ہوگا۔ اور ان کمینوں میں سے کوئی ایک مسکراتا ہوا۔ بلندیوں سے ڈسے ہوئے ایک چہرے کے ساتھ مسکراتا ہوا میرے پاس آ گیا۔ ”سر۔۔۔ آپ یہاں بھی آ گئے؟“

میں اس سوال سے اگرچہ تنگ آ چکا تھا۔ مجھے ہمیشہ محسوس ہوتا تھا کہ مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ میں نے یہاں آ کر گستاخی کی ہے۔ لیکن اس کے باوجود میری انا کو تسکین بھی ہوتی تھی کہ۔۔۔ میں یہاں بھی آ گیا ہوں۔ ”آپ کون ہیں؟“

”میں ایک غیر ملکی ٹیم کے ہمراہ رابطہ افسر کے طور پر آیا ہوں۔ کیپٹن۔۔۔ ہم لوگ کھارم فور کے آئے ہیں۔ کنکورڈیا میں۔ اور اب گندوگورو سے اتر کر یہاں پہنچے ہیں۔ میں اپنے خیمے سے باہر کھڑا تھا۔ جب آپ کو دیکھا تو دور سے پہچان گیا کہ یہ آپ ہی ہو سکتے ہیں۔“

”کیسے؟“ میں نے مسکرا کر دریافت کیا۔

”ادھر تو آپ ہی ہو سکتے ہیں سر۔ اور کون ہو سکتا ہے۔“

یہ نوجوان کپتان ڈھکے چھپے انداز میں مجھے فائر افعل ہی تو کہہ رہا تھا۔ چٹان کے بڑے سائے میں جو خیمہ گاؤ تھی، اس سے ذرا آگے گئے تو گر گئے۔ اور گر گئے۔۔۔ سے مراد یہ ہے کہ۔۔۔ یہ میدان جب ایک چٹانی سلسلے کی رکاوٹ سامنے پا کر اختتام پذیر ہوا اور ہم ذرا بائیں جانب ہوئے کوئی راستہ تلاش کرنے کے لیے تو کنارے کی بلندی سے نیچے جھانکا تو نیچے گندوگورو گلیشیر کی وسیع برفانی گزرگاہ سانس لیتی تھی۔

اور ہمیں اس گزرگاہ میں اترنا تھا۔

اور اس گزرگاہ تک ایک ایسی اترائی اترتی تھی جس پر اتر نہیں بس گرا جاسکتا تھا۔ اس لیے ہم گر گئے۔

شائد یہ وہی اترائی تھی جس کے بارے میں ہمیں خبردار کیا گیا تھا کہ صاحب آگے ایک چڑھائی ہے۔ لیکن یہ تو وہاں ہی پر چڑھائی ہوگی۔ اب تو یہ ایک اترائی تھی۔ اور یہاں سے نیچے جانے

از انہی شاہ نے اسی راستے کے بارے میں خبردار کیا تھا کہ اس کی ہولناکی بیان سے باہر ہے۔ اس کے اوپر جو چٹانیں معلق ہیں وہ کسی وقت بھی نیچے آسکتی تھیں اور آپ کو ملیا میٹ کر سکتی تھیں۔ ہم نے شانی چو سے چلنے کے بعد اب تک تیز دھوپ کو کو سا تھا اور اب وہی دھوپ اور بن بادل کا آسمان ہمارے لیے باعثِ رحمت تھا۔ یہاں اگر بارش کے چند چھینے بھی پڑ جاتے تو اس گہنی مٹی کی گرفت ڈھیلی کر کے ان چٹانوں کو ہم پر دھکیل دیتے۔ ہم نے یہاں اپنے بے قابو سانس درست کرنے کے لیے بھی ذرا سارک جانا مناسب خیال نہ کیا اور چلتے رہے۔ اور ایک دوسرے سے ذرا فاصلے پر چلتے رہے۔ خاموشی سے دم سادھے چلتے رہے کہ لے سانس بھی آہستہ۔ کہ نازک ہے بہت کام۔

پتھر کی موت کے دامن میں یہ مسافت جب اختتام کو پہنچی تو نیچے ایک نالہ اس طرح گرنا تھا جیسے ہم کنارے سے گرے تھے۔ نالہ گرنا تھا اور نیچے گلیشیر کی کسی دراڑ میں گم ہوتا تھا۔ ہم نے اسے نہایت آسانی سے اور رغبت سے پار کیا۔

اس کے پار ایک کچا راستہ۔ تقریباً سیدھی ڈھلوان پر۔ عرش کو اٹھتا تھا۔ اس پر پرواز کر جانا تو ممکن تھا اس پر قدم رکھ کر چلنا اور چڑھنا۔ لانا تھا جوئے شیر کا۔ یا شاید جوئے شیر تو صرف ایک تیشے کے مسلسل استعمال سے لائی ہی جاسکتی ہے لیکن یہاں وہ تیشہ بھی بیکار ہو جاتا تھا۔ چنانچہ فرہاد ہو جانا بھی کارآمد نہ تھا۔ اس لیے میں نے دو پورٹر طلب کئے اور ان کے بازوؤں پر جھونٹا۔ یونی کارروائی کے طور پر اپنے پاؤں ہلاتا ان کے سہارے سہارے اس عرش تک جا پہنچا اور شانت ہو گیا کہ وہ چڑھائی جس کا ذرا وہاں شانی چو سے چلتے ہوئے دیا گیا تھا بالآخر طے ہو گئی لیکن پھر وہ شانی ایک ایسے ہراس میں بدلی جس میں ماتھے پر یکدم خوف کے پسینے نالوں کی صورت میں بہنے لگے۔ اور دل جو پہلے سے ہی پریش میں تھا ایک دھک کر کے تادیر زکار رہا اور پھر اس نے بہت دیر بعد ایک اور دھک کی اور پھر رک گیا کیونکہ سامنے۔ سامنے تو نہیں اور وہ چڑھائی تھی جس کے بارے میں ہمیں خبردار کیا گیا تھا۔

پہلے جو کھٹانیاں آئی تھیں وہ تو محض ٹریلر تھے، اصل فلم کا تو اب آغاز ہوا تھا۔ میں نے بہت سی تو نہیں۔ لیکن دس بارہ ایسی آسمانی سیڑھیوں پر قدم رنجہ فرمایا تھا۔ لیکن سیڑھیاں ایسی جن کا کوئی زینہ سلامت ہو۔ کبھی درگتھ کی ندیوں سے پہلے اور کبھی سنولیک کے دوران کسی گلیشیر کی دیوار پر چڑھتے ہوئے۔ لیکن اس چڑھائی کی شان ہی الگ تھی۔

کے لیے ایک بگلی چھلانگ ہی کارآمد ہو سکتی تھی۔ بگلی چھلانگ جس میں ایڈوچر کے رسیا لوگوں کے پاؤں میں ایک رستی باندھ کر انہیں بلندی سے دھکیل دیا جاتا ہے۔

باری باری ایک دوسرے کے سہارے، پورٹروں کے سہارے، لڑھکتے۔ گرتے پڑتے۔ بھستے۔ رولر سکینگ کرتے۔ کبھی بے بسی سے مسکراتے اور کبھی خوف کے آنسو روکتے نیچے پہنچ گئے۔ گلیشیر کے قریب پہنچ گئے لیکن اس پر اترے نہیں، اس کے برابر میں جس کنارے سے ہم گرے تھے، وہاں ایک گیلڈنڈی پر چلنے لگے۔ گلیشیر کے ساتھ ساتھ!

چونکہ ہم کھلے میدان اور بڑے آسمان سے نکل کر گلیشیر کی گہرائی میں آ گئے تھے اور یہاں صرف برفیں تھیں اور اس کے بلند کنارے تھے جن کی تہ میں ہم چلتے تھے تو یہاں بھی ایک دنیا جہان سے کٹی ہوئی تنہائی تھی جس میں ہم ایک ڈھلوان کنارے پر گلیشیر کے برابر میں اپنے آپ کو سنبھالتے چلتے جاتے تھے۔ یہاں بھی دو چار سخت مقام آئے لیکن انہوں نے جی کو خوش نہ کیا کیونکہ بھستنے کی صورت میں ہم محض چند گز نیچے گر کر گلیشیر پر جا گرتے اور بغیر بیت رہتے۔ تب میں نے پہلی بار اپنے اوپر دیکھا۔ اور اوپر موت کا ایک منظر دیکھا جو معلق تھا۔

چٹانی تو دے اور جہازی ساز کے پتھر بلند کنارے کی مٹی میں یوں اٹکے ہوئے تھے جیسے ذرا سی ہوا کے چلنے سے ہم پڑھکتے ہوئے نازل ہو جائیں گے۔ عین ہمارے سروں کے اوپر وہ چٹانیں جانے وہاں کیسے قائم تھیں۔ کچی مٹی میں پھنسی وہ کسی مجزے سے قائم تھیں اور ذرا سا سانس لینے پر نیچے گر سکتی تھیں۔ بلکہ گرنے کو تھیں اور ذرا سوچ میں پڑ گئی تھیں کہ اب فوراً گریں یا اپنے نیچے مزے سے چلنے ان بے وقوفوں کو چند منٹ اور جینے کے عنایت کر دیں۔ وہ چٹانیں ایسے ڈانسا سورس تھیں جن کی صرف ڈیم مٹی میں پھنسی ہوئی تھیں اور وہ زور لگا کر باہر آنے کو تھیں۔ ان سینکڑوں پتھروں اور معلق چٹانوں میں سے کوئی ایک بھی گر کر ہمیں اجل کا سرمہ بنا سکتی تھی۔

بہتر یہی تھا کہ سر اٹھا کر اوپر دیکھا ہی نہ جائے۔ صرف اپنے سامنے دیکھیں اور ایک عالم جذب میں سر ہلاتے چلتے جائیں۔

ہائیں ہاتھ پر گندو گورو کی برفانی دنیا کی اونچ نیچ میں سے کوئی پتھر کسی برف کی دیوار میں سے جدا ہو کر کہیں نیچے کھائیوں میں گہری گونج سے گرنا تو ہم چوکنے ہو کر فوراً اوپر دیکھتے کہ کہیں یہ پتھر اوپر سے تو نہیں آ رہا۔ کہیں موت کا دن تو معین نہیں ہو گیا۔

یہ داستان الم مختصر کردوں تو بہتر ہے۔۔

میں بھی ایک مطلق حالت میں ہوا میں پاؤں چلاتا، بتیلیوں پر بیٹھتا، دوپور ٹروں پر اپنا ناروا بوجھ ڈالتا شدید سراسیمگی کی حالت میں اوپر جاتا تھا اور اپنے آپ پر لعنت بھیجتا تھا کہ آخر کار میں یہاں۔۔ کسی شائی چو سے چل کر کسی دل سنگ پا وغیرہ کو جاتا ہوں تو کس لیے جاتا ہوں۔۔ میں اس بیہودہ مقام پر کیا کر رہا ہوں۔ لاہور میں ہوتا تو کسی ادبی یا بے ادبی فنکشن کی صدارت کر رہا ہوتا اور بعد میں چائے کی میز پر چند نابالغ مداحوں میں گھرا۔۔ کچھ حسین اور زیادہ تر غیر حسین خواتین کو آنوگراف دے رہا ہوتا تو میں یہاں کیا کر رہا ہوں۔۔

داستان الم نہ صرف مختصر کرتے ہیں بلکہ مختصر ترین کر دیتے ہیں۔۔

اوپر۔۔ آسانی سیڑھی کے اختتام پر ہر کوئی ایک بڑے پتھر کی قبرت میں ڈھیر ہو رہا تھا۔۔ میں بھی ہو گیا۔۔

اور جب نفری مکمل ہو گئی۔۔ تو پھر بھی ہم کچھ دیر کے لیے ڈھیر رہے۔۔ خاصی دیر کے بعد اس ڈھیر میں زندگی کے آثار پیدا ہوئے اور ہم پھر سے چلنے لگے۔۔

دیگر چڑھائیوں میں تو پھر کہیں اخلاقیات کی کوئی نہ کوئی رفق موجود تھی۔۔ لیکن یہ چڑھائی ایسی واپس تھی کہ اس کا کوئی کردار نہ تھا۔ کوئی اخلاق نہ تھا اور نہ ہی اخلاق تھی۔۔ ہم تجربہ بھری مٹی اور پتھروں سے تقریباً ناک لگائے کھڑے تھے اور جب بشکل اوپر نظر کرتے تھے تو وہاں ہمارا ایک پورٹرا سان میں نقب لگائے کھڑا نظر آتا تھا۔۔ یہ کجخت کا بچہ وہاں پہنچ کیسے گیا۔۔ یقیناً کسی اور راستے سے وہاں پہنچا ہے۔۔ اور کوئی راستہ ہوتا تو ہمیں دکھائی نہ دیتا۔۔

اور ہاں میں ابھی یہ اعتراف کر لوں کہ درہ گندوگور کی اس مہم کے دوران یہ آسانی چڑھائی۔۔ جہاں ایک محتاط اندازے کے مطابق کوئی معمولی درجے کی روح بھی پرواز نہیں کر سکتی تھی۔۔ بدترین تھی اور مرگ ترین تھی۔۔

ہم اس پر آگے پیچھے چڑھتے۔۔ نہیں چڑھ سکتے تھے۔۔ ہر ایک کو باری باری۔۔ اس سولی پر چڑھنا تھا۔۔ اور یہاں بھی یہ کہا جاسکتا تھا کہ بچے چڑھ جاسولی رام بھلی کرے گا۔۔ لیکن ہمارا تو پہلے ہی بولورام ہو گیا تھا، اب وہی رام کیسے بھلی کر سکتا تھا۔۔

چنانچہ پہلا بچہ جو شاید سلمان تھا پہلے سولی چڑھا۔۔ بلکہ اوپر اٹھتا گیا اور پھر ہماری نظروں سے غائب ہو گیا۔۔ لیکن تنہا نہیں بلکہ دوپور ٹروں کے بازوؤں میں ٹکلتا ہوا۔۔ اب یہ کھلا کہ ہم نے باری باری اوپر کیوں جانا تھا۔۔ دوپور ٹروں اور ایک سلمان کے پاؤں جب بوجھ سے لدے فخروں کی طرح پتھروں پر بے اختیار پڑتے تھے تو وہ گیندوں کی مانند اچھلتے ہوئے نیچے وہاں تک آتے تھے جہاں ہم گھبرائے ہوئے کدوؤں کی مانند ڈرے بیٹھے تھے۔۔

اور یہ پتھر سنگ میز انکوں کی مانند۔۔ شہاب ثاقب کی مانند شٹ کرتے آتے تھے۔۔ پھر خبر آئی کہ سلمان پہنچ گیا ہے۔۔ پتہ نہیں کہاں پہنچ گیا ہے کہ وہ ہمیں نیچے سے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔۔ لیکن ہمیں تسلی ہوئی کہ اگر ایک بھلاو اوپر پہنچ سکتا ہے تو ہمارا بھی کچھ چانس ہے۔۔ اور ہم بھول گئے کہ بھالوؤں کا تو کام ہی لڑھکنا اور چڑھنا ہے اور ہم انسانی جانور تھے۔۔ چوپائے کی بجائے دوپائے تھے۔۔

اور یہی ہماری غلط فہمی تھی کہ ہم اپنے آپ کو اب تک اشرف المخلوقات کی فہرست میں رکھتے تھے کیونکہ ہم سب اوپر جاتے ہوئے چوپائے ہو گئے۔۔ تیری سرکار میں پہنچے تو کبھی ایک ہوئے۔۔ بلکہ کبھی بھالو ہوئے۔۔

ہمیں پچھلے ماہ یہاں آنا چاہیے تھا جب یہ اندازے.. یہ گمان اور یہ خیال جھوٹے ہوتے..

بلندیاں کا لُج کا کوہ پیما کی کلر عطا کر دیا گیا تھا۔ اور اسی حادثے کی بنا پر کے لو کی چوٹی پر پہنچنے والا پہلا پاکستانی اشرف امان مذاق میں مجھے اپنا استاد کہتا تھا۔

تو میں اس کا لُج کے کنویرین برآمدوں میں۔ اوول گراؤنڈ میں۔ اس دیوانگی کوہ نور دی نے جنم لیا تھا۔ میں اگر آج کہیں بلند پہاڑوں سے لوٹتا تھا تو اس کا لُج میں بولیا گیا تھا۔

گورنمنٹ کا لُج گزرا تو لوئر مال پر ”سنگ میل چلی کیشنز“ کا بورڈ نظر آیا۔

پہاڑوں سے واپسی پر یہ بورڈ ہمیشہ نظر آتا تھا۔

لیکن اس بار اس بورڈ کے حروف دھمے اور بجھے بجھے سے تھے۔

وہاں اب اعجاز نہ تھا۔ صرف جوان بیٹے کی یکدم ہمیشہ کے لیے رخصتی کے دکھ میں ڈھکی ڈھسے چکے نیاز صاحب تھے اور وہ بھائی تھا جو تنہا رہ گیا تھا۔ اُس کی جوڑی ٹوٹ گئی تھی اور اس کی کمر پر زندگی بھر کی تنہائی اور رنج کی دھوپ تھی۔ ایک بھاری پتھر تھا جو اُس کے بدن کی جمیل کی تہہ میں تھا۔

سول سیکرٹریٹ کے آگے ہوئے۔ اور ہماری وگن میوگا روڈ میں داخل ہو گئی۔

سلمان کے گھر کے آگے جاڑی۔

وہ اترنے سے پیشتر ذرا جھجکا اور پھر اتر گیا۔

باقی رہ گئے۔ پانچ!

”لاہور کی بھیڑ میں.. باقی رہ گئے پانچ“

لاہور کی بھیڑ بڑھ گئی تھی۔

صرف دو ہفتے پیشتر جب ہم یہاں سے نکلے تھے تو یہاں اتنی کاریں۔ اتنے ریزے تانگے، رکشا، بسیں اور لوگ تو نہیں تھے۔

یہ کہاں سے آ گئے۔

ہماری وگن کی ونڈ سکرین میں سے کوئی دندنائی ہوئی بس ہماری جانب آتی تو ہمیں یقین ہو جاتا کہ یہ ونڈ سکرین کو پاش پاش کرتی وگن کے اندر آ جائے گی اور ہم اپنی نشستوں میں دھبک جاتے۔

بھائی گیٹ سے آگے میرے بچپن کے دن ایک فلپش کی صورت گزرے۔

یہاں۔ جہاں اب جوس کی دکانیں ہیں یہاں اپنے نعیم بخاری کے دادا ڈاکٹر طفیل کا کلینک ہوا کرتا تھا اور وہ گورے چنے نہایت پیارے بھالو ڈاکٹر میری پسیلوں میں سٹیجھو سکوپ لگاتے تھے تو میں آسمان سر پر اٹھایا کرتا تھا کہ میں ایک چھ برس کا کالو مالٹو بچہ ہوا کرتا تھا۔

ذرا آگے مسلم ماڈل ہائی سکول کی عمارت نظر آنے لگی جہاں میں ایک معمولی لیاقت کا طالب علم ہوا کرتا تھا اور ماسٹر رحمت خاں، رفیق صاحب، نادر خاں اور ہیڈ ماسٹر عبدالعزیز صاحب کے ستم کا نشانہ ہوا کرتا تھا۔ اور پھر اس کے برابر میں گورنمنٹ کا لُج کے گوتھک برج منارے تھے جن کے سائے میں میری جوانی کے دو برس پل بھر میں بیت گئے۔

وہی گورنمنٹ کا لُج جہاں میرے بدن میں کوہ نور دی کے پہلے جراثیم انجیکٹ کئے گئے۔ ”وادئی ریکشن گزکا“ ہم کے ایک ممبر کی صورت میں اور وہاں سے واپسی پر ہر لڑکے کو

کو دودھ اور کھانے کو بغیر ملنے کی امید تھی..

ہم تو اسی خیال میں تھے کہ شانی چوکی مانند ادھر دل سنگ پا میں بھی غیر ملکیتوں کے خیموں کی ایک دنیا ہوگی لیکن وہاں کوئی نہ تھا.. اگرچہ ہم تنہائی کے تمنائی تھے اور ہمیں خوش ہونا چاہیے تھا لیکن ہم ذرا ڈر گئے کہ ہم اتنی بڑی اور مکمل تنہائی کے بھی تمنائی نہ تھے..

ہر جانب گلیشیر دھندلاتے ہوئے اترتے تھے..

لیکن وہ دیوار کے پار رک جاتے تھے..

برف بلندیاں تھیں اور ان برف پوش حسیناؤں میں سب سے گورے اور ٹھنڈے اور بلند قامت والی مشاہیرم تھی.. ہم نے اس سے بے وفائی کی تھی اور اس کے بیس کیمپ میں جانے کی بجائے ادھر آ نکلے تھے..

ویسے ہم کسی حد تک کنکورڈیا ٹریک کے متوازی چل رہے تھے..

مختصر پیک کی جانب سے ایک راستہ کھویر سے کی خیمہ گاہ میں جا اترتا تھا..

شانئی چو سے پرے وہ گلیشیر شروع ہوتا تھا جو مونالیزا چوٹی چوغولیزا تک چلا جاتا تھا.. چلا جاتا تھا یا وہاں سے اتر کر نیچے آتا تھا اور چوغولیزا گلیشیر کہلاتا تھا..

اس مشاہیرم کے پار وہ برفانی عجائب گھر تھا جس سے اگلا سٹاپ گورے ٹوکا تھا.. اور گندوگور وڈرے کے پار کنکورڈیا اور کے ٹوکا تھا..

گویا ہم سب کنکورڈیا ٹریک کے اس جانب چل رہے تھے.. دیوار کے اس پار تھے..

اس لیے یہاں دل سنگ پا میں بھی وہی موسم تھے.. آئے موسم برفیلے سہانے.. ہم خیموں کے باہر میٹرز پر استراحت فرمانے کی کوشش کرتے تھے لیکن سردی کرنے نہ دیتی تھی.. کبھی کبھار کسی گلیشیر پر سے کوئی ایولا نچ گرنے سے ایک گہری دل کو ہلا دینے والی گونج دل سنگ پا کی تنہائی میں امدتی ہوئی آتی.. سنائی دیتی.. اور جتنی دیر میں ہم اس برفانی تودے کو گرتے ہوئے دیکھنے کی آرزو میں اسے متعدد گلیشیرز پر نظریں دوڑاتے تلاش کرتے وہ تودہ گر چکا ہوتا اور اس کی گونج گم ہو چکی ہوتی..

پورا دل سنگ پا.. مشاہیرم کی چوٹی.. اس کا برفانی وزہ اور متعدد گلیشیر کم از کم آج کی شب

ہماری جائیداد تھے.. ان کی رجسٹری ہمارے نام ہو چکی تھی، بے شک ایک شب کے لیے ہی تھی..

ہم وہ نظام بنے تھے جو برف کے سکتے چلا سکتے تھے.. اپنے تخیل کی نکال میں پوری مشاہیرم کو ڈھال

”پانچ گلیشیر.. میرا خیمہ اور 13600 فٹ بلند سردرات“

ہم دل سنگ پا میں اترنے لگے..

گندوگور و کے کناروں سے نیچے اترنے لگے..

اس کے پہلو میں اجڑا ہوا پھولوں کا کھیت تھا، اس میں اترنے لگے..

گھاس کم کم تھی.. ریت بہت تھی..

دامن ہاتھ پر چٹانوں کے دامن میں ایک کم پانیوں والی جھیل تھی.. اتنے کم کہ اس میں

جا بھا پتھر ابھرے ہوئے تھے.. وہیں کہیں سے ایک چشمہ اس میں شامل ہوتا تھا اور یہ ہماری دائر

سپلائی تھا.. شکر ہے ابھی تک چل رہا تھا خشک نہیں ہوا تھا..

ریتلے میدان سے ذرا بلند ایک پتھر ملی چار دیواری دکھائی دے رہی تھی جس کی جانب

ہمارے پور ٹرا ایک تیر کی مانند گئے اور لمحوں میں پتھروں کے اوپر پکن ٹینٹ کی ترپال آویزاں کر کے

آسودہ ہو گئے..

دل سنگ پا میں اترنے سے پیشتر میں نے بائیں جانب ایک سرسبز گھاٹی کے دامن

میں دو پتھر لیے جھونپڑے دیکھے تھے جن میں بقول از انیل شاہ ہوشے کی کچھ ایسی خواتین کو ہونا

چاہیے تھا جو یہاں مویشیوں کی نگہبانی کرتی ہیں، دودھ دوہتی ہیں اور بغیر بناتی ہیں.. وہ پتہ نہیں اب

تک وہاں تھیں یا نہیں کیونکہ میں نے آس پاس کسی مویشی کو نہیں دیکھا تھا..

اور اس منظر نے میری توجہ اس لیے حاصل کی کہ ان جھونپڑوں کی جانب ہمارے دو

پور ٹرا مکمل اٹھائے جا رہے تھے.. وہ یقیناً اس بلندی پر تنہا قیام پذیر خواتین کے عزیز رشتے دار تھے

اور ایک چھت تینے رات گزارنے کے لیے ادھر جاتے تھے.. وہاں ایک چھت کے علاوہ انہیں پینے

سکتے تھے۔

عمومی طور پر ٹیم ممبران کی بدنی حالت مناسب تھی۔ اگرچہ ٹیم لیڈر کی پنڈلیوں اور رانوں میں ایسی ٹیمیں اٹھ رہی تھیں جیسے کوئی جہاں سے اٹھتا ہے۔ یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے نہیں۔ بلکہ یہ ٹیمیں اور درد کہاں سے نہیں۔ کہاں کہاں سے اٹھتا ہے۔ بہر حال مجموعی طور پر صورت حال انڈر کنٹرول تھی۔

”تارڑ سائیں“ برفانی گھوڑا میرے پاس آ بیٹھا۔

”جی سائیں۔“

”میں بے حد مایوس ہوا ہوں۔“

”دل سنگ پائے؟“

”نہیں سائیں، اس کی تنہائی نے تو میرا دل موہ لیا ہے۔“

”تو پھر کس سے؟“

”آپ کی ٹیم سے۔“

”ہاں۔۔۔ یہ ایک عجیب ناقابل فہم قسم کی مسخری ٹیم ہے۔ جس میں ہر قسم کے تجھے پائے جاتے ہیں۔ اور تم تازہ ترین تجھ ہو۔“

”سائیں یہ ٹیم تو ”سنولیک“ والی ٹیم نہیں ہو سکتی۔ اُسے تو سپر فٹ ہونا چاہیے۔“

”سنولیک“ تک پہنچ جانے والی ٹیم ایسی ان فٹ کیسے ہو سکتی ہے۔ بشمول آپ کے۔“

”ہم تو بس ایسے ہی اول جلول قسم کے لوگ ہیں ڈاکٹر۔ بے شک دور سے ہم کوہ نوری بجائے اپنا ج فقیر لگتے ہیں جو گھسٹے ہوئے چلے آتے ہیں اور سب سے پیچھے یہ فقیر پرتھویر چلا آتا ہے لیکن میں تمہیں کیا بتاؤں کہ سو بنے رب کا کوئی ایسا کرم ہے ہم پر کہ ہم آج تک ناکام نہیں لوٹے۔ جہاں پہنچنا ہوتا ہے وہاں کسی نہ کسی طرح پہنچ ہی جاتے ہیں۔ ماتم کرتے روتے پینتے۔ گھسٹتے۔ آنسو بہاتے۔ پہنچ ہی جاتے ہیں۔ یوں بھی سنولیک کا ٹریک کئے ہوئے پانچ برس ہوئے کو آئے ہیں تو اس دوران بدنی ہمت میں فرق تو پڑ گیا ہے ناں۔ عمر کے زوال پر تو ہمارا بس نہیں۔“

”میرا خیال ہے آپ یوں بھی اپنے ساتھیوں کو ذرا زیادہ پروجیکٹ کرتے ہیں۔“

”ہاں شاید۔ کیونکہ وہ میرے ساتھی ہیں۔ میرا ساتھ دیتے ہیں۔ میرا خیال رکھتے

ہیں۔ میں ان کے بغیر شاید اتنے ٹریک نہ کر سکتا۔ لیکن کبھی کبھار اور پروجیکشن بھی ہو جاتی ہے اور میرا کوئی ساتھی گھمنڈ میں آ جاتا ہے اور مجھے اس کا اختیار بھگتنا پڑتا ہے۔ کوئی ایک ساتھی گدا ہو جاتا ہے۔ ویسے تم فکر نہ کرو، میں تمہیں بھی پروجیکٹ کروں گا۔“

برفانی ہنسنے لگا۔ اور وہ اپنے بیٹے تیمور کی مانند ایک معصوم بچے کی طرح ہنستا تھا۔

ویسے برفانی کی ہنسی اس بات کی مظہر تھی کہ دل سنگ پا ایک ایسا مقام ہے جہاں اس جیسا خاموش انسان بھی ہنسنے پر۔ خوش ہونے پر۔ مجبور ہو جاتا ہے۔

چنانچہ دل سنگ پا اُس شب ہماری سلطنت تھا۔

ہم اس پر حکمرانی کرتے تھے۔

یہ جو چھ سات عظیم برفانی توڑے ہمارے دائیں بائیں اترتے تھے، یہ ہماری ریاستیں تھیں۔ ان کے اوپر جو چوٹیاں برف بھار سینوں والی اُٹھتی تھیں، یہ ہماری کنیریں تھیں۔ مشاہیر ہماری رکھیل تھی۔ یہ سب ہمارے تابع تھے۔ صرف اس لیے کہ ہم یہاں تک پہنچ گئے تھے۔

جیسے ”پاک سرائے“ کے دوران پور ٹنگیر نے کہا تھا کہ صاحب دادی اُس کی ہوتی ہے جو وہاں تک پہنچ جائے۔ اور ہم پہنچ گئے تھے۔

میں نے اگر ابھی ابھی یہ بیان دیا تھا کہ عمومی طور پر ٹیم ممبران کی بدنی حالت مناسب تھی تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ ہر کوئی ڈربلی رئیس کے گھوڑے کی مانند گٹ بھاگ رہا تھا اور سپر فٹ تھا۔ جس قدر رے ڈھیلا اور بے رابطہ ہو رہا تھا۔ میاں صاحب کا فٹنہ سوج کر کھپتا ہو رہا تھا اور پاؤں میں چھالے تھے۔ عامر کے پیٹ میں گڑ بڑ تھی۔ سلمان بھی فکر مند تھا اور میں اپنی حالت زار تو بیان کر ہی چکا ہوں۔ البتہ شاہد صاحب حسب عادت نہ اقرار کرتے تھے نہ انکار کرتے تھے۔ اگرچہ ڈاؤن ڈاؤن لگتے تھے۔

دل سنگ پا 13600 فٹ کی بلندی پر براجمان تھا۔ ہم زیادہ دیر تک خیموں سے باہر براجمان نہ رو سکے کہ ہم باہر بیٹھے رہتے تو اگلی صبح ہم بھی برفانی عجائب گھر کے سفید سفید مجسمے ہوتے۔

کھانے کے فوراً بعد خیموں میں پناہ گزین ہو گئے۔

جوں جوں رات اُترتی تھی تو توں توں 13600 فٹ کی بلندی اپنے کرشمے دکھاتی تھی۔ ہڈیوں میں برف کے جل ترنگ بجاتی تھی اور سانس میں ہوا کی بجائے برف کی کرچیاں

اس میں اپنے ستارے ڈبوتا اور جھلکتا تھا۔ ایک اور آسمان فیضی میڈو پر اترتا تھا اور ہم الاؤ بجا دیتے تھے تاکہ اس کے ستارے نزدیک آجائیں۔
لیکن یہ۔ دل سنگ پا کی رات کا آسمان کوئی اور آسمان تھا۔
اس آسمان کے ستارے الگ الگ نہ تھے بلکہ ایک کھکشاں کی صورت میں بچھے ہوئے روشن تھے۔

ہوتا ہے رنگ آسمان کیسے کیسے!

اور وہ 13600 فٹ کی بلندی پر اتنا قریب تھا کہ میں اس کا روشن دوپٹہ ذرا ہاتھ بڑھا کر اُتار کر سکتا تھا اور اوڑھ سکتا تھا۔

ستاروں کے جگمگے تھے جو مشاہیرم کی چوٹی سے لپٹے جاتے تھے۔ روشن شراروں کی مانند اس کی برفوں میں دفن ہوتے جاتے تھے لیکن بجھتے نہ تھے اور اس کی برفوں کے ناخنوں تلے تو دیتے تھے۔

میرے آس پاس۔ ہر سو چپ تھی۔ دل سنگ پا پر لاکھوں ستاروں کی روشنی بھی ہوئی تھی۔

یہ ستاروں کی کیسی بارات اُترتی تھی۔

میں پوری شب جب تک کہ ستاروں کی یہ بارات رخصت نہ ہو جاتی وہاں خیمے سے باہر جب سارا عالم سوتا تھا، میں منہ اٹھائے اس بارات کو تکتا رہتا لیکن سنو جیکٹ اور گرم جرابوں کے باوجود میرا بدن سردی کو سہارتا نہ تھا اور بری طرح کپکپانے لگ گیا تھا۔

اُن چھ سات گلیشیرز کی قربت مجھے مجھد کرنے کو تھی۔

مجھے اپنے خیمے میں لوٹنا تھا۔

خیمے کا پردہ اٹھانے سے چشتر میں نے ایک بار پھر دل سنگ پا کے آسمان پر نظر کی۔ پھولوں کے اس برفانی اجڑ چکے کھیت پر نگاہ کی۔

وہ۔۔ 13600 فٹ کی بلندی پر ایک گھٹا اور روشنی بھرا ستاروں کا کھیت تھا جس میں میرے تختیل اور آرزوؤں کے بل چلتے تھے۔ دل سنگ پا کی صرف یہ رات بھی اس لائق تھی کہ۔۔ لاہور سے۔۔ بٹام۔۔ گلگت۔۔ سکر دو۔۔ چلو۔۔ ہوشے اور پھر شانی چو سے کہیں آگے صرف اس کے لیے سفر کیا جائے۔۔

بھرتی تھیں اور سونے نہیں دیتی تھیں۔ بچپن میں فلم ”پرچھا کس“ کا لٹا منگیٹھکر کا گایا ہوا گیت ”کھتے ہیں دکھ میں یہ دن۔۔ پہلو بدل بدل کے“ مجھ پر بہت اثر کرتا تھا۔ اب کھلا کہتا نے یہ گیت دل سنگ پا کی اس رات کو مد نظر رکھتے ہوئے گایا تھا۔ یہاں بھی یہ رات دکھ میں کھتی تھی اور کروٹ بدل بدل کے۔۔

دل سنگ پا کی شام میں ہم جن گلیشیرز کو اپنی ریاستیں اور جن چوٹیوں کو اپنی کینریں سمجھ رہے تھے، وہ اس کی سرد رات میں ہم پر حاوی ہو کر ہم پر حکمرانی کرنے لگیں۔ اس سے ہمارا سکہ کھوٹا ہو گیا اور ہم بادشاہ سے پھر سے نظام سٹے ہو گئے۔

رات کے کسی پہر مجھے مجبوراً خیمے سے باہر آنا پڑا۔

ایسی شدید سردی میں اگر خیمے میں آگ بھی لگ جائے تو بھی میں اپنے سلیپنگ بیگ سے باہر نہ آؤں۔ لیکن یہ مجبوری آگ سے بھی زیادہ مجبوری تھی۔

مجھے کوہ پیما کی کسی کتاب میں اس کا حل نہیں ملا۔ بلکہ ایک بار شانند دیوسائی کے درہ برجی لام کی اس رات میں جب برفباری تھمتی نہ تھی تو میں نے سوچا تھا کہ انسان کے پاس ایک ریز پائپ ہونا چاہیے کہ اس میں فٹ ہو کر خیمے کے اندر ہی اندر فراغت ہو جائے۔

اگر یہاں دل سنگ پا میں میرے پاس کوئی پائپ ہوتا تو میں ہرگز باہر نہ جاتا۔

لیکن یہ نہ تھی ہماری قسمت۔ اس لیے مجھے مجبوراً باہر آنا پڑا۔ کہ میرے مٹانے پر جو شدید باؤ تھا، وہ خیمے میں آگ لگ جانے سے کہیں زیادہ جان لیوا تھا۔

بہر حال میں اس دباؤ کو دبانے کی کوشش کرتا۔ سلیپنگ بیگ سے باہر آیا۔ ریٹکتا ہوا خیمے سے باہر آیا۔ لیکن باہر آنے سے چشتر اپنی سنو جیکٹ پہن لینے کو نہ بھولا۔ اگر بھول جاتا تو برفانی عجائب گھر میں ایک مجسمہ ہو جاتا۔

میں باہر آیا۔ اور جب میں اپنے آپ کو ہکا کرنے کے بعد ایک عجیب بالیدہ روح کے ساتھ خیمے میں جانے کو تھا تو میری نظر آسمان پر گئی۔

اور وہاں کوئی اور آسمان تھا۔

اور یہ وہ آسمان تو نہ تھا جو پچھلے ساٹھ برس سے میرے سر پر ایک خیمے کی مانند تار ہا تھا۔ میں اپنا آسمان کہیں بھول آیا تھا۔

یہ درست کہ ایک آسمان اپنے کمیش کے دوپٹے کے ساتھ دریاے سندھ میں اُترتا تھا اور

”چیلو کا بلتی بگتی.. اور اُجڑا ہوا پھولوں کا کھیت“

سورج کے رتھ نے دل سنگ پاکے آسمان پر بکھرے ستاروں کو اپنی روشنی سے روند کر معدوم کر دیا تھا اور اب وہاں اس کا راج تھا.. جب میں اپنے خیمے سے باہر آیا..
نایاب قسم کی تصویر کشی کے آرزو مند میرے ساتھی جمیل کے مختلف پانیوں میں سورج کی روشنی میں عکس ہونے والی مشاہیرم اور دوسری برفانی چوٹیوں کی تصویریں اُتارنے میں محو تھے.. جمیل سے ذرا اوپر ایک چشمہ چٹانوں میں لُچھوٹ کر ایک چھوٹی سی ندی کی صورت نیچے اُترتا تھا، جمیل کا حصہ بن جاتا تھا.. میں نے اس ندی کے کنارے بیٹھ کر شیو کی اور اس احتیاط سے کی کہ آئینے میں دیکھتے ہوئے اپنا آپ نہ دیکھا جائے کہ وہاں دیکھنے کے لیے سوائے ایک مجنوں باباجی کے اور کچھ نہ تھا..

شیو کے بعد میں نے اپنا پہاڑی اُشان کیا..

چاہے ہم کتنی ہی بلندی پر فائز کیوں نہ ہوں.. دنیا کے طویل ترین گلیشیرز پر ہی خیمہ زن نہ ہوں، میں ہمیشہ یہ اُشان کرتا تھا.. یعنی شیو کے بعد جب تک اُتارتا تھا.. سو بیڑا اُتارتا تھا، فی شرٹ اور بنیان اُتارتا تھا اور پھر تقریباً تیس سینکڑ کے اندر اندر اپنے بالائی دھڑ پر پانی کے چھینے مار کر اسے تو لیے سے خشک کر کے فوراً ہی تو اتر سے اپنا سب کچھ بہن لیتا تھا.. وزہ سپر کی ٹاپ پر پانی نہ تھا تو برف سے کام چلا لیا.. میرے ساتھی ہمیشہ مجھے اس اُشانی عمل میں مصروف پا کر تشویش سے دیکھتے تھے کہ باباجی اتنی سردی میں یوں بچرس کے کسی ٹائٹ کلب کی سٹرپ ٹیز ڈانس کی مانند اپنا اوپر والا حصہ عریاں کر رہے ہیں تو انہیں ذہل تو کیا ٹرپل نمونیا بھی ابھی ہو جائے گا.. لیکن میں باز نہ آتا تھا کہ یہ اُشان مجھے نیا گور کر دیتا تھا اور میرا بدن.. کم از کم بالائی بدن کھٹکنے لگتا تھا.. زیریں بدن میں

یہ ایک ایسا منظر تھا..

منظروں کا یہی وہ دانہ تھا جو سو ہزار بکھی تر شک میں.. کبھی کرومیر میں.. شیشال.. ملتر کی جھیلوں.. بیافو سپر کی سنولیک اور کبھی مانگو اور کبھی اشکو لے میں ڈال دیتا تھا اور ہم ناتواں پرندے اپنے اپنے آشیانے چھوڑ کر اس دانے کو چھٹنے کے لیے آ جاتے تھے..
یہی وہ برفانی اور بلند دام تھا جس میں شکار ہونے کی خاطر ہم بے اختیار اپنے گھروں سے نکل آتے تھے..

اس دام سے.. اس جال میں بھنس کر اگرچہ ہم اپنی ناتوانی میں پھڑپھڑاتے اپنے آپ کو ڈھکی بھی کر لیتے تھے لیکن اس کے باوجود اس کی گرفت سے آزاد نہیں ہونا چاہتے تھے..
دل سنگ پاکہ یہ آسمان بھی.. ایک ایسا ہی دانہ تھا.. دام تھا.. جال تھا.. کیا ہر ایک کے نصیب میں ایک مختلف آسمان ہو سکتا ہے..؟
نہیں.. ہرگز نہیں!

بیشتر لوگ ایک ہی آسمان سے نہایت کامیاب زندگیاں گزار دیتے ہیں.. بلکہ اپنی زندگی میں وہ ایک آسمان بھی کم ہی دیکھتے ہیں..
صرف کوہ نور دوں کے نصیب میں مختلف آسمان ہوتے ہیں!
اور دل سنگ پاکے آسمان ہوتے ہیں..

”بہت فرق پڑتا ہے اسحاق.. سیاہ گلیشیر مادہ کہلاتا ہے اور سفید کو نر کہا جاتا ہے تو میں سیاہ گلیشیر پر چلنے کی پریکٹس رکھتا ہوں..“

”تھوڑا سیاہ ہے اور تھوڑا سفید ہے..“

”اور آج ہم کہاں پہنچیں گے؟“

”گندوگورو کے ٹیس کیپ میں..“

”اور اس میں کیپ کا نام کیا ہے؟“

اسحاق نے ایک عجیب و غریب ہسپانوی قسم کا نام لیا..

میں پہلے بھی اقرار کر چکا ہوں کہ اس ٹریک کی منزلوں کے نام بہت الگ تھے اور مجھے یاد نہیں ہوتے تھے.. مشکل سے شانی چو اور دل سنگ پایا دیکھا تھا اور اب یہ کچھ اور آگیا تھا.. چنانچہ میں نے محض سر ہلادیا کہ نام میں کیا رکھا ہے..

ہمارے خیمے سمیٹے جا رہے تھے..

میں اپنی میٹرس پر بیٹھا اپنے نئے ہائی ٹیک بوتوں کے تسے باندھ رہا تھا اور مجھے بے حد لطف آرہا تھا.. میں خوش تھا..

جی ہاں ایک کوہ نور کی خوشیاں بہت الگ ہوتی ہیں..

ایک کوہ نور کے لیے یہ بھی ایک خوشی ہوتی ہے.. ایسے نئے نکور ہانکنگ بوٹ پہننا جو آپ کے پاؤں کو پسند کر لیں اور پھر ان کے تسے اور وہ بھی نئے نکور.. کس کریوں باندھنا کہ آپ کے پاؤں ان میں محفوظ محسوس کریں.. یوں کہہ لیجئے کہ ایسے تسوں کو باندھنے میں وہی سنسنی محسوس ہوتی ہے جو ایک رقاصہ نے گھٹکھرو باندھتے ہوئے محسوس کرتی ہے.. گویا رقص کوہ نور دی سے جوشتر بوتوں کے تسے ہمارے گھٹکھرو ہوتے ہیں..

یہ نئے بوٹ پہننے کے بعد میں نے جامنی رنگ کی نارتھ فیس جیکٹ پہنی تو یہ ایک اور نئی ایکسٹنٹ تھی..

جامنی رنگ کی نارتھ فیس جیکٹ..

یہ پہلو سے آئی تھی..

کیسے آئی تھی، اس کا ذکر کرنا میں بھول گیا تھا..

یہ میں نے ایک بگتی سردار سے حاصل کی تھی..

کھٹکے کی صلاحیت یوں بھی کم رہ گئی تھی..

شاہد صاحب کیمرے کو اتنی سنجیدگی سے آپریٹ کرتے تھے جیسے وہ پہلے ایٹم بم کو ڈی ٹوئیٹ کرنے کو ہوں.. ان کا خاصا تھا کہ وہ نہایت اہتمام سے اور دھیرج سے سلوموشن میں کیس میں سے کیمرہ نکالتے پھر تادیر روشنی، دھوپ اور سائے کا اندازہ لگاتے.. اپرچر.. سپیڈ اور پتہ نہیں کیا کیا سیٹ کرتے اور پھر ایک عجیب سا زاویہ بنا کر بہت سوچ سمجھ کر کیمرے کا ٹین دہاتے.. جیسے داد طلب کر رہے ہوں کہ بچہ آج تک کبھی کسی نے تمہاری ایسی نایاب تصویر اتاری ہے.. اس احتیاط اور اہتمام کا نتیجہ یہ نکلا.. کہ لاہور واپسی پر جب انہوں نے اپنی آٹھ فلمیں پرنٹ کروائیں تو تصویروں میں ہر جانب تاریکی ہی تاریکی تھی.. کچھ سائے تھے.. کچھ ہولے تھے اور یا پھر ان کی احتیاط تھی..

حسن کا کیمرہ فلٹر کچھ وائٹریک کے دوران ایک ندی میں منہ کے بل گر گیا تھا.. وہ ذاتی طور پر خود ہی تو نہیں گر گیا تھا، اس کے ساتھ حسن صاحب تھے، اس لیے اب وہ ایک نیا کور کیمرہ نمائش کرتے پھرتے تھے جو انہوں نے اپنی بیگم کی معاونت سے خریدا تھا اور اس کے نتائج بعد میں حوصلہ افزا برآمد ہوئے..

اور سلمان اس زعم میں تھا کہ جناب یہ کیمرہ تو آسٹریلیا سے آیا ہے.. یہ بُری تصویر کھینچ ہی نہیں سکتا..

صرف میں اپنے محبوب اشانی فوٹوگرافس کے بغیر تھا..

میں منظر کو قلم پر نہیں اپنے بدن پر کھینچتا چلا جاتا تھا..

آج.. ہمیں درہ گندوگورو کے ٹیس کیپ تک پہنچنا تھا اور پھر اس کی چوٹی پر یلغار کرنا تھی.. خیمے زمین بوس ہونے لگے..

”آج کا سفر کیسا ہے؟“ میں نے حسب عادت اور روایت اسحاق سے پوچھا..

”ادھر نکلے گا تو سائے تھوڑا چڑھ چکا ہے.. پھر گلیشیر پر اتر جائے گا.. آسان ہے..“

”گلیشیر پتھر پلا ہے؟“

”ہاں ناں..“

”سفید ہے یا سیاہ ہے؟“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے صاحب!“

سارا دن چلا نا۔ گلیشیر پر۔ اور انہیں اتنی بلندی تک لے جانا۔ پندرہ ہزار فٹ کی بلندی تک۔
لے جانا مناسب ہوگا۔ کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔“

پچھلی شب میں نے بہت دیر حسن کے بارے میں فکر مندی کی تھی۔ واقعی اس کی حالت کچھ غیر سی ہوئی جاتی تھی لیکن وہ ایک بہادر شخص تھا۔ معصومیت سے مسکراتا چلتا جاتا تھا اور پوچھنے پر کہتا تھا۔ جی آپ فکر نہ کریں۔
”تو پھر کیا کریں عامر۔“

”میرا خیال ہے کہ اس حالت میں انہیں سارا دن چلانا اور اتنی بلندی تک لے جانا خطرناک ہے۔ راستے میں یا وہاں پہنچ کر ان کی طبیعت مزید خراب ہوگئی تو کیا کریں گے۔ بہتر یہی ہے کہ انہیں یہیں دل سنگ پا میں چھوڑ جائیں۔ کسی پورٹر کے ساتھ یا ہم میں سے کوئی ایک ٹھہر جائے۔ کل شام تک کی تو بات ہے۔ ہم واپس آجائیں گے۔“
کسی بھی ٹریک کے دوران چھوٹے موٹے سائے تو ہوتے رہتے تھے لیکن کبھی اس قسم کی صورت حال کا سامنا نہیں ہوا تھا۔

یوں تو ہم کے کبھی مہران ہمیں پیارے تھے لیکن حسن صاحب تو نہ صرف ہمیں پیارے تھے بلکہ راج ڈلارے تھے اور ہم ان کے بھولپن کا خاص خیال رکھتے تھے۔

”ایسا کرتے ہیں کہ برمانی سے مشورہ کرتے ہیں۔ وہ انہیں میڈیسن بھی دیتا آیا ہے۔ تو وہ بہتر طور پر فیصلہ کر سکتا ہے کہ حسن صاحب سفر کے قابل ہیں یا نہیں۔ اگر نہیں تو انہیں یہاں چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔ ہم سب یہیں ٹھہر جائیں گے۔ آگے جا کر ایک ایسے مقام پر حسن صاحب کے بغیر جا کر کیا کرنا ہے جس کا نام بھی ہمیں معلوم نہیں۔ آج کا دن یہیں ریست کریں گے اور پھر واپس۔“

برمانی کو طلب کیا گیا۔ وہ دل سنگ پا کی جھیل کے کناروں پر ڈوڑکی لگا رہا تھا اور بے چین تھا کہ کب سفر کا آغاز ہو اور وہ قلائدیں بھرتا وہ سائے والی بلندی پر چڑھ جائے اور وہاں سے ہمیں ہاتھ ہٹا کر SEE YOU کہہ کر غائب ہو جائے۔

”ہاں۔ کل شام تو حسن صاحب کا چہرہ قدرے سوجا ہوا تھا۔ ہلکا بخار بھی تھا۔ موٹن بھی آ رہے تھے لیکن میں نے ابھی ابھی ان کا چیک اپ کیا ہے۔ وہ بہت بہتر ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ آہستہ آہستہ چل سکتے ہیں، کوئی خطرہ نہیں۔“

”خپلو کے بازار میں یہ عام تھا جس نے وہاں ایک ایسی دکان دریافت کر لی تھی جس کے کاؤنٹر کے پیچھے ایک بگتی کھڑا تھا۔ ہمارے لیے یہ نہایت اچھے کی بات تھی کہ آخر بلوچستان سے چل کر بلتستان میں آ کر ایک بگتی پرانے جوتے۔ کپڑے۔ لالٹینیں اور ٹائلٹ پیپر کے رول وغیرہ کیسے بیچ رہا ہے۔ بہر حال ان بگتی صاحب کے ہاں کسی غیر ملکی مہم کے گوروں کے بدنوں کی اترن کچھ نہایت شاندار جیکٹیں اور ونڈ چیز ہے تھے اور تھے بھی نارٹھ فیس براؤڈ کے جو کہ نورودی کا سامان بنانے والی نہایت معتبر اور معروف فرم ہے۔ ہم نے پہلے یہ طے کر لیا تھا کہ واپسی پر یہ کسی کو نہیں بتائیں گے کہ ہم یہ جیکٹیں خپلو کے لٹڈے بازار سے خرید کر لائے ہیں تاکہ عزت سادات اگر تھی تو محفوظ رہے۔ اور یقین جاننے کہ یہ راز آج تک ایک راز ہے۔ بہر حال جیکٹیں وغیرہ خریدنے کے بعد۔ اگرچہ یہ سائز میں اتنی بڑی تھیں کہ ہم انہیں پہن کر مست مانگ لگتے تھے اور دور سے پہچانے جاتے تھے کہ ان لوگوں نے دراز قد گوروں کی اترن زیب تن کر رکھی ہے۔ لیکن ہم ان کے رنگ اور ڈیزائن سے اتنے مبہوت ہو چکے تھے کہ وہ نہ سکے۔ تو انہیں خریدنے کے بعد ہم نے بگتی صاحب سے دریافت کیا کہ سائیں آپ خپلو کب اور کیسے تشریف لائے۔ تو انہوں نے پرتسم ہو کر فرمایا کہ صاحب ہم تو پیدا ہی ادھر ہوا ہے۔

اس پرتسم کے پہلے بلوچ ممبر برمانی نے بے پایاں مسرت کا اظہار کیا کہ یہ تو ایک نئی تحقیق کا درکمل گیا ہے کہ وادی خپلو میں بھی بلوچ اور بگتی پائے جاتے ہیں۔ لیکن برمانی کی یہ بے پایاں مسرت پایاں ہوگئی جب ان صاحب دکان نے بڑے فخر سے بتایا کہ صاحب ہم تو خالص بلتی ہیں۔ لیکن قصہ کچھ یوں ہے کہ میرے والد صاحب قبلہ نہایت رعب دار شخصیت کے مالک تھے۔ سیاہ چشمہ پہنتے تھے اور بڑی بڑی مونچھیں رکھتے تھے تو اہل خپلو انہیں چھیڑتے تھے کہ تم تو بگتی لگتے ہو۔ چنانچہ وہ بگتی ہو گئے۔ اور وہ ہو گئے تو ہم بھی ہو گئے۔ اب ہمارا چھوٹا بچہ لوگ بھی بگتی ہے۔

تو بگتی بھائی سے خرید کر وہ جامنی رنگ کی۔ اپنے سائز سے کہیں بڑی نارٹھ فیس کی جیکٹ پہنے۔ قدرے پختہ لگتا ہوا میں اپنی میٹرز پر بیٹھا تھا کہ عامر بھی ایک ایسی ہی جامنی جیکٹ میں لہراتا ہوا میرے پاس آ گیا۔ ”مارڈ صاحب۔ ایک مسئلہ ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ حسن صاحب کچھ ٹھیک نہیں ہیں۔ کل شام تو ان کا چہرہ سوجا ہوا بھی لگتا تھا اور انہیں بخار بھی تھا۔ اور یہ بلندی کی بیماری کے آثار لگتے ہیں۔ آج ہم مزید پونے دو ہزار فٹ اوپر جائیں گے۔ تو کیا انہیں

”آرٹھو“

”بالکل.. لیکن حسن صاحب سے بھی پوچھ لیا جائے تو بہتر ہے۔“

حسن صاحب سے پوچھا گیا..

”نہیں جی.. حسن صاحب شرماتے ہوئے بولے ”آج تو اللہ کا فضل ہے.. پائیاں

بھی بند ہو گئی ہیں.. بخار بھی نہیں.. تھوڑی سی کمزوری ہے تو میں آہستہ آہستہ چلوں گا..“

اُن کے اس بیان پر اگر تو میں احتیاط پسند ہوتا اور بے حد ایماندار ہوتا تو یہی کہتا کہ.. نہیں حسن صاحب.. ہم یہ رسک ہرگز نہیں لے سکتے.. زندگی موت کا معاملہ ہے، ہم سب یہیں ٹھہریں گے اور کل واپس.. لیکن میں نے تھوڑی سی بے ایمانی کی.. کہ میں جسے انگریزی میں کہا جاتا ہے کہ ان مائی ہارٹ آف ہارٹس.. یعنی اپنے دلوں کے دل میں یہی چاہتا تھا کہ ہم ہر صورت گندو گور و مین کیپ تک جائیں.. اس لیے میں نے کہا.. کہ بس جی فیصلہ ہو گیا.. ٹیم ڈاکٹر نے بھی اوکے کر دیا ہے اور حسن بھی معترض نہیں تو انشاء جی اب کوچ کرو..

بہر حال ایک شرط تھی.. کہ برمانی چولستانی ہرن ہو جانے سے باز آ جائے اور حسن صاحب کے ہمراہ رہے.. ان کی ہنس چیک کرتا رہے.. گولیاں کھلاتا رہے..

دل سنگ پا کو چھوڑتے ہوئے مجھے اُس پر بڑا ترس آیا..

کیونکہ وہ ہماری روائگی سے ویران ہو گئی تھی.. بیوہ ہو گئی تھی..

یہ شائی پھوکی خیمہ گاہ نہ تھی جسے ہماری روائگی سے کچھ فرق نہ پڑا تھا اور وہاں جو میلہ لگا ہوا تھا، اُسے احساس بھی نہیں ہوا تھا، کچھ میلہ گھومنے والے آئے تھے اور چلے گئے..

دل سنگ پا کو بہت فرق پڑا تھا..

اُس کی جھیل کے پانی پڑ مردہ ہو گئے تھے اور اُس کے آس پاس جو درجنوں گلشیر

اُترتے تھے اور مشاہیرم کی برقیں.. سب کے سب بے وقار ہو گئے تھے..

کیونکہ کوئی بھی چہرہ یا منظر کسی کام کے نہیں رہتے.. بیکار اور تباہ جاتے ہیں.. دیکھنے والے ہی نہ ہیں تو وہ چہرے اور منظر کسی کام کے نہیں رہتے.. بیکار اور تباہ جاتے ہیں..

ہم دل سنگ پا کو بیکار کر کے.. اس کی تنہائی میں سے نکل کر ایک بلند کنارے پر پہنچے اور

ایک پگڈنڈی پر چلنے لگے..

”برف کے صحراؤں میں بھکتی ایک لیلہ..“

دائیں ہاتھ پر وہی گندو گلشیر ہمارا ساتھ دیتا تھا اور اس میں بہت سے برفانی وجود اُتر رہے تھے..

یہاں بھی گلشیر کے دامن میں ہریاؤں پھول اور ندیاں رخصت ہو چکے تھے.. اُن میں چلتے ہوئے ایک مرتبہ پھر احساس ہوا کہ ہم دیر سے آئے تھے.. ہمیں پچھلے ماہ ادھر سے گزرنا چاہیے تھا..

حسب معمول سامنے سے غیر ملکی کوہ نور دوں کے ریوڑ اُتر رہے تھے.. دندنا تے ہوئے اُتر رہے تھے اور ہم ان کے گزرنے کے لیے جگہ بناتے تھے..

پتہ نہیں یہ کافر کے بچے آج صبح کتنے بچے گندو گورو کے مین کیپ سے چلے تھے کہ ہم نے ابھی اپنے سفر کا آغاز کیا تھا اور یہ دل سنگ پا کی قربت میں پہنچ رہے تھے..

کنارا جس پر ہم چلتے تھے.. ذرا اونچا ہوا.. کچھ پتھر ملا ہوا اور پھر یکدم یہ اختتام پذیر ہو گیا اور آگے گندو گورو راستہ روکے کھڑا تھا..

ہمیں بہر طور نیچے اُتر کر گلشیر پر چلنا تھا..

نہایت احتیاط سے اُترتے ہوئے گلشیر تک پہنچنا تھا.. جو ہم پہنچ گئے..

نیچے ہر گلشیر کے شروع میں ہمیشہ بڑے بڑے پتھروں کا ایک سلسلہ ہوتا ہے.. اور پھر دراڑیں ہوتی ہیں.. ان پتھروں پر آپ کو بہت دیکھ بھال کر قدم رکھنے ہوتے ہیں.. ان پر آپ چہل قدمی نہیں کرتے.. چلتے نہیں بلکہ چھوٹی چھٹائیں لگا کر آگے جاتے ہیں.. ایک چٹان پر سے کود کر دوسری کو پہلے سے چانچتے ہیں کہ اس پر قدم کہاں پڑنا چاہیے اور ان دونوں چٹانوں کے درمیان جو

میں چلا تو گلیشیر پر تھا لیکن گردن میڑھی کر کے دائیں جانب بس اسے مسلسل دیکھتا جاتا تھا اور اگر یہ کوئی نامراد گلیشیر ہوتا تو میں کب کا بے دھیانی میں کسی دراڑ میں گر چکا ہوتا۔
مجھے خدشہ ہوا کہ مسلسل اس کی جانب دیکھتے دیکھتے میری گردن میں بل آ جائے گا۔
اس لیے میں نے اپنا دھیان سامنے کیا جہاں برمانی تھا۔ اس لیے حسن کا ہاتھ تھا مے شامد اس کی نبض چیک کرتا چلا جا رہا تھا۔

”برمانی۔“

”جی۔“

”یاریہ کیسی لپٹے ہے؟“

”جی؟“ برمانی بھی شامد شاہد صاحب کی مانند ذرا اونچا سنتا تھا۔ اس لیے یکدم سوال کرنے پر ہمیشہ چونک جاتا تھا اور ایک لمبی ”جی ای ای“ کرتا تھا۔

”میں اس پیک کی بات کر رہا ہوں۔ لپٹے پیک۔ کیا چوٹی ہے۔ لپٹے برمانی۔“

”سبحان اللہ سائیں آپ نے جو اس چوٹی کو لپٹے برمانی کہا ہے تو میرا دل موہ لیا ہے۔“
میں کچھ پزل سا ہو گیا۔ ”کیا مطلب؟“

”لپٹے کے نام کے ساتھ ہمارا نام برمانی لگا کر بولے ہو جیسے یہ ہماری مشکوہ ہو تو ہمارا دل خوش ہو گیا ہے سائیں۔“

برمانی میری نظروں میں کچھ مشکوک ہو گیا۔ ”بھئی۔ یہ تو بگلتا ہے کہ ابھی ابھی یہاں ایک خلا تھا اور یکدم یہ وجود میں آ گئی ہے۔ اب دکھائی دی ہے۔“

”سائیں آپ تخت لبور کے باشندے ہو، شہر کے شور اور میدانوں کے باسی ہو تو آپ کو یہ اب دکھائی دی ہے۔ ہم صحرا کے کینوں کو تو یہ ایک مدت سے دکھائی دے رہی ہے۔“

”برمانی تم براہ کرم ایک مرتبہ فیصلہ کر لو کہ تم ہو کیا؟۔ کبھی تم سرائیکی بولنے لگتے ہو۔ کبھی تم بلوچ ہونے کا دعویٰ کرتے ہو۔ کبھی کوہ سلمان سے رشتہ جوڑ کر مر دوستان ہو جاتے ہو اور کبھی صحرا کا باسی ہونے کا دعویٰ کرتے ہو۔ اور اس کے ساتھ سندھ سائیں کے بھاری ہونے پر بھی فخر کرتے ہو۔ تو تم ہو کیا؟“

”سائیں آپ کے اور ہمارے بیٹھے شاہ نے کہا تھا کہ کی جاناں میں کون اُوں باہیا۔ کی جاناں میں کون۔“

خلا ہے، اس میں اگر لینڈ کریں گے تو ٹانگ خلا میں جائے گی اور ٹوٹ جائے گی۔ بس اتنا خیال رکھنا پڑتا ہے۔

اور یہ بھی خیال رکھنا پڑتا ہے کہ اگلا قدم جس پتھر پر رکھنا ہے تو وہ پتھر ہی ہے ناں۔ کہیں بجری سے ڈھکی ہوئی سخت برف تو نہیں جس پر قدرے بے احتیاطی سے پڑنے والا بوٹ یوں پھسلتا ہے کہ آپ ایک مختصر سی قلابازی کے بعد بھی اٹھ بیٹھتے ہیں، ہائے ہائے کرتے ہیں اور کبھی نہیں اٹھتے اور آپ کے ساتھی ہائے ہائے کرتے ہیں کہ ہائے ہائے مجب آزا دمرد تھا۔

کنارے کے ان پتھروں پر چلتے چلتے ہم گلیشیر کے درمیان میں پہنچ گئے جو سیاہ رنگ کا تھا اور یعنی مادہ تھا اور اس پر چلنا آسان تھا۔ اس کی دراڑوں کی شکلیں بھی ایسی تھیں کہ دور سے پتہ چلتا تھا کہ یہ مادہ ہی ہے۔

ہم اس گندو گور گلیشیر سے زیادہ متاثر نہ ہوئے یعنی ہم میں سے جو سنولیک کے سفر کے دوران دنیا کے طویل ترین گلیشیر پر قدم رنج فرما چکے تھے، اگر ہم نے ان قدم رنجوں کے دوران رنج بھی بہت اٹھائے تھے۔ ان کے مقابلے میں تو یہ ایک بچہ گلیشیر تھا۔ لیکن احتیاط پھر بھی لازم تھی۔
یہیں پر گندو گورو پر چلتے ہوئے دائیں جانب لپٹے نے پہلی بار اپنے وجود کی سفید عریانی کو ہم پر ظاہر کیا۔

وہ پہلے تو وہاں نہیں تھی۔

شامد اُس نے ابھی ابھی میری پہلی سے ایک اماں خوا کی طرح جنم لیا تھا اور دائیں ہاتھ پر بلند ہو گئی تھی۔

اس صحرائے برف میں بھٹکتی ہوئی اچانک کہیں سے آ نکلی تھی۔

متعدد برفانی بلندیوں میں سے قد نکالتی ہوئی۔ چھریرے بدن کی ترچھی ٹکون کی صورت اٹھتی لپٹے۔ جس کی چوٹی اُس ٹکون کی ایک ایسی نوک تھی جس پر کوئی دودھ پیتا مجنوں تو نہیں جاسکتا تھا۔

ہمارے کو ہستانی سفر کے دوران کے سکس۔ کے سیون اور مشاہیر ہم پر ظاہر ہوئیں۔
ہم ان سے مرعوب بھی ہوئے اور مسکور بھی لیکن وہ محض برف تھیں۔ چٹانیں تھیں لیکن لپٹے۔ گوشت پوست کی بنی لگتی تھی۔ بدن ابھاروں اور گرم جذبوں سے سلگتی چوٹی لگتی تھی۔ زندہ لگتی تھی۔ یہ ایسی لپٹے تھی۔

یہ نیکون آسمان میں چھید کرتی ہوئی، قدرے ترچھی ایک ایسی ہی چوٹی تھی جو دل میں جگہ بناتی دل کش ہوتی بدن میں اترتی تھی۔

میں جب تک گندوگور و گیشیر پر چلتا رہا، ایک نظر سامنے ڈالتا اور دوسری نظر اٹھاتا اور لیلے پیک پر رکھ دیتا۔

جس زاویے سے وہ مجھے نظر آ رہی تھی وہاں سے اس کی ترچھی نیکون چڑھائی ایسی تھی کہ اس پر کسی کوہ پیا کے قدم تو کیا کسی پرندے کے پنچے بھی ٹھہر نہ سکتے تھے۔

اس کا چٹائی برفانی وجود آسمان سے اپنی نوک چھوتا ہم سے بہت غافل اور الگ تھلگ تھا اور ہم خواہ مخواہ اس کے عشق میں مبتلا اس میں اپنی اپنی لیلیاؤں کو دیکھتے تھے۔ خیر ہو تیری لیلیاؤں کی آج کی شب جب دیئے جلا نکیں اونچی رکھیں لو۔

”پار اتنی بلندی پر تو اس مجلسی دانشوری کی مار نہ دو۔“

”نہیں سائیں تو یہ تو یہ، دانشوری کا دعویٰ کس بد بخت کو ہے لیکن سچ کہتا ہوں کہ میں ابھی تک واقعی یہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ میں کون ہوں۔ کبھی مجھے اذان سنائی دیتی ہے اور کبھی تخی سرور کے مزار کے باہر وہ مقام بلاتا ہے جہاں ٹولنگ ہوا کرتا تھا اور کبھی میں کالاش کافروں کے قبیلے میں شامل ہو جاتا ہوں تو مجھے نہ پوچھئے کہ میں کون ہوں۔ لیکن میں جو کوئی بھی ہوں، اس لیلے کے عشق میں فنا ہو چکا ہوں۔“

”جانے دو برمانی۔“

”سچ کہتا ہوں سائیں۔“

”تمہارا کیا ہے برمانی، تم تو ناگ پرست کے سامنے جولالی پیکٹ پیک ہے، اس پر بھی لٹو ہو گئے تھے اور وہ تمہیں خواب میں ایک سفید لباس میں ملبوس دولہن کی صورت میں جلوے دکھاتی تھی۔ تمہارا کیا ہے تم تو سفید گھوڑیوں کے وصل کی خواہش میں بھی گم رہتے ہو۔“

”سچ کہتا ہوں سائیں۔“ اور وہ حسن کو سہارا دیتا آگے بڑھ گیا۔

برمانی ہم سب سے ایک الگ طبیعت ایک الگ طبع کا شخص تھا۔

ہم سب اگرچہ خصلتیں مختلف رکھتے تھے لیکن ہمارا سانچہ ایک ہی تھا۔ ہمارے عقیدے، اخلاقیات اور سوچ تقریباً ایک ہی سانچے میں ڈھلتے تھے لیکن برمانی ہم سے الگ کسی اور ہی سانچے سے وجود میں آیا تھا۔ میں نے اس کے لیے ”طبع“ کا لفظ وارث شاہ سے مستعار لیا ہے کہ ”طبع پالی وی حرص تھیں نہ باز آئی، تو برمانی کی یہ طبع ہم سے بہت مختلف تھی۔ بے حد حریص تھی جو برفانی چوٹیوں اور سفید گھوڑیوں کے وصال کی خواہش کرتی تھی۔

ویسے تو مجھ پر بھی برف بلندیاں، جھیلیں اور جنگل کچھ الگ انداز میں اثر کرتے تھے۔ جیسے وہ زندہ ہوں، اُن کے بدنوں میں بہاؤ میں حرارت اور زندگی ہو۔ چاہے وہ شاہ گوری ہو جس کی سفیدی پر بوسوں سے نیل پڑتے تھے یا جھیل کرومبر جو جس کے پانیوں میں اترتے ہوئے میں ان کی تہہ کو چھوتا تھا تو وہ آہ بھرتے تھے۔ یا فیروی میڈو کے جنگل ہوں جن کا ہر شجر، چاہے وہ سر بلند اور زندہ ہو اور چاہے برسوں سے زمین بوس ہو چکا ہو، مجھے آغوش میں لینے کے لیے بے قرار ہو۔

کچھ اسی طور پر لیلے تھی۔

ان کو راہ دکھانے والا ایک پاکستانی گائیڈ تھا۔ اور یاد رہے کہ آج میں گھوڑا ہو چکا تھا۔
کیسے ہو چکا تھا اس کا احوال اس ہسپانوی گروپ کے گزر جانے کے بعد آپ کی
خدمت میں عرض کروں گا۔

تو حسب معمول یہ پاکستانی گائیڈ جو ان ہسپانوی سیاحوں کو راہ دکھا رہا تھا میرے
قریب آیا۔ گلیشیر پر چلنے کے لیے ایک مخصوص راستہ یا پگنڈی ہوتی ہے اور آپ اُس سے
انحراف نہیں کرتے کیونکہ آس پاس کھائیاں اور دراڑیں ہوتی ہیں۔ چنانچہ ہر کوئی ایک ہی راستے پر
چلتا ہے اور جو کوئی بھی سامنے سے آئے گا، تو اس سے آپ کی ملاقات بہر طور ہوتی جائے گی۔

یہ پاکستانی گائیڈ اپنی غیر ملکی بھیسروں کو ہانکتا میرے قریب آیا تو نور حیات تھا۔ میں
ایک قدرے غیر معروف گلیشیر پر اپنی بھیسروں کو ہانکتے ہوئے ایک گائیڈ کو کیسے جانتا تھا؟ وہ
1990ء میں کے ٹو پر جانے والی امریکی مہم کے رابطہ افسر کیپٹن ہنریکس تارز کا ساتھی اور پورٹ تھا۔
جو برالڈورے کی ایک تنگی اور بلند چٹان پر ہانپتے پیا سے ہنسر کے لیے اپنی جان خطرے میں ڈال
کر کہیں نیچے دریا تک لڑھکتا ہوا گیا تھا اور اس کے لیے پانی لے کر آیا تھا۔

اور پھر ”کے ٹو کہانی“ کے زمانے میں وہ کنکورڈیا کے راستے میں مجھے مل گیا تھا اور اس
نے مجھے نہایت اعلیٰ ذائقے کا پلاؤ کھلایا تھا۔

یہ وہی نور حیات تھا۔

وہ جو انگریزی میں کہتے ہیں ناں کہ۔ اُس اے سال ورلڈ۔ تو واقعی یہ ایک چھوٹی سی دنیا
تھی۔ پاکستانی شال کی چھوٹی سی دنیا تھی۔ جس میں آشنا اور دوست چہرے کہیں نہ کہیں آئے
سامنے آ جاتے تھے۔ نور حیات کے ننھے اب بھی پھر کتے تھے اور وہ بھی زمانے کے گزرنے کے
نشان اپنے چہرے پر ٹیکروں کی صورت رکھتا تھا۔

مجھے دیکھ کر اس کے سفید۔ خوش شکل چہرے پر ایک زبردست حیرت اور مسرت کی
مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے میرا حال احوال پوچھا۔ ہنسر کے بارے میں استفسار کیا اور پھر پوچھا
کہ صاحب کدھر سے آ رہے ہو اور کدھر جا رہے ہو؟ اور ابھی تک اس عمر میں بھی آ جا رہے ہو۔
پھر اپنے گروپ کے کوہ نور دوں کے ساتھ میرا تعارف کر دیا۔

میں نے نوٹ کیا کہ مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے یہ ہسپانوی خواتین و حضرات کچھ عجیب
انداز میں مسکراتے تھے۔ ایسے مسکراتے تھے جیسے میں ان کے سامنے نہ ہوں چارلی چپلن ہو، اپنے

”میں لیلے کے عشق میں.. گھوڑا ہو گیا“

تہا اور الگ صرف لیلے تھی۔ گندو گورو گلیشیر نہ تھا۔ یہ مال روڈ بنا ہوا تھا۔

جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں کے ٹو جانے والے جتنے بھی کوہ نور تھے، وہ اٹلے پاؤں
اشکو لے جانے کی بجائے وزہ گندو گورو پار کر کے اب ادھر اترتے تھے اور شائی چو کے راستے
ہوشے کو منزل بناتے تھے۔

ایک ایسی ہی غیر ملکی مہم کے چند افراد بھٹکتے ہوئے سامنے سے چلے آ رہے تھے۔ اُن کا
پاکستانی گائیڈ ان بھیسروں کو راستہ دکھاتا ہوا میری طرف بڑھ رہا تھا۔ میرے قریب آیا تو ایک نظر
مجھ پر ڈالی۔ اور نہایت رکھائی سے کہا۔ ”تارز صاحب ہیں ناں؟“

”جی۔“

”پھر آ گئے ہو۔“

میں رگ گیا کہ اس شخص نے مجھے پہچان لیا ہے تو اب کچھ گپ شپ کرے گا لیکن یہ
نہیں کون نامعلوم شخص تھا کہ وہ رکا نہیں۔ بس یہ کہہ کر کہ ”پھر آ گئے ہو“ چلتا گیا۔ میں نے پیچھے مڑ
کر بھی دیکھا لیکن وہ رکا کے بغیر چلتا جا رہا تھا۔

اس ”پھر آ گئے ہو“ میں کچھ حیرت تھی اور بہت سی تضحیک۔

میں ابھی اس ”پھر آ گئے ہو“ کے شاک میں تھا جب گلیشیر پر اترتا ایک اور غیر ملکی
گروپ نمودار ہو گیا۔

میں نے پہلے ہی اپنی اس حیرت کا اظہار کیا تھا کہ نامعلوم وجوہات کی بنا پر ان علاقوں
میں اس برس بیشتر کوہ نور ہسپانیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اور یہ گروپ بھی ہسپانوی تھا اور حسب معمول

پورے شمال کو خبر ہو جاتی ہے کہ میں اس برس کہاں دیکھا گیا ہوں۔

دیوسائی ٹریک کے دوران جب مجھے بتایا گیا کہ پورے دیوسائی میں صرف میں بائیس ریچھ ہیں تو مجھے یقین نہ آیا کیونکہ موسم گرما میں پورے سکرو میں ریچھوں کی دھوم ہوتی تھی۔ ہر دوسرا شخص گواہی دیتا تھا کہ دیوسائی پر تو اتنے ریچھ ہیں کہ ان کو چلنے پھرنے میں بھی دشواری پیش آتی ہے۔ یا تو ہر ایک نے ریچھ دیکھا ہوتا تھا اور یا پھر اسے بتایا گیا ہوتا تھا کہ جناب میں نے خود دیکھا ہے۔ چنانچہ مجھے یقین نہ آیا کہ دیوسائی پر صرف میں بائیس ریچھ رہائش پذیر ہیں۔ پھر جنگلی حیات کے رفیق راجپوت نے یہ مسئلہ حل کر دیا۔

”تارڑ صاحب دیکھیں۔ اگر روزانہ میں یا بچیس جیتھیں دیوسائی سے نیچے سکرو میں اترتی ہیں اور کسی روز کوئی ایک ریچھ روڈ کے آس پاس ٹھہلتا نظر آ جاتا ہے تو گویا بچیس جیپوں میں سوار تقریباً دو سو افراد نے اس ایک ریچھ کو دیکھا۔ اب وہ دو سو افراد اپنے دو ہزار جاننے والوں کو بتاتے ہیں کہ ہم نے خود دیوسائی پر ریچھ دیکھے ہیں۔ اور وہ دو ہزار افراد مزید لوگوں کو یہی کہانی سناتے ہیں اور یوں ریچھ صرف ایک ہوتا ہے لیکن تاثر یہ ابھرتا ہے کہ جانے والے وہاں ہزار ریچھ ہیں۔“

شمال میں میری موجودگی کی دھوم بھی اسی گھبے کے مطابق ہوتی تھی۔

تارڑ صاحب ایک ہوتا تھا اور۔

اور ہاں اب وہ قصہ کہ میں اس روز گھوڑا ہو گیا تھا۔

یہ نہایت یونیک تھیس ڈاکٹر عمر نے ”کے ٹو کہانی“ کے دوران پیش کیا تھا۔

یعنی۔ کوہ نور کا پہلا دن جب وہ اپنی جیب سے چھڑ کر ان ویرانوں میں قدم رکھتا ہے جہاں صرف قدم ہی جاتے ہیں تو وہ دن پر مشقت اور اذیت والا ہوتا ہے۔ اس کی بے بسی اور تھکاوٹ عروج پر ہوتی ہے۔ پھر دوسرا دن آتا ہے تو وہ ذرا بہتر چلنے لگتا ہے۔ اگرچہ نڈھال ہوتا ہے اور پاؤں میں چھالے ابھرتے ہیں اور رانوں میں خراشیں ہوتی ہیں لیکن وہ گرتا پڑتا اپنی منزل تک پہنچ جاتا ہے۔

لیکن تیسرے دن وہ گھوڑا ہو جاتا ہے۔

اور واقعی کے ٹو ٹریک کے تیسرے دن میں گھوڑا ہو گیا تھا۔

شائد اس میں ڈاکٹر عمر کی عطا کردہ ان ونامن گولیوں کا بھی کمال ہو جو میں نے صبح سویرے چھانک لی تھیں اور مجھے شک ہے کہ ان میں کچھ سٹیروئڈ کی آمیزش تھی لیکن میں ایک بہت

چھاتے۔ ڈیجیٹل پتلون اور پھر کتنی ہوئی مونچھوں کے ساتھ۔

”نور حیات یہ حضرات مجھ سے مل کر کچھ ضرورت سے زیادہ خوش ہو رہے ہیں اور بے وجہ مسکرا رہے ہیں تو کیوں۔“

نور حیات قدرے پریشان اور پشیمان ہو گیا اور اپنی پھڑکتی ہوئی ناک کھبا کر کہنے لگا

”صاحب ایک چھوٹی سی بدتمیزی ہو گئی ہے۔“

”کیسی بدتمیزی؟“

”در اصل ہم لوگ۔ گائیڈ لوگ۔ جب بھی غیر ملکی کوہ نور دوں کو لے کر پہاڑوں اور گلیشیرز میں جاتے ہیں تو ہمیشہ ایک ہی سوال پوچھا جاتا ہے کہ تمہارا شمال اتنا یونیک اور زبردست ہے اور یہاں صرف غیر ملکی آتے ہیں تمہارے ملک کے باشندے کیوں نہیں آتے۔ آپ کے نمودار ہونے سے چند لمحے پہلے یہی سوال پھر اٹھایا گیا تھا کہ ہم نے پورے ٹریک کے دوران کوئی پاکستانی کوہ نور نہیں دیکھا۔ اور تب آپ نظر آ گئے۔ آپ کے ساتھی دکھائی دینے لگے۔ آپ دور سے پہچانے تو نہیں جا رہے تھے لیکن آپ کی بے ڈھنگی چال سے اندازہ ہوتا تھا کہ جو بھی یہ شخص ہے سخت مشکل میں ہے اور پاکستانی ہے۔ تو میں نے نہایت فخر سے اعلان کیا کہ سنیور۔ سنیور تیا۔ آپ شکایت کر رہے تھے کہ ان پہاڑوں میں کوئی پاکستانی نہیں آتا تو لیجیے سامنے سے ایک پاکستانی آ رہا ہے اور اس کا نام تارڑ ہے۔ کتاہیں لکھتا ہے اور ٹیلی ویژن پر میزبانی کرتا ہے۔ تو انہوں نے دریافت کیا کہ اتنی دور سے صرف ایک جامنی رنگ کی جیکٹ نظر آ رہی ہے تو تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ یہ وہی شخص ہے جس کا تم نام لے رہے ہو۔ تو میں نے وہی چھوٹی سی بدتمیزی کی اور کہا۔ پاکستان میں صرف ایک ہی تنہا پاگل شخص ہے تو وہی ہو سکتا ہے۔ ہم قریب آئے تو آپ۔ میرا مطلب ہے کہ وہ وہی تھا۔ اس لیے آپ سے ہاتھ ملاتے ہوئے یہ لوگ مسکرا رہے تھے۔“

”جھینک یو۔ نور حیات۔ عجیب سا کوہلی منٹ دیا ہے تم نے۔ لیکن جھینک یو۔“ میں نے نور سے اور اس کے ساتھی کوہ نور دوں سے باری باری ہاتھ ملایا اور آگے بڑھ گیا۔

شمال بہت بڑا ہے۔ ایک کائنات ہے۔ اور اس کائنات میں میری حیثیت ایک ذرے سے بھی کم ہے۔ لیکن۔ پچھلے بیس برس سے ہمیشہ یہ ہوتا چلا آیا ہے کہ میں بے شک ”یاک سرائے“ کی وادی سوختر آباد میں خیمہ زن ہوں یا ”سنولیک“ کی برفوں میں کسی برفانی پل صراط پر چلتا ہوں تو

ہی چھری اور درازوں کو پھٹا نگ جانے والا اُن تھک گھوڑا ہو گیا تھا۔ لیکن ایک عجیب سانحہ ہو گیا۔
کے ٹوڑیک کے بعد میں نے جتنے بھی ٹریک کئے، میں نے ہمیشہ تیسرے دن کا بے تابی سے انتظار
کیا کہ آج تو ہم گھوڑے ہو جائیں گے اور ہم کبھی بھی نہ ہوئے۔ ہمیشہ وہ ناکارہ فخری رہے
جنہیں بیکار جان کو کوئی ماردی جاتی ہے۔ چنانچہ قابل فہم طور پر ڈاکٹر عمر کے اس تھیس پر سے میرا
ایمان اُٹھ گیا۔ لیکن آج.. گندو گورڈریک کے تیسرے دن یہ جزو ہو گیا تھا۔

میں نے اپنے تمام ساتھیوں کو پیچھے چھوڑ دیا تھا اور بگٹ چلتا جاتا تھا۔ نہ میرے بدن
میں کوئی زیادہ تھکاوٹ تھی اور نہ بلندی مجھ پر کوئی خاص اثر کرتی تھی اور میں ہلکھا سگھ ہو گیا تھا۔

ملکھا سگھ جسے ”فلانگ سگھ“ کا نام دیا گیا تھا۔ دنیا کے بہترین دوڑنے والوں میں
سے تھا۔ الیٹین اولمپک میں گولڈ میڈل جیت چکا تھا اور کہتے ہیں کہ انڈین ریلوے میں ٹکٹ چیکر ہوا
کرتا تھا۔ ایک روز اس نے ایک بے ٹکٹ مسافر کو چیک کیا تو وہ مسافر بھاگ اٹھا۔ ملکھا سگھ کو بڑا
غصہ آیا کہ کیسا حق ہے مجھ ایسے چیمپئن سے بھاگ جانا چاہتا ہے۔ چنانچہ اس نے مسافر کے پیچھے
دوڑ لگا دی۔ جب ملکھا سگھ پلیٹ فارم پر زقندیں لگاتا ٹیشن سے باہر آ کر کھیتوں میں دوڑتا چلا جا
رہا تھا تو کسی نے پوچھا، سردار جی وہ بغیر ٹکٹ والے مسافر کو پکڑ لیا ہے یا نہیں تو ملکھا سگھ نے کہا
”بادشاہ ہم تو دوڑ میں اس کو بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔“

تو میں بھی دوڑ میں اپنے ساتھیوں کو بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا۔

شائد یہ لیلے پیک کی قربت کا اثر تھا جس نے میرے پڑمردہ بدن پر اپنا برف ہاتھ رکھ
کر کوئی سحر چھونک دیا تھا۔ ایک دم عیسے پھونک دیا تھا اور میری مردنی.. زندگی میں بدل گئی تھی۔

ویسے مجھے کچھ شرمندگی بھی تھی کہ عمر کے اس حصے میں جب انسان باوقار اور معزز
بزرگ سا ہو جاتا ہے، میں گھوڑا ہو گیا تھا۔ یہ کوئی قابل فخر بات نہ تھی لیکن اس پر میرا کوئی اختیار نہ تھا۔

میرا خیال ہے کہ میں ایک آدھ بار ہنہنایا بھی۔

کہیں بلند پہاڑوں میں.. پتھروں کی دنیا میں.. بے انت برفوں میں عام طور پر کوئی
واضح راستے نہیں ہوتے۔ بس اندازے ہوتے ہیں کہ عمومی رخ یہ ہے بس چلتے جاؤ۔ ان حالات
میں آپ اپنی حماقت کو بردے کا رلاتے ہیں۔ عقل کو اس لیے نہیں کہ وہ تو آپ میں ہوتی
نہیں۔ اگر ہو تو ادھر زلیل و خوار ہونے کے لیے کیوں آئیں۔ تو اس کو وہ نوردی کی حماقت کو بروئے
کار لا کر آپ اپنے راستے کا تعین کرتے چلے جاتے ہیں۔ مثلاً کے ٹوڑیک کے دوران جب ہم

بھٹک جاتے تھے تو بیا فوٹو گھیشیز پر فخریوں کا گوربتلاش کرتے تھے کہ یہ فخری پاکستانی فوج کا سامان
رسد دھوتے تھے تو جہاں جہاں ان کا گور بر کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا تو.. یقیناً یہی راستہ
ہوگا۔ ہوشے سے شائی خچو اور پھر دل سنگ پاتک سوشس اور چاکلیٹ کے وہ چمکیے اور بدنام ہر کام
آئے جو بدتمیز کوہ نورد پیچھتے گئے تھے۔ ان واضح نشانیوں کے علاوہ ”بٹی“ کوہ نوردوں کے لیے
ایک مینارہ نور ہوتی ہے۔ پیچیدہ برفانی راہ گذاروں اور پتھریلے علاقوں میں کسی بڑے پتھر پر
چھوٹے چھوٹے پتھروں اور کنکروں سے ایک ”بٹی“ یا مینار سا بنا دیا جاتا ہے۔ جیسے ”چٹو گرم“ کھیلنے
کے لیے بچے کنکریوں کو اوپر تلے جوڑ کر ایک مینار سا بنا دیتے ہیں۔

آپ پتھروں کی سلطنت پر ایک نظر ڈالتے ہیں اور بہت غور سے دیکھتے ہیں تو کہیں نہ
کہیں یہ نشانی نظر آ جاتی ہے جو کبھی تو دو تین کنکروں پر مشتمل ہوتی ہے اور کبھی خاصے تردد سے دس
بارہ چھوٹے چھوٹے پتھروں کو اوپر نیچے رکھ کر یہ نشانی بنا دی جاتی ہے۔ یہ نشانی کبھی تو کوہ نورد
بناتے ہیں اور اکثر پورٹرائی سہولت کی خاطر بناتے چلے جاتے ہیں تاکہ ان کے پیچھے آنے والے
ساتھی بھٹک کر کسی اور جانب نہ نکل جائیں۔ اگر راستہ واضح نہ ہو جو کہ وہ کبھی بھی نہیں ہوتا تو ہر
کوہ نورد یا پورٹرائی فرض ہوتا ہے کہ کسی بڑے پتھر پر یہ نشانیاں بنا کر آگے بڑھتا جائے۔

اگر ”بٹی“ موجود ہو تو ہر کوہ نورد یہ کوشش کرتا ہے کہ اس رہنما مینار پر ایک اور پتھر پینٹس
کر کے سرخرو ہو جائے۔

یہ نشان محض ایک سرسری نظر ڈالنے سے نظر نہیں آتے۔

میں بہت غور سے دیکھتا ان چھوٹے میناروں کو تلاش کرتا۔ جن میں سے بیشتر پیسا کے
بھٹکے ہوئے مینار کی مانند گرنے کو لگتے تھے۔ ان کی جانب قدم اٹھاتا چلتا جاتا تھا۔ اور اپنے نئے
ہونوں کو دراصل اپنی غلطیوں گردانتا تھا جو میرے نموں میں ٹھونک دی گئی تھیں اور ان میں سے شائد
چنگاریاں بھی اُڑتی تھیں کہ میں گھوڑا ہو چکا تھا۔ شائد اس بلندی پر میرے منتھنوں میں سے بھاپ
بھی خارج ہوتی تھی۔ مردوں نے اپنی تسلی کی خاطر جو وہ انتہائی لائسنی محاورہ گھڑ رکھا ہے کہ مرد اور
گھوڑا کبھی بوڑھے نہیں ہوتے۔ تو میں تو بوڑھا بھی تھا اور گھوڑا بھی۔

میں جب کبھی سراٹھا کر لیلے پیک کو دیکھتا تو بے اختیار جی چاہتا کہ ہنہنائے لگوں۔
ایں ہی جی کرتا، اُس کے قدموں میں لوٹنے لگوں۔ لیکن میں نے اجتناب کیا۔ اس حرکت سے یقیناً
لیلے پیک کا دل دکھے گا کہ میں تو مجنوں کی منتظر تھی اور میرے حصے میں یہ گھوڑا آ گیا ہے۔

مختصر رک سیک کو کندھوں سے اتارا اور لیٹ گیا۔ لیٹ گیا تو کھٹکے لگا کیونکہ ڈھلوان تھی اور بجری تھی، اس لیے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اٹھ کر بیٹھ گیا تو برابر میں رکھارک سیک لڑکھٹے کو آیا۔ اسے سنبھالا دیا اور پھر اپنے ساتھیوں کا انتہار کرنے لگا۔

بہت دیر کے بعد ہمیں بہت نیچے برف کی سطح کی سفیدی میں کیزے مکڑے رہ گئے دکھائی دیے جو میرے ساتھی تھے۔ حسن یاد تھا۔ شاہد سست ہو رہا تھا۔ میاں صاحب کا لٹوہ سوچ چکا تھا اور دو پاؤں پر پٹیاں باندھ کر چلتے تھے۔ عامر کے پیٹ میں کچھ پراہم تھی۔ سلمان اپنے ہماری بھالوہین سے عاجز آیا ہوا تھا اور برائی اگرچہ پہلے دن سے ہی گھوڑا تھا اور بجٹ بھاننا چاہتا تھا لیکن وہ حسن کی صحت پر نظر رکھنے کی خاطر اپنی باتیں کھینچتا چلتا تھا۔ لیے پک یہاں سے ایک عجیب منظر دکھائی دیتی تھی۔

اس بلندی سے وہ ایک بے مثال درشن دیتی تھی۔

لیے۔ جنت کے مقدس کوہ کیلاش کی مانند پرنقش اور قابل پرستش دکھائی دینے لگی۔ کوہ کیلاش کے بارے میں کہنا ہے کہ اس کے چروں کو چھونے کی خواہش کرنے والے بیماری چلتے ہوئے اس کے دامن تک نہیں جاتے بلکہ اپنے گھٹنوں پر گھسٹتے ہوئے وہاں تک پہنچتے ہیں۔ بارستے میں اسی ارد جاتے ہیں۔

کسی بھی شے کو مقدس کر لیں۔ پرستش کے لائق کر لیں تو بڑی خواری ہوتی ہے۔ کوئی پتھر خدا ہو جاتا ہے اور کوئی حجر اسود۔

لیے کی نوکلی چوٹی کی تیز دھار برچی نیلگوں آسمان میں بیست بیسے عرش پر متم کسی خدائی کو پہنچ کرتی تھی۔

لیے کا یہ روپ میرے لیے تو کوہ کیلاش سے کہیں برتر اور بلند تھا۔ اگر وہ قابل پرستش تھی تو پہاڑوں کے کسی نہ کسی مذہب میں اسے چھوڑ جانے کی سزا۔ ایک مرتد کی سزا ہوگی۔

ہم چونکہ اندر سے کافر تھے۔ مسلمان نہ ہوئے تھے، اس لیے لیے ہمیں ترک اسلام کی ترغیب دیتی تھی۔ لیکن ہم کہاں اس ترغیب میں آنے والے تھے کہ ہم بہت بنیاد پرست تھے۔ اگرچہ بنیاد پرست وہی ہو جاتا ہے جس کے اندر کفر ابھی زندہ ہوتا ہے اور وہ اسے مارنے کے لیے آنکھیں بند کر لیتا ہے اور تلواریں نکال لیتا ہے۔

لیے او لیے۔

گندوگور و گلشیر اب تک سیدھا چلا جا رہا تھا۔ اب دیکھتا ہوں تو وہاں کھا کر دائیں ہاتھ کہیں پہاڑوں کے اندر گم ہو رہا ہے۔ اس موڑ کے تین اوپر جو بلند کنارہ تھا اس پر ہمارے چورز براجمان تھے اور مجھے بے تحاشا اشارے کر رہے تھے۔ کوئی وارنگ دے رہے تھے۔ پہلے تو مجھے ان کی پیادہ ہانڈی پنے نہ پڑی اور پھر بہت غور کرنے پر انکشاف ہوا کہ وہ مجھے گلشیر کے درمیان چلتے جانے سے منع کر رہے ہیں اور اشارے کر رہے ہیں کہ باتیں ہاتھ ہو جاؤ۔ کنارے کے ساتھ لگ کر چلو۔

ان کی وارنگ روتھ تھی۔ اگر میں اسی انداز میں گلشیر کے درمیان میں چلتا جاتا تو آگے ایک بہت چوڑی دراڑ منہ پھاڑے حال تھی جسے پار کرنا ممکن نہ تھا۔ نہ صرف ایک دراڑ تھی بلکہ برف کا ایک کنواں بھی ایک برفانی ندی کو اپنے آپ میں گراتا محسن گھیریاں کھا رہا تھا۔

یہ پلٹر گلشیر والے کنویں کے حجم اور گھیر کا نہ تھا کہ وہ تو ایک عجوبہ تھا لیکن بہر طور ایک اندھا برف کنواں تھا جس کے آس پاس سے گزرنا صحت کے لیے انتہائی مضر ثابت ہو سکتا تھا۔

پوروروں کے اشاروں نے مجھے ان بردو آفتوں سے بچالیا تھا۔

کنارے کے اوپر ایک بھر بھری بلندی کے اوپر ہمارے پورور بیٹھے تھے اور مجھے اشارے کر رہے تھے کہ یہاں سے اوپر آ جاؤ۔

میں نے گلشیر راستے کو ترک کیا اور اس کنارے پر چڑھتا ان تک پہنچ گیا۔

یہ بیان تو میں نے اپنی مختصر نویسی کے شوق میں دے دیا ہے کہ میں بس میں اس کنارے پر چڑھتا ان تک پہنچ گیا اور نہ اس چڑھائی میں جو برفانی پھسلن تھی اور لڑھکتے ہوئے پتھر اور کھسکتی ہوئی گیلی بجری تھی جس کے نیچے سخت برف پوشیدہ تھی، اس سے خبر د آ رہا ہوتا ہوتا جو میرا حال ہوا۔ سانس جو بے قابو اور بے ربط ہوا اور انتہائی بلند پایہ نبضوں کے باوجود جو میں پھسل پھسل بچا ہوں اور نیچے گلشیر پر تھکا ہاریاں کھاتے گرنے سے جو بچا ہوں تو اس کا احوال کیا کہوں۔

بے شک میں ایک گھوڑا ہو چکا تھا۔

لیکن ایک بردہار اور شریف گھوڑے کو بھی تو ایک رہیں کورس چاہیے۔ ایک صحرا یا کوئی میدان چاہیے۔ اس کے سامنے اگر ایک اس قسم کی چڑھائی آ جائے تو وہ اسے دیکھ کر ٹھٹھ ایک بار حسب عادت ہنہنائے گا اور شکایت آمیز لہجے میں کہے گا کہ معاف کیجیے میں ایک گھوڑا ہوا کرتا ہوں۔ ایک دھک مکوڑا یا تو ٹوٹا نہیں ہوں جو اس بلند دیوار کے ساتھ ٹھٹھ کر رہا ہوں اور پٹائی چاؤں۔ بہر طور میں ایک گھوڑے اور ایک مکوڑے کے کبھی نمیشن کے ساتھ اوپر پہنچ ہی گیا۔ اپنے

اور یہ پورٹر ایک سیاہ ریش لٹا پٹا پریشان حال ٹنگ سا بابا پورٹرمزہ کھولے مجھے دیکھ رہا تھا۔ ”یہ آپ کو ہسپاں لے جائے گا۔ ہم آپ کے ساتھیوں کو لے کر پیچھے پیچھے آئے گا۔“ میں پھر سے رواں ہو گیا۔

دو تین بلندیاں اور ڈھلوانیں جنہاں تے ہوئے طے کیں۔ ندیوں میں چھینٹے اڑاتا پار گیا، پتھروں کو پھلانگتا اور برفوں پر بے خطر چلتا گیا۔ اس لیے بھی کہ میرے ساتھی مجھے دیکھ رہے ہیں اور میں ان کے سامنے ڈینگیں مار کر آتا تھا۔ جوئی وہ نظروں سے اوجھل ہوئے، میں نے ایک پتھر سے ٹیک لگا کر ہانپنا شروع کر دیا بلکہ زبان باہر نکال کر اس کو بھی ہوا لگوائی تاکہ تھوڑی بہت آکسیجن اس کے مساموں میں جذب ہو کر مجھے تازہ دم کرنے میں معاون ثابت ہو۔ لیکن ثابت یہی ہوا کہ میں اتنا گھوڑا بھی نہ تھا۔ ایک جعلی سا گھوڑا تھا۔

دراصل لکڑی کا وہ گھوڑا تھا جس میں سپاہی چھپا کر اسے ٹرائے کے شہر میں دھکیل کر لے جایا گیا تھا تاکہ ہیلن ایسی بے وفا حسینہ کو کیفر کردار تک پہنچایا جائے۔ میں پھر سے چلا۔ اور اس سیاہ ریش پریشان حال ٹنگ بابے پورٹر کے تعاقب میں چلا اور تھوڑی ہی دیر میں پھر سے ہانپنے لگا۔ اب وہ پتھروں کی دنیا چھوڑ کر ایک اور سفید گلیشیر پر اتر چکا تھا اور انتظار نہ کرتا تھا کہ میں اس سے چالوں۔ وہ رکتا تو تھا کسی پتھر کے ساتھ ٹیک لگا کر لیکن جوئی میں اس کے قریب پہنچتا وہ مجھ سے بات کئے بغیر پھر سے چالو ہو جاتا تھا۔ چلنے لگتا تھا۔

میں نے متعدد بار آوازیں دے کر اسے روکنا چاہا لیکن وہ سنتا ہی نہ تھا۔ پیچھے مڑ کر دیکھتا اور اپنی سیاہ ریش میں پوشیدہ مسکراہٹ سے مجھے نواز کر پھر سے شوٹ لگا دیتا۔ عجیب اول جلول اور اخلاقیات سے عاری پورٹر تھا۔

میں آوازیں دیتا۔ ہانپتا ہوا آوازیں دیتا کہ ہیلو۔ بابا جی۔ ہائیو۔ بزرگو۔ پورٹرو۔ ذرا رک جاؤ۔ مجھے سانس تو لینے دو لیکن شاید وہ بہرا تھا۔ ٹیٹنی آن ٹیٹنی کرتا چلتا جاتا تھا۔ اور میں اسے کھودینے کا خطرہ بھی مول نہیں لے سکتا تھا کیونکہ اس پتھر جلی اور برفانی ریاست میں بھٹک سکتا تھا۔

اور پھر حسب روایت ایک اور ہسپانوی ٹیم سے آنا سامنا ہو گیا۔

ان میں ایک ایسی بزرگ خاتون تھی جو پاکستان میں ہوتی تو پوتے پوتیوں کو کھلاتی اللہ اللہ کرتی موت کی منتظر ہوتی۔ ایک ڈھیلی جین اور ہانگنگ بوٹس میں کولہوں پر ہاتھ رکھے شکایتیں کر

”گو نگے شاہ مجھے ہسپاں لے جا رہا ہے یا ہسپانیہ“

اس سے پیشتر کہ میں لیلے کی جانب دیوانہ وار لپکتا اور مذہب عشق اختیار کرتا علی موسے نے پوچھا ”صاحب آگے نہیں جائے گا۔“

”جائے گا۔“

”تو پھر جاؤ۔“

”آگے گندوگور کا بیس کیپ ابھی کتنا ڈور ہے؟“

”تھوڑا ڈور ہے۔“

”اور جدھر ہم پہنچے گا تو اس جگہ کا نام کیا ہے علی موسے؟“

اس بد بخت نے پھر وہی ہسپانوی قسم کا ہسپاں سا نام لیا۔ اور میں اسے روک روک کر ایک ایک لفظ کو بار بار دوہراتے جب اس نام سے آگاہ ہوا تو دو۔۔۔ ہسپاں۔۔۔ ہی تھا۔ اسی لیے ہسپانوی سا لگ رہا تھا۔

”اور یہ کدھر ہے؟“

”صاحب ادھر سے نیچے اترے گا۔ جدھر ایک ندی بہتا ہے۔ پھر اوپر جائے گا پھر نیچے۔“

”میں جاتا ہوں۔“ میں نے ایک برتری کی نظر اپنے منہ حال ساتھیوں پر ڈالی اور سینہ

نچھلا کر کہا ”میں کیپ پہنچ کر خیمے لگواتا ہوں اور پھر آپ کا انتظار کرتا ہوں۔ میں جاتا ہوں۔“ میں چلے گا تو خیال آیا کہ جانا کس طرف ہے۔

”کدھر ہے یہ بیس کیپ کا راستہ۔“

”آپ کے ساتھ یہ پورٹر جائے گا صاحب۔ راستہ دکھائے گا۔“

اور مجھے اس کجنت کو نظر میں رکھنا ہے۔ اس لیے آؤ میں.. خدا حافظ..“
بابا بارش بہت دُور جا چکا تھا.. اور وہ صرف اپنی سیاہ داڑھی کی وجہ سے سفید برٹوں میں
نمایاں ہو رہا تھا..

داڑھی کے بھی کتنے فوائد ہیں، یہ ہم نادان نہیں جانتے..
اُس کی بے اعتنائی اب بھی جاری تھی..

میں نے اب اُسے پکارنا ترک کر دیا تھا کیونکہ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ وہ پیدائشی طور پر
بہرا ہے..

پھر وہ ایک مقام پر رُکا.. برف کے ایک تودے کے ساتھ ٹپک لگا کر سستانے لگا اور
جب حسب معمول میں اپنی رفتار تیز کر کے اس کے قریب پہنچا تو وہ حسب معمول مجھے غچہ دے کر
چپٹ ہونے کو تھا.. جب میں نے ایک چمیلے ریپر والی ہانی شہادت کی انگلی اور انگوٹھے میں سمجھتی کر
لاچ کے ایک جھنڈے کے طور پر بلند کر دی.. اس نے خلاف معمول چپٹ ہو جانے کا ارادہ ترک
کیا اور اس ہانی کو غربت بھری نظروں سے دیکھنے لگا.. مہبوت سا ہو گیا یہاں تک کہ میں اس کے
پاس جا پہنچی.. اس نے ہانی وصول کرنے کے لیے نہایت بے تابی سے ہاتھ آگے کیا تو میں نے اپنا
ہاتھ کھینچ لیا.. ”اوئے تم رکتے کیوں نہیں.. بہرے ہو..“

اُس کی داڑھی میں سے ایک لاچار قسم کی مسکراہٹ برآمد ہوئی اور میڈم کی مانند اس
کے بیشتر دانت بھی غائب تھے..
”میرا انتھار کیوں نہیں کرتے؟“ میں نے ذرا بلند آواز میں کہا تو بلندی کی وجہ سے
سانس پھولنے لگا..

اس پر اُس نے ہانی سے نظریں ہٹائے بغیر غوں غاں کرتے اشاروں کی زبان شروع
کر دی.. کبھی آسمان کو نمٹتا اور انگلی اٹھا کر بے چارگی سے سر بلاتا اور کبھی برف پر نگاہ ڈال کر گلے میں
سے کوئی عجیب سی آواز نکالتا.. پھر اُس نے منہ کھول کر زبان نکالی اور سر بلانے لگا..
وہ بہرا نہیں گونگا تھا..

”تم گونگے ہو؟“ میں نے بھی اپنی زبان نکال کر اشارہ کیا..

”غاں غاں..“ اس نے زور زور سے سر بلایا..

تب ہم دونوں نے ’پرست ہو کر اپنی اپنی زبانیں دہن میں داہیں کیس کہ میں جان چکا

رہی تھی..“ تمہارے ملک میں ایسی شاندار وادیاں اور چوٹیاں ہیں جو دنیا بھر میں اور کہیں نہیں ہیں
اور تم لوگ ان کا خیال نہیں رکھتے.. ہم یہاں جس بھی خیمہ گاہ میں پہنچے ہیں وہاں گندگی اور فضلے کے
ڈھیر ہوتے ہیں.. تم لوگ اپنی اس جنت کو صاف کیوں نہیں رکھتے.. ہم لوگ جو باہر سے آتے ہیں،
ہم دس بیس ڈالر فی کس ادا کرنے کو تیار ہیں تاکہ اس رقم سے آپ ان خیمہ گاہوں اور منزلوں کو مستحضر
رکھ سکیں.. تمہارا سنا حتی محکمہ کیا کر رہا ہے..“

”وہ سپینار اور فیسیبول منعقد کر رہا ہے میڈم.. لیکن نیچے قراقرم ہائی وے کے آس
پاس.. جہاں فائیسٹار سوئیس میسر ہیں.. انہیں واقعی یہ خبر نہیں کہ ادھر ہوشے سے آگے وزہ گندو گورو
کے دامن میں کوئی ہسپاں یا دل سنگ پا بھی ہے.. ویسے تو مجھے بھی خبر نہیں تھی..“ میں نے ہنس کر کہا..
”کتنی شرم کی بات ہے..“ میڈم بھی خوش دلی سے ہنسی اور میں نے نوٹ کیا کہ اس کے
بیشتر دانت مصنوعی ہیں جنہیں باقی ماندہ دانتوں پر ایک ”برن“ بنا کر سہارا دیا گیا ہے..

میڈم کے ہمراہ جو کوہ نور دھتے، وہ انٹرنیشنل انٹرنیشن کے رکن تھے اور ادھر جانے کس
سلسلے میں آٹکے تھے..

”دیکھیں میڈم ہم تو ہسپانیہ سے اتنا پیار کرتے ہیں کہ ہم نے اپنے کئی گلیڈیئرز کے نام
بھی ہسپانوی میں رکھے ہوئے ہیں..“

”واقعی؟“

”ہاں.. آپ لوگ ٹیل فائٹنگ کے دوران ہے تو رو.. کے نعرے لگاتے ہیں تو ہم نے
کے نو کے راستے میں پڑتے عظیم گلیڈیئرز کا نام ہال نور رکھ دیا ہے.. اور اس کی لے میں گندو گورو
ہے.. اور جس کیپ کا نام بھی ہسپانوی ہے یعنی.. ہسپاں..“

”کیا واقعی؟“

”ہاں واقعی.. اگرچہ ہم رکھنے کے بعد ہمیں معلوم ہوا ہے کہ یہ ہسپانوی سے ہیں..“
میڈم نے دل کھول کر اپنے مصنوعی اور چند اور جہل دانتوں کی نمائش کی اور بہت خوش ہوئی..
”آپ میری ٹانگ کھینچ رہے ہیں..“

”بالکل نہیں..“ میں نے بھی ہنستے ہوئے کہا.. بھلا مجھے اس عمر کی خاتون کی ٹانگ کھینچنے
سے کیا فائدہ ہو سکتا تھا..“ اب مجھے اجازت دیجیے میڈم.. آپ نے دیکھا ہوگا کہ میں ایک بارش
پورٹر کے پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا جب آپ کی خاطر رک گیا اور اب دیکھئے کہ وہ بہت دُور نکل گیا ہے

تھا کہ وہ گولنگا ہے اور وہ جان گیا تھا کہ میں جان چکا ہوں کہ وہ گولنگا ہے۔ تو اب سفر آسان ہو گیا۔ جب اپنے لیڈر کے بارے میں علم ہو جائے کہ وہ گولنگا ہے تو اس کی بے دردی کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ ورنہ آپ آوازیں ہی دیتے رہتے ہیں کہ لیڈر جی ہمیں بھی ساتھ لے کر چلو۔ اور اس کی ٹافیوں سے رغبت بھی میرے بہت کام آئی۔ جونہی وہ اپنی رفتار جیز کرتا، میں ٹافی کا پرچم بلند کر کے اسے روک لیتا۔ اس کے دانت کم ہونے کا باعث شاید یہی ٹافیوں کے لیے رغبت تھی۔ شاید وہ غیر ملکی میموں کے سامان سے ٹافیاں اور چاکلیٹ چُرا چُرا کر کھاتا رہا تھا، اس لیے اپنے دانت کھو بیٹھا تھا۔

ہم پتھروں سے اُٹے گلیشیر سے آگے ہوئے اور ایک برف سفید گلیشیر پر اتر گئے۔ اور اس کی سطح پر کرج کرج چلنے لگے کہ جوگر کے نیچے دھقی برف میں سے اعصاب پر سوار ہو جانے والی یہی آواز مسلسل آتی تھی۔ اسی آواز کرج کرج نے سنولیک کے سفر کے دوران ہمیں زچ کر کے رکھ دیا تھا۔

میں نے پیچھے نگاہ کی۔ دور دور تک میرے ساتھیوں کا کچھ پتہ نہ تھا اور میں نے انہیں یوں مات دینے پر ایک انتہائی کمینی خوشی محسوس کی اور ذرا ہنہٹایا۔

اور جب میں ذرا ہنہٹایا ہوں تو گولنگا بابا زک گیا۔ اور میری جانب ڈری ڈری نظروں سے دیکھا۔ اگرچہ وہ گولنگا تھا اور بہرا بھی ہو سکتا تھا لیکن اس کے باوجود ایک ہنہٹا ہٹ تو سن سکتا تھا۔

چنانچہ میں نے شرمندہ ہو کر مزید ہنہٹانے سے گریز کیا اور چپکے سے اس کے پہلو میں چلنے لگا۔ بائیں جانب ایک خشک چٹانی سلسلہ چلتا جا رہا تھا اور جوں جوں ہم آگے بڑھ رہے تھے تو انوں اس کے عقب میں سے برفبار بلندیاں اور چوٹیاں ظاہر ہو رہی تھیں اور سرقتی ہوئی سامنے کے منظر میں داخل ہو رہی تھیں۔

میں نے آج کے سفر کے لیے تین سگریٹوں کا کوڈ طے کر رکھا تھا۔ میں کسی ایک مقام پر تھوڑی دیر کے لیے سانس درست کرنے کے لیے رکتا، فلاسک میں سے ٹھکول کی آمیزش والے پانی کے دو گھونٹ بھرتا پھر سگریٹ سگا کر پورے چار کش کھینچنے کے بعد اسے پیکٹ میں بند کر کے دم پخت کر دیتا۔ یوں ایک سگریٹ تین بار میرے کام آتا۔ میں تمباکو کی ندامی سے آزاد ہونا چاہتا تھا لیکن کوئٹہ کی ملکہ نے مجھے پوری طرح اپنے دام میں جکڑ رکھا تھا۔

سفید گلیشیر کا بھی اخیر ہوا اور ایک بار پھر اس کی سطح کو پتھروں، بجزی اور سنگریزوں نے مکمل طور پر ڈھک لیا۔

ٹافیوں کا رسیا گولنگا پہلوان ایک بلندی پر پہنچا اور اپنی لاچار اور باریش مسکراہٹ بکھیرتا مجھے اوپر آنے کے لیے اشارے کرنے لگا۔

میں اپنے ٹوٹے بکھرتے سانسوں سے اندازہ لگا رہا تھا کہ ہم بلندی سے بلند تر ہوتے جا رہے ہیں۔ نامعلوم انداز میں اونچے ہو رہے ہیں۔ بڑی مشکل سے۔ ہر لمحہ اپنے بلند پریش کا خیال رکھتے۔ یہ خیال رکھتے ہوئے کہ اس عمر میں اتنی بلندی پر کہیں دل کی شریانوں میں کوئی رکاوٹ نہ آ جائے۔ دھیرے دھیرے اس سانس کو جو تن بدن سے نکلتا جاتا تھا منت مانت کر کے اسے روکتا سنبھالتا اوپر بالا خرگوٹے شاہ کے پاس پہنچ ہی گیا۔

اور اس کے خشک بلندی سے پرے غوں غاں کے اشارے کرنے سے پہلے ہی میری نظر اس منظر تک سفر کر گئی۔

”دڑہ گندوگورو کے دامن میں چار خیمے.. لگی باسٹروڈز“

دو جو مقدس کتابوں میں کہا جاتا ہے کہ Lo & Behold..

تو یہاں بھی... Lo & Behold... سامنے ایک پیالہ نما میدان تھا.. خشک بلندی سے نشیب میں.. برف ہی برف پہاڑوں کے دامن میں ایک پیالہ نما میدان تھا جس پر دھند کے آثار تھے.. ایک پرشورندی تھی جو اس میدان میں اترتی تھی لیکن ابھی یہاں سے اس کا شور سنائی نہیں دیتا تھا.. برفوں میں سے اتر کر نیچے آ رہی تھی تو یقیناً پرشور تھی.. میدان کے اوپر ڈھلوان پر کچھ پتھریلی آماجگاہیں تھیں جن کے آگے نیچے ڈرموں کی قطاریں تھیں اور ان کی نیلا ہٹ پورے منظر میں سے الگ اور شوخ دکھائی دیتی تھی..

اور اس پیالہ نما وسیع میدان میں.. برف زاروں کی گود میں.. دھند میں.. پرشورندی کے نیچے.. اس میدان میں جس پر بے پناہ برفیں ہر جانب سے ٹھکتی جاتی تھیں اور بریلی ندیوں کے پانی چلتے تھے.. وہاں ایک وسیع خیمہ گاہ تھی.. جس میں ہر رنگ اور ہر نسل اور ہر سائز کے بے شمار خیمے ایستادہ تھے.. اگرچہ یہاں سے وہ خیمے نہیں، خیموں کے کھلونے لگ رہے تھے.. رنگوں کے دھبے لگتے تھے.. ایک دنیا وہاں آباد تھی..

یہی ہسپاں تھا..

مجھے اتنی آبادی کی توقع نہ تھی..

اور اس ہسپاں کے اوپر گندوگورو کی چوٹی اور دڑہ تھا.. اور دڑے پر حیرت انگیز طور پر برف کے ڈھیر نہیں تھے بلکہ خشک چٹانوں کے اوپر برف کی ایک لکیر تھی.. اور لیلے بھی تھی.. وہ میرے ساتھ ساتھ چلتی چلتی ہسپاں تک پہنچ گئی تھی اور اب اس پر سایہ لگن ہوئی تھی..

ایک عجیب منظروں والی برفانی بلندیوں کے دامن میں پھیلی ایک انہونی سی دنیا تھی.. جیسے تیس برس پیشتر میں نے ایک ناول کو سوچا تھا کہ ایک کوہ نور درتی گلی کے درے کو پار کر کے جب دوسری جانب اترتا ہے تو وہاں دھند میں ایک شہر آباد دکھائی دیتا ہے.. اور شہر مونہو ڈارو کا ہے.. وہی گلیاں.. وہی حمام اور غلے کے گودام اور وہی لوگ.. پانچ ہزار برس پہلے کے وہی لوگ جنہوں نے آریائی حملہ آوروں سے فرار ہو کر ان دور افتادہ برفانی وادیوں میں آ کر پھر سے اپنا شہر اسی شکل میں تعمیر کر لیا تھا اور نہیں جانتے تھے کہ پانچ ہزار برس گزر چکے ہیں اور باہر کی دنیا بدل چکی ہے اور یہ کوہ نور اس شہر میں اتر کر انہیں بتاتا ہے کہ باہر کی دنیا کچھ اور ہو چکی ہے..

لاہور کے شیران ریسٹوران میں.. ذوالفقار تابش کی موجودگی میں.. میں نے اس ناول کی آؤٹ لائن اپنے پسندیدہ مصنف ابن انشاء کو سنائی.. ڈرتے ڈرتے کہ یہ کچھ عجیب سی آؤٹ لائن تھی.. اور مجھے اب تک یاد ہے کہ ابن انشاء نے اپنے مولے شیشوں کی عینک اتار کر مجھے چند حیا کی ہوئی آنکھوں سے دیکھا تھا اور کہا تھا.. تار و تم سب کام کاج چھوڑ دو.. دنیا ترک کر دو لیکن یہ ناول ضرور لکھو.. یہ تمہارا بہترین کام ہوگا.. اور میں نے کہا تھا کہ سرجی مجھ میں ابھی اتنی تخلیقی سکت نہیں اور یہ آئیڈیا بھی عجیب اور انہونا سا ہے.. تو ابن انشاء نے کہا تھا.. کبھی نہ کبھی تم میں یہ سکت پیدا ہو جائے گی.. اس آئیڈیے کو فراموش نہ کرنا.. یہ تمہارا بہترین کام ہوگا..

تیس برس گزر گئے ہیں لیکن مجھ میں ابھی وہ سکت پیدا نہیں ہوئی..

ہسپاں کو.. عجیب منظروں والی برفانی بلندیوں کے دامن میں پھیلے ہسپاں کو دیکھ کر مجھے ایک عرصے کے بعد ابن انشاء کا خیال آیا.. اس لیے کہ گمشدہ مونہو ڈارو ایک ایسی ہی بلند اور نامعلوم وادی میں ہو سکتا تھا..

لیکن اس پورے منظر میں ایک اور منظر تھا..

ایک.. اس منظر سے پرے ایک اور الگ منظر تھا جس نے مجھے تباہ کر دیا..

شعلہ جس نے مجھے چھوڑا بس اسی الگ منظر سے اٹھا تھا..

اس وسیع پرجھوم خیمہ گاہ سے پرے.. دڑہ گندوگورو کی جانب جو وادی تھی.. وہاں برف پانیوں کے پھیلاؤ کے کناروں پر.. ایک مکمل تنہائی میں.. جہاں.. اور کوئی نہ تھا وہاں سب سے جدا چار خیمے ایستادہ تھے..

اور ایسے خوش نظر لگتے تھے جیسے یہ پورا منظر.. دڑہ گندوگورو کے دامن میں یہ منظر صرف

ہیں۔ ان پر خیمے لگا سکتے ہیں۔۔۔ پرندوں کی بیٹ اور ریچوں کا گوبرہ میں بالکل اپ سیٹ نہیں کرتا لیکن حضرت انسان کا نظام ہضم کچھ ایسا ہے کہ اگر آپ کے آس پاس صرف ایک انسان کی شٹ ہو تو وہ برداشت سے مکمل طور پر باہر ہو جاتی ہے۔ اس کی بو کو سہارا ممکن نہیں ہوتا۔۔۔ پانیو میں بھی یہی پرائیم تھی۔

اور ہسپاں کی خیمہ گاہ میں بھی جو برفیلی سرد ہوا تھی، اس میں بھی اسی انسانی ”کمال“ کی بوتیرتی تھی اور برداشت سے باہر ہوتی تھی۔ ہسپانوی میڈم بھی اسی بو سے نالاں ہو کر مجھ سے شکایت کرتی تھی۔

میں جب اپنے قدم۔ اور ان قدموں میں جو بوٹ تھے، انہیں گھسیٹتا اس خیمہ گاہ میں اُترا۔ دڑہ گندو گورو کے بیس کیمپ ہسپاں میں اُترا۔ اس میں داخل ہوا۔ بو کو بڑی مشکل سے درگزر کرتا اس میں داخل ہوا تو دائیں جانب ایک ریتلے میدان میں ان سینکڑوں کو نورودوں کے خیمے پُر جھوم تھے جو آج سویر کے ٹو سے داپسی پر گندو گورو کا دڑہ عبور کر کے۔ ان میں سے کچھ اس کی چوٹی سر کر کے یہاں اُترے تھے۔

اور ان پانیوں کے کنارے تھے جن میں لیلے پیک کی لیلے اولیلے برفیں عکس ہوتی جاتی تھیں اور ان پانیوں کے کنارے میں نے ایک سُرخ۔ تیز آتش سُرخ بالوں والی کوہ نور دلاڑی کو بالوں میں کنگھی کرتے دیکھا۔

قدرتی سُرخ بالوں والی لڑکیاں یورپ میں بھی کم کم ہوتی ہیں۔ اور جن کے بال کسی عام رنگ کے ہوتے ہیں وہ بھی اس امر سے آگاہ ہوتی ہیں کہ محض بالوں کی رنگت کی وجہ سے انہیں جنسی شدت کی علامت سمجھا جائے گا، وہ اپنے بالوں کو سُرخ میں رنگتی ہیں۔

سناک ہوم کی ایک رات میں۔ ایک ایسی ہی قدرتی سُرخ بالوں والی بھری بھری لڑکی تھی جس نے ریسٹوران کے ڈانس فلور پر مجھ سے مکمل بے اعتنائی برتی تھی اور پھر مجبوراً کہ اس کے فلیٹ کو۔ رات کے اس سے کوئی ٹرام یا بس نہ جاتی تھی میرا ساتھ دیا تھا۔

اور اس نے مجھے آگاہ کیا تھا کہ محض بالوں کی سُرخ کی وجہ سے کسی لڑکی کو آسان اور جذباتی سمجھ لینا حماقت ہے۔

تو یہ سُرخ بالوں والی لڑکی لیلے پیک کے عکس کے سامنے اپنے بال سٹوارتی تھی۔ ان

انہی چار خیموں کے لیے تحقیق کیا گیا تھا۔ وہاں ”رائس آف ایڈیشن ریزروڈ“ کی ختی تب تک لگی رہی تھی جب تک کہ یہ چار خیمے وہاں نہ پہنچے اور اپنا راستہ ہم نہ کیا۔ وہ چار خیمے خوابناک لگتے تھے۔

ہسپاں کی خیمہ گاہ کی بھیڑ اور حقوق سے بہت پرے۔ گندو گورو کی وادی میں۔ پانیوں کے کنارے چار خیمے۔ خوابناک لگتے تھے۔ اور میں نے انہیں دیکھتے ہوئے سوچا۔ کہ یہ جن کوہ نورودوں کے بھی خیمے ہیں وہ کتنے کئی باسٹروڈ ہیں۔

کاش کہ میں ان کی باسٹروڈ میں شامل ہوتا۔ میں نے گولڈا پہلوان کورشت کے طور پر تین چار ٹافیاں پیش کیں اور اشارے سے کہا کہ بابا باریش اب تم بے شک مت رکو۔ میرا انتظار نہ کرو۔ بے درلغی چلتے جاؤ کہ میں نے منزل دیکھ لی ہے۔ تم چلو میں پہنچ جاؤں گا۔

مجھے اس بلند خیمہ گاہ تک پہنچنے اور اس میں اُترنے میں بیس منٹ لگے۔ اور جب اُترا ہوں۔ تو وہاں بلند برفانی کھنکھاتی شفاف ہوائیں نہ تھیں۔ ایک بُجھی۔

اپنی کوہ نورودی کی آخری منزل میں اُترا ہوں تو خیمہ ہستی میں ایستادہ غیر ملکی میوں کے رنگ رنگ خیمے۔ آرام دو خیمے۔ کچن ٹینٹ اور ڈائننگ ٹینٹ اپنی جگہ۔ لیلے پیک کا بے مثال عکس اپنی جگہ جو ان خیموں کے برابر ہیں ٹھہرے ہوئے پانیوں میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اور پندرہ ہزار فٹ سے زیادہ بلند ہسپاں میں پہنچ جانے کی چلبلی کھلکھلاتی ہوئی بے پایاں مسرت اپنی جگہ لیکن وہاں ایک بُجھی۔

اور یہ انسانی فسطی کی ناقابل برداشت بو تھی۔ جہاں کہیں پتھروں کی اوٹ تھی وہاں میں نے استعمال شدہ ٹانکٹ ہیپر بھی سرسراتے ہوئے اور آلودہ دیکھے۔

عاصر نے کیا خوب کہا تھا کہ تارڑ صاحب۔ ہم اگر چہ اپنے آپ کو اشرف المخلوقات گردانتے ہیں لیکن ایک معاملے میں جانوروں سے مارکھا جاتے ہیں۔ یعنی ان کی شٹ ہمیں دُسترب نہیں کرتی۔ گاؤں میں بھیڑوں کے گوبر سے اُپلے تھاپے جاتے ہیں اور کچھ ناگواری نہیں ہوتی۔ بکریوں اور بھیڑوں کی میٹنیاں ہماری طبیعت کو اُلٹاتی نہیں اور ہم ان کی نزدیکی سہہ سکتے

علاقے کے بارے میں پہلا کتاب ہے۔ اور اب کچھ لوگ یہ کتاب پڑھ کر ہمارا دادی میں بھی آنے لگے ہیں۔

یہ کیسی خوش بختی ہے کہ آپ کو نوروی کی داستانیں اپنے جنوں کی تسلی کے لیے لکھتے ہیں۔ کسی اچھی اور ارفع جذبے کے تحت نہیں لکھتے۔ کسی مقصد کے لیے نہیں تحریر کرتے اور پھر بھی کچھ غیر معروف وادیاں۔ ان کی وجہ سے معروف ہو جاتی ہیں۔

کبھی کوئی فیئر می میڈو۔ کبھی ترشنگ اور کبھی شمشال؟

وحشی داڑھی والے۔ فرینڈلی گائیڈ نے مجھے ایک مرتبہ پھر اپنے ڈائمنگ مینٹ میں چائے کی دعوت دی لیکن میں اس میں کیپ میں اترتے ہی عیش و عشرت میں مبتلا نہیں ہو جانا چاہتا تھا۔ پہلے اپنے ان پورٹروں کو تلاش کرنا چاہتا تھا جو مجھے اور گونگے پہلوان کو کراس کر کے آگے نکل گئے تھے اور اب اس وسیع دنیا میں کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

پتھر ملی آماجگا ہوں میں چہلیں کرتے ہر پورٹ کے چہرے کو میں غور سے دیکھتا تھا کہ کہیں یہ وہ تو نہیں۔ اور یہ۔ کوئی اور ہوتے تھے۔ میرے پورٹ نہیں ہوتے تھے۔

میں ایک لاوارث گمشدہ بچے کی مانند ہسپاں کے اس میلے میں شناسا چہرے تلاش کرتا تھا۔ اور وہ کہیں بھی نظر نہیں آتے تھے۔

تب میں نے اس بستی سے پرے۔ شوریٰ ندی کے پار ڈھلوان پر جو پتھر ملی آماجگا ہیں

معلق تھیں اور وہاں نیچے ڈرم تھے، وہاں اپنے گونگے پہلوان کو اشارہ کرتے دیکھا کہ ادھر

آ جاؤ۔ ادھر آ جاؤ۔

ادھر جانا اتنا آسان نہ تھا۔

اُس ڈھلوان اور خیمہ بستی کے درمیان شور ملی ندیا جو پڑتی تھی۔ گھنٹی اور ابدی برفوں

میں سے جنم لیتی۔ بھٹکتی۔ بلندی کی برفوں کی دھند میں سے ظاہر ہوتی نیچے آ رہی تھی۔ لیکن اس کے

پانیوں میں چند پتھر ایسے ابھرتے تھے جن پر احتیاط سے قدم جما کر دوسری جانب جایا جاسکتا

تھا۔ دوسری جانب تھوڑی سی چڑھائی تھی جس کے اوپر کچھ کوٹھڑیاں اور غاریں سی تھیں جن میں پورٹ

مزے کر رہے تھے اور مختلف مہموں کے سامان کے نیچے ڈرم قطار اندر قطار بٹے تھے۔ میں اپنے

گونگے پہلوان کے پاس پہنچا اور اس سے دریافت کیا کہ۔ جیسے ایک گونگے دوسرے گونگے سے

دریافت کرتا ہے کہ اسے گونگے ہمارے پورٹ کہاں مر گئے ہیں۔ خیمہ بستی میں تو نہیں ہیں۔ اور کبخت

میں نگھی کرتی تھی۔

ہسپاں کی خیمہ گاہ میں دائیں ہاتھ پر تو خیموں کی دنیا تھی اور بائیں جانب پہاڑ کی اوٹ میں متعدد پتھر ملی چار دیواریاں تھیں جن میں ان غیر ملکی کو نور دوں کے ہمراہ آئے ہوئے پورٹ قیام کرتے تھے اور اگلے روز شاکی چوبکنج جانے کی آرزو کرتے تھے جہاں ان کو پورے ٹریک کی مزدوری مل جاتی تھی۔ اور انہوں نے متمول ہو کر اپنے گھروں کو۔ اپنی ایک یا دو بیویوں کے پاس لوٹ جانا تھا۔

میں اس خیمہ بستی میں داخل ہوا تو وہاں کوئی پہچان پیدا نہ ہوا۔

کسی نے پروانہ کی کہ کون آیا ہے۔

کسی بھی غیر ملکی کو نور دے آکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔

صرف چند ایک پورٹروں نے مجھے حیرت سے دیکھا۔ اس لیے دیکھا کہ میں یہاں تک

پہنچنے والا پہلا پاکستانی تھا۔

البتہ ایک وحشی داڑھی والے گائیڈ نے مجھے جانے کیسے اس جلیے اور حالت میں پہچان

لیا اور چائے کی ایک پُر خلوص دعوت دی۔

ایک اور پورٹ جو نہایت بلند قامت تھا اور جس کی مسیں ابھی بھیجی نہ تھیں میرے

استقبال کے لیے آگے آیا اور ذرا جھجکتے ہوئے بولا۔ ”صاحب میں نے آپ کو پہچان لیا

ہے۔ آپ تارڑ صاحب ہونا!“

”کیسے پہچان لیا ہے؟“ میں نے اپنی اس خوش نصیبی پر نازاں ہو کر سوال کیا۔ جی ہاں۔

یہ کم از کم میرے ایسے لوگوں کے لیے تو ایک بہت بڑی خوش نصیبی ہوتی ہے کہ آپ پہاڑوں کے

اندر ایک وڑے کے دامن میں اترتے ہیں اور وہاں آپ پہچانے جاتے ہیں۔

”سر میں شمشال کا رہنے والا ہوں۔ دو برس جوشتر جب آپ ہماری وادی میں اترے

تھے تو آپ نے یہی نیلی جیکٹ اور سفید چترائی ٹوپی پہنی ہوئی تھی۔ میں نے آپ کو شکل سے نہیں

لباس سے پہچانا ہے۔“

”تم یہاں۔ اپنی وادی سے اتنی دور۔ یہاں کیا کر رہے ہو؟“

”میں ادھر روزگار کے لیے آیا ہوں۔ بوجھ اٹھاتا ہوں۔ پورٹروں۔ میں نے آپ کا

کتاب ”شمشال بے مثال“ پڑھا ہے۔ شمشال کے سب لوگوں نے پڑھا ہے۔ اردو میں ہمارے

تو ادھر کیا کر رہا ہے... بتائے گا تو ثانی دوں گا..

اور تب گوگلے پہلوان نے غول غاں کر کے گندوگورو کی وادی کے نشیب کی جانب اشارہ.. دڑے سے نیچے آنے والی گینڈی کے دامن میں، ندیوں اور گھاس کے میدانوں کے کنارے جو خوابناک منظر والے چار سفر ادے خیمے راج کرتے تھے، ان کی جانب اشارہ کیا.. میرا دم دک گیا.. وہ ہمارے خیمے تھے..

دو شاندار رنگ برنگے.. ہسپاں کی بھیڑ اور بوسے پرے.. پانیوں کے برابر میں عظیم برفانی چوٹیوں کے آمنے سامنے سب سے الگ تھلگ جو چار خیمے تھے، جنہیں میں نے گلیشیر سے اترتے ہوئے دیکھا تھا اور حسد کیا تھا، ان باسٹروں کی قسمت پر جن کے وہ خیمے تھے.. اور وہ تو ہمارے تھے..

ہمارے کسی پورٹرنے پہلی بار ذوق جمال کا مظاہرہ کیا تھا..

میں نے رشک کیا تھا کہ وہ کون سے کئی باسٹروں ہیں جن کے یہ خیمے ہیں.. تو اب یہ کھلا کہ یہ ہم تھے.. بشر مندی بھی ہوئی کہ خواہو ناو بے احتیاطی کی اور اپنے آپ کو یہ کیا کہہ دیا.. میں نے خوش ہو کر گوگلے پہلوان کو انعام کے طور پر متعدد دیاں پیش کر دیں.. ہم دوسری جانب اپنے خیموں کی طرف اترنے لگے..

خیموں کے آگے ٹھہرے ہوئے پانیوں اور ندیوں کی ایک وسیع گزرگاہ تھی جس کے پار پتھروں کا ایک میدان تھا اور ان کے اوپر بریلی چوٹیاں جھکی ہوئی تھیں..

دائیں جانب وہی ہسپاں کی وسیع خیمہ گاہ دکھائی دے رہی تھی اور پہلے لیے پیک وہاں تھی اور اب میرے ساتھ چلتی چلتی خیموں کے تقریباً سامنے آکھڑی ہوئی تھی.. بائیں ساتھ پر ایک مختصر وادی وہاں تک چلی جاتی تھی جہاں دڑہ گندوگورو کی چٹانیں اور برفیں اس کا راستہ روک کر بلند ہو جاتی تھیں اور وہاں دھند تھی..

میں نے اپنا چھوٹا ٹرک سبک کندھے سے اتار دیا.. دانگ سبک گھاس پر پھینکی اور زمین پر لیٹ گیا.. زمین میں ہلکی نمی اور خشک تھی..

”ہسپاں کی شام.. پکوڑے اور لیلے ایلے..“

اخلاق نے ہالے کے رنگ کا زرد شربت بنا کر مجھے پیش کیا اور اس کے متعدد دگ چڑھانے کے بعد قدرے غمور ہوا اور اس تنہائی سے لطف اندوز ہونے لگا جس میں ابھی تک میرا کوئی ساتھی شریک نہیں تھا..

تھوڑی دیر بعد مجھے خیال آیا کہ مجھے اپنے ساتھیوں کو خوش آمدید کہنے کے لیے واپس خیمہ بستی میں جانا چاہیے جہاں انہوں نے اترنا تھا.. انہوں نے اتر کر وہیں بٹکتے رہنا تھا کہ ان کے گمان میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ ہمارے خیمے ادھر ہیں.. میں واپس ہوا.. ڈھلان پر چڑھ کر نالے تک گیا اور پہلی بار اوپر دیکھا جہاں سے نالہ اتر رہا تھا.. اوپر ایک یکتا خوبصورتی کی بری بھری برف بھری لینڈ سکیپ تھی جس پر دھند اترتی تھی اور اس لمحے اس دھند میں سے ایک غیر ملکی کوہ نور دا تر رہا تھا جو شاندار آج صبح تک میں اوپر گیا تھا اور اب شام ڈھلے ہسپاں واپس آ رہا تھا..

خیموں سے آگے میں اس مقام پر جا کھڑا ہوا جہاں سے میں ابھی اترنا تھا.. پھر میرے ساتھی ایک ایک کر کے گلیشیر پر نمودار ہوئے اور آہستہ آہستہ نیچے آنے لگے.. میں آگے بڑھ کر انہیں خوش آمدید کہتا اور پھر ایک بچے کی طرح ان سے پوچھتا کہ ذرا ایک نظر اس دڑے کے وسیع دامن پر ڈال لیں اور ذرا اندازہ لگائیے کہ ہمارے خیمے کہاں ہو سکتے ہیں..

دو غیر ملکیوں کے خیموں کے انبار میں اپنے خیمے تلاش کرنے لگتے اور جب وہ کہیں نظر نہ آتے.. ان کا سراغ نہ ملتا تو میری طرف دیکھنے ناراض نظروں سے کہہ دیتے تھے اور میں ایک چوڑی مسکراہٹ کے ساتھ دڑہ گندوگورو کی وادی کی جانب اشارہ کرتا.. اس مقام کی جانب جو ان کے گمان میں بھی نہ تھا..

مجھے خاص طور پر حسن کا انتظار تھا۔ اور جب وہ برمانی کی زیر نگرانی خیمہ گاہ میں داخل ہوا تو ہم سب نے تالیاں بجا کر اس کا استقبال کیا کہ وہ آج کا ”ہیرا“ تھا۔ بھاری اور نقہ ہمت کے باوجود وہ یہاں تک پہنچ گیا تھا۔ اس کے حوصلے اور ہمت کی داندہ دینا زیادتی ہوگی۔ اور اس کے چہرے پر تازگی تھی۔

ہم سب ایک قافلے کی صورت خیمہ بستی میں سے گزر کر۔ نلے کے پار ہو کر۔ اپنے خیموں تک چلے گئے۔

اور جب پہنچے تو سب کی تھکاوٹ اور پڑمردگی دور ہوگئی۔ اور ہر کوئی چپکنے لگا۔ حسن ایسے پیار کا بھی حال اچھا تھا۔ اس کے منہ پر رونق آگئی تھی۔

”کیوں سلمان۔ کیسا منظر ہے اور کیا مقام ہے۔“ میں نے اسے داد طلب نظروں سے دیکھا۔

”اوئے ہوئے۔ اعلیٰ سرجی۔“

”اور خیلو میں تم کہتے تھے کہ سرجی یہیں موٹل میں چند روز گزار کر واپس چلتے ہیں، آگے جا کر کیا کرنا ہے۔“

”آپ بھی تو کہتے تھے سرجی۔ میں نے تو جھک ماری تھی آپ بھی اقرار کر لیجئے۔“ وہ اتنا پر مسرت ہو رہا تھا کہ اس نے فوراً کھڑے ہو کر اپنی ہتھیلیاں نیچے کرتے ہوئے اپنا بدن شیک کیا۔ ”سرجی بھالو بن کر دکھاؤں؟“

حسن تو ٹھیک ہو چکا تھا لیکن برمانی کی حالت کچھ غیر ہو رہی تھی۔ کبھی وہ کان میں کھلبلی کرتا تھا، کبھی بدن کو کھجانے لگتا۔ اور کبھی اپنی گھنی بھرمانہ بھنوں سنوارنے لگتا۔ اٹھتا اور ٹھکتا پھر بیٹھ جاتا۔ کبھی خیمے کے آگے بیٹھ کر لیٹے پیک کو تھکنے لگتا اور کبھی سامنے بستی ندیوں کو پھلٹا گتا ان کے درمیان کسی پتھر پر جا بیٹھتا اور ہنری مور کے جیسے ”دے تھنکر“ کا پوز بنا کر۔ سوچ بچار میں غم ہو جاتا۔

میاں صاحب بھی اس منظر میں پہنچ کر اتنے راضی ہوئے کہ انہوں نے فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے شاہد کے کندھے پر ایک دھپ لگا کر کہا ”خال صاحب آج آپ بے شک میرے خیمے میں سو جاؤ۔ اور بے شک خراٹے پر خراٹا مارو تمہیں ڈر کس کا ہے۔ آہو۔ اجازت ہے۔“

”ہاں بھئی سلمان۔ تم یہاں گڈی نہیں اڑاؤ گے۔ یہ درہ گندو گورو کا بیس کیپ ہے۔“

سلمان وہ ورلڈ چیمپئن گڈی باز ہے جس نے ”سنو لیک“ پر جا کر بھی گڈی اڑانے کی کوشش کی تھی۔ کہتے ہیں چور چوری سے جاتا ہے، ہیرا پھیری سے نہیں جاتا۔ اسی طور ایک لاہور یا بے شک امریکہ اور آسٹریلیا ہو آئے جو کہ سلمان ہو یا تھا لیکن گڈی اڑانے سے باز نہیں آتا۔ اس بار وہ دہلی گڈی کی بجائے ایک ریڈی میڈ امریکی کاسٹ لے کر آیا تھا جو اس نے شائی پو میں اڑائی تھی۔ یہ کاسٹ کے سکس اور کے سیون کی برقوں کے آس پاس تادیر اڑتی رہی لیکن اس میں لاہوری گڈی والا تھل نہ تھا۔ نہ یہ کئی کھاتی تھی نہ بد معاشی سے کندھے مارتی تھی اور نہ شرانے بھرتی تھی۔ بس ایک شریف بی بی کی مانند جسم ہلائے بغیر اڑتی چلی جاتی تھی۔ شاہد صاحب نے بھی اس کی سادہ ڈوری ہاتھ میں لے کر اسے مزید بلند کرنے کی کوشش کی۔ اور اس دوران جب ایک جرمن کوہ نور خاتون قریب سے گزری تو اس نے نہایت حیرت سے اس کاسٹ کی اڑان کو دیکھا تو شاہد صاحب نے فوراً پیشکش کر دی۔ ”فلانی کاسٹ۔“ ”ویم لیدی۔“ لیکن لیدی نے یہ آفر قبول نہ کی بلکہ جواب دینا بھی گوارا نہ کیا اور ایک چڑھی ہوئی تیوری کے ساتھ اپنے خیمے کی جانب چلی گئی۔

”تم نے ضرور بے عزت ہونا ہوتا ہے خاں صاحب۔“ میاں صاحب اس روز جلال میں تھے۔ ”وہ کیا سمجھے گی کہ پاکستانی ایسے ہوتے ہیں۔“

”اور کیسے ہوتے ہیں میاں صاحب۔“ شاہد صاحب ترنگ میں تھے اور ابھی نہیں جانتے تھے کہ آج شام انہیں خیمے سے باہر نکال دیا جائے گا۔ ”دیکھیں ناں یہ تیسویں ہری مہمان ہیں اور مہمان نوازی کے کچھ آداب ہوتے ہیں۔ میں نے اگر اسے کاسٹ اڑانے کی پیشکش کی تو انکی آداب کے تحت کی۔ وہ نہیں مانی تو کیا فرق پڑتا ہے۔“

”ہاں بے عزتی بے شک ہو جائے کیا فرق پڑتا ہے۔“ میاں صاحب بڑبڑائے۔ اس دوران ایک اور خاتون ادھر سے گزری تو شاہد صاحب نے پھر صلح ماردی۔ ”گند کاسٹ میڈم۔ فلانی کاسٹ۔ پاکستانی کاسٹ۔“

یہ کہنے کی کیا ضرورت ہے کہ اس خاتون نے بھی۔

تو اب یہاں گندو گورو کے بیس کیپ میں بھی ضروری تھا کہ فلانی کاسٹ کی جائے اور کم از کم اس لیے کو تو ”بو“ کر کے خود ہی لوٹ لیا جائے۔ تو میرے اس استفسار پر کہ سلمان یہاں درہ گندو گورو کے بیس کیپ میں گڈی نہیں اڑاؤ گے۔ اس نے نہایت متانت سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”نہیں سرجی۔“

ایک کفرانِ نعمت تھا۔

اور آپس کی بات ہے اور سچی بات ہے کہ میرا گھوڑا پین... میں جو اس پر تیز رفتار ہوا تھا... فلائنگ ہارس ہو گیا تھا تو یکدم ہسپاں میں پہنچ کر میری تمام تر ہارس پاور زیرِ دہائی ہو گئی۔ یعنی میری بیڑیاں ڈاؤن ہو گئیں بلکہ ڈاؤن اینڈ آؤٹ ہو گئیں... پنڈلیوں میں ٹیسس اٹھنے لگیں... پاؤں من من کے ہو گئے اور مجھ میں قطعی طور پر اتنی سکت نہ رہی کہ پھر سے ٹک سیک اٹھا کر اس ہائی ہائی کیپ کی جانب چڑھنے لگوں۔

”صاحب ہائی کیپ نہیں چلے گا؟“ حسین نے گویا نمک پاشی کی۔

”نہیں چلے گا۔“

”ہم جانتا تھا کہ نہیں چلے گا۔“

بہر حال گندوگورو کی چوٹی فتح کرنے کے بارے میں نہایت سنجیدگی سے غور و غوض ہوا... یہ منصوبہ بندی بالکل ایسے تھی جیسے ایک سپاہی اپنے ہتھیار ڈال کر... وردی اتار کر ایک ٹیکر میں ملبس لینا ہوا اور فوری طور پر میدانِ جنگ میں اترنے کی منصوبہ بندی کرنے میں مشغول ہو۔

”پہلے تو ہمیں کل ہائی کیپ تک پہنچنا ہوگا... پھر برسوں سویرے بارہ ایک بجے رات کے لگ بھگ گندوگورو گھیشیر کی برفوں پر چڑھتے ہوئے چوٹی کے دامن میں پہنچنا ہوگا... اور وہاں شنید ہے کہ سامنے ایک برف کی دیوار ہے جیسا کہ سکر دو میں ہمیں بتایا گیا تھا... اس دیوار کے نیچے ہوشے کے چند ہائی پورٹر جنہیں RESCUE کہا جاتا ہے، ہم جیسے ناقہ قہت اندیش اور عمر رسیدہ کوہ نور دوں کے منتظر ہوں گے... وہ ہم سے تین سو روپے فی کس کے حساب سے چارج کریں گے کیونکہ انہوں نے اوپر چڑھنے کے لیے چوٹی تک رسے لگا رکھے ہیں... اگرچہ وہ ہماری مدد کریں گے لیکن ان رسوں کو تھامنا اور ان پر چڑھنا ہمارا ذاتی فعل ہوگا... اور یاد رہے ایسی برف دیواروں پر چڑھنے کے لیے بوٹوں تلے کراپون ہاندھنے ضروری ہیں اور وہ ہمارے پاس ہیں نہیں... بلکہ میاں صاحب کے پاس تو بوٹ ہی نہیں ہیں بقول شاہد... بھائی گیٹ کے کسی موچی کے چمڑے کی کتڑ نہیں ہیں... بلندی بھی اتھارہ ہزار فٹ سے زائد ہوگی اور ہم نے آج تک زیادہ سے زیادہ پندرہ سو فٹ کی سترہ ہزار فٹ بلندی سہی تھی اور مرتے مرتے بچے تھے... تو پھر ان رسوں کی مدد سے ہم بالآخر چوٹی پر پہنچ جائیں گے... اگر پھسل کر نیچے گھرائی میں گرنے سے بچ جاتے ہیں تو... تو وہاں چوٹی سے صبح سویرے زبردست نظارہ ہوگا... ہم تصویریں اُتاریں گے اور پھر رسوں کی مدد سے لنگوروں کی مانند

”کیوں؟“

”یہ بدتمیزی ہوگی سر... یہ ایسا منظر نہیں ہے جو کاٹا کیا جائے... اس میں فصل ڈالا جائے۔“ یہ ایک شاندار بھالو فلائی تھی۔

ہم اپنے خیموں کے آگے میٹرس ڈالے کبھی بیٹھے کبھی لیٹے... اس پاس کے سفید خُسن کو آنکھوں میں اُتارتے... بدن پر برف محسوس کرتے نہایت ہائی سپرٹس میں تھے... اور چونکہ ہم یہاں چند روزہ رافٹ ہائی تھے، اس لیے سپرٹس بہت ہی ہائی تھیں۔

ہم اتنے سیانے تو تھے کہ ہم خوب جانتے تھے کہ یہاں سے مزید آگے جانا بکل ہائی کیپ تک پہنچنا اور برسوں گندوگورو کی چوٹی سر کرنا ہمارے بس سے باہر تھا۔ اس کے باوجود نہایت سنجیدگی سے چوٹی کو فتح کرنے کے بارے میں تبادلہ خیال ہوا اور منصوبہ بندی کی گئی۔

اور ہاں ہسپاں کے راستے میں میں نے دونوں حسینوں میں سے جو اچھا اور مددگار حسین تھا اور کاندے کا تھا، اس کے ساتھ میں نے ایک سازش کی تھی۔ ”حسین تم بھی جان چکے ہو گے کہ آج میں گھوڑا ہو چکا ہوں، اس لیے امکان یہی ہے کہ میں اپنے ساتھیوں سے بہت پہلے میں کیپ پہنچ جاؤں گا تو آپ بتاؤ کہ وہاں سے وہ ہائی کیپ کتنا دور ہے جہاں سے گندوگورو کی چوٹی سر کرنے کے لیے نکلتے ہیں اور اس ہائی کیپ سے بھی پہاڑوں کی سلطنت کی چند خوبصورت لٹاکیں دکھائی دیتی ہیں۔“

”صاحب ہسپاں سے صرف تین گھنٹے کا سفر ہے اور واپسی صرف ایک گھنٹے میں ہو جاتی ہے۔“

”تو پھر حسین میں اور تم کچھ دیر آرام کر کے آگے چلیں گے... کیا خیال ہے؟“

”چلیں گے سر۔“

”کیا خیال ہے میں پہنچ جاؤں گا؟“

”آپ کہتا ہے کہ آپ گھوڑا ہو گیا ہے تو گھوڑے کے لیے تو کوئی مشکل نہیں۔“

چنانچہ یہ سازش ہو چکی تھی لیکن ہسپاں پہنچ کر اس سازش کے غبارے میں سے ہوا نکل گئی۔

کیونکہ یہاں ہم ایسے منظر میں داخل ہو گئے تھے کہ اسے فوراً چھوڑ کر اوپر چلے جانا... کسی ہائی کیپ کی جانب... جو جانے کتنا ہائی تھا اور گھوڑا ہو جانے کے باوجود... جانے کتنا ہائی تھا۔

ہوئے۔ گندوگور و تو کیا کے ٹو پر بھی چڑھ جائیں۔ کیا خیال ہے۔“
 ”سر جی۔“ سمان نے دُخل در نامعقولات کیا۔“ کچھ تجربیدی سی۔ رومانی سی گفتگو
 شروع ہوگئی ہے۔ آپ رانجھا کو چھوڑیں کسی ہیر کو راضی کریں۔“
 ”رانجھا تو بے پروا ہے۔ وہی بے پروا جس کے ساتھ دل لگ جاتا ہے۔ ہیر کو راضی
 کرنا اہلہ مشکل ہے۔“

میاں صاحب بور ہو گئے۔ ”آپ نے جس کو بھی راضی کرنا ہے کریں۔ میں پکوروں کا
 نمک مرچ چیک کر کے آتا ہوں۔“

اور تھوڑی دیر کے بعد جب سردی پندرہ ہزار فٹ بلند ہسپاں پر اترتی تھی۔ ہمارے
 سانسوں کو سفید کرتی تھی تو ایک طشت میں بے گرم گرم۔ بھاپ دیتے۔ درود گندوگور کے دامن
 میں۔ اس کی وادی میں۔ لیلے پیک کے آٹے ساٹنے۔ پکڑے آئے۔ نما کو کبچپ کے ساتھ تو ہم
 سب کچھ منظر و نظر بھول گئے کہ ان پکڑوں کا ذائقہ جنت کے میوؤں ایسا تھا۔ اور ان میں خوبی یہ تھی
 کہ میٹھے نہ تھے، نمکین اور چٹ پٹے تھے۔

حسن صاحب حسب معمول اپنی صحت کے بارے میں احتیاط پسند۔ تشویش میں مبتلا
 فوراً اپنی منزل وائر کی بوتل خیمے سے نکال لائے۔ ”سر جی یہ پورٹر جو پانی ہمیں پلا رہے ہیں، کہتے تو
 یہی ہیں کہ چشمے کا ہے لیکن میں نے دیکھا ہے کہ یہ سامنے والے گدلے تالاب میں سے بھر بھر کر لا
 رہے ہیں۔ اس میں مٹی کے علاوہ پتہ نہیں کیا گیا ہے تو احتیاط کیجیے۔“

”حسن صاحب میں نے کبھی کسی معاملے میں احتیاط نہیں کی۔ برالدو اور شیوک کا پانی
 پیا ہے۔ بچپن میں گلہرو منڈی کے جو ہڑوں میں نہاتے ہوئے اُن کا پانی بھی طاق سے اُترا ہے،
 مجھے کچھ نہیں ہوتا۔“

”تب کچھ نہیں ہوتا تھا۔ اب تو اپنی عمر کا خیال کریں۔ احتیاط کریں۔“

”کیسے احتیاط کریں؟“

”صرف یہ منزل وائر نہیں جو میں لاہور سے اتنی احتیاط سے اور سنبھال کے لایا

ہوں۔ مان جائیں۔“

چنانچہ میں مان گیا اور احتیاط کی۔

پورٹروں کے فراہم کردہ گدلے پانی سے اجتناب کیا اور صرف منزل وائر کے سفید

نیچے آئیں گے۔ اگر نیچے آئیں گے تو۔“
 ”دفع کریں جی گندوگور کی چوٹی کو۔ میں نے تو پہلے دن کہہ دیا تھا کہ اس کا نام بھی بڑا
 خوش لگ رہا ہے۔ وہاں جا کر کیا کرنا ہے۔ مرنا ہے؟ یہیں ٹھہرتے ہیں اور پکورے کھاتے ہیں۔“
 ”پکورے؟“

”ہاں جی۔“ میاں صاحب نے مونچھوں کو ہکا سانا ڈیا۔ ”میں نے ابھی ابھی حسین
 سے بات کی ہے کہ ہمارے پاس ٹین ہے۔ نمک مرچ ہے۔ بلکہ بری مرچ ہے۔ پیاز اور آلو ہیں
 تو کیا تم پکورے بنا لو گے۔ تو وہ کہتا ہے کہ بنا لیں گے۔ میں لاہور کے کشمی چوک میں پکورے ہی تو
 بنا تا تھا۔ تو جناب عالی اس نے کڑھائی چڑھادی ہے اور تیل چٹائے مار رہا ہے تو ابھی تھوری دیر
 میں ادھر ہسپاں میں آپ کو گرم پکورے ملیں گے۔ کاش کہ ہمارے پاس صرف ایک میٹنگن
 ہوتا۔ میٹنگن کے پکورے تو بادشاہ شاہی پکورے ہوتے ہیں۔“

”میاں صاحب۔“ میں نے موسم اور منظر کا مزالیتے ہوئے اُنہیں چھیڑا۔ ”ہم اس سے
 ایک ایسے بلند مقام پر براجمان ہیں۔ جس کے پاس کنکور ڈیا کے برف زار ہیں۔ اپنی شاہ گوری
 ہے۔ چوغو لیزا اور مترے پیک ہے۔ مشاہیرم ہے۔ اور یہ سامنے ہماری لیلے اولیلے ہے۔ پندرہ
 ہزار فٹ بلندی پر ایک تہائی ہے جو ساری کی ساری ہماری ہے اور آپ۔ پکڑوں کی بات کرتے
 ہیں۔ حد ہے۔“

”کیوں حد ہے۔“ میاں صاحب چمک کر بولے۔ ”جناب عالی مجھے پتہ ہے کہ آپ
 اپنا رانجھا راضی کر رہے ہیں۔ جانتے ہیں کہ گندوگور و چوٹی پر چڑھنا آپ کے بس کی بات نہیں اور
 پھر بھی نام ضائع کر رہے ہیں۔ منصوبہ بندی کئے جا رہے ہیں۔“

”میاں جی۔ میری تو ساری عمر ہی رانجھے راضی کرتے گزری ہے۔ کوئی ایک رانجھا
 راضی ہو جاتا ہے تو میرا ہاتھ تمام کرسنولیک تک لے جاتا ہے۔ یا کسراے دکھا دیتا ہے اور اگر
 کوئی بھی رانجھا راضی نہیں ہوتا تو میں اپنے گھر میں قید ہو جاتا ہوں۔ تو آپ مجھے اپنا رانجھا راضی
 کرنے دیں، آپ کا کیا جاتا ہے۔“

”کچھ بھی نہیں جاتا۔“

”ویسے وہ اوپر والا رانجھا راضی ہو جائے تو سب کچھ ہو جاتا ہے۔ ہم گندوگور و کی چوٹی
 پر بھی پہنچ سکتے ہیں۔ وہ اپنی وجہی پر ہمیں ایک میٹھی تان سنا دے تو ہم اس کی دھن پر جھومتے

گھونٹ بھرے اور پکڑے کھائے.. بلکہ بقول میاں صاحب پکڑے کھائے..

یہ ایک عجیب سرمست مد بھری کیفیت تھی..

ہسپاں کی آلودہ بھیڑ بھری خیمہ بستی سے ہمارا کوئی واسطہ نہ تھا.. ہم گندوگورو کی وادی کے واحد مہمان تھے.. بند یوں کے کناروں پر.. برفیلی ابھار والی چوٹیوں کے سامنے ہم بیٹھے تھے اور.. پکڑے کھا رہے تھے..

ہر ٹریک کے دوران کم از کم ایک ایسی شام آ جاتی ہے جو ساری مشقتیں اور کشتیں بھلا دیتی ہے اور کہتی ہے کہ.. کیا میں تمہاری پوری زندگی کے لیے کافی نہیں ہوں.. تمہیں اور کیا چاہیے.. میں.. یہ شام چرس کے قدیمی نائٹ کلب مالن روڈ میں.. روم کے ویڈیو میں.. شاہک ہوم کے کنڈر گاٹن.. انڈن کے پکاؤلی سرکس.. ویٹس کے گندولوں اور لاہور کی مال روڈ پر کبھی نہیں اُتری.. صرف اس لمحے چندرہ ہزار فٹ کی بلندی پر درہ گندوگورو کے دامن میں.. لیٹے پیک کے سامنے صرف تم پر اُترتی ہوں تو تمہیں اور کیا چاہیے..

اور کم از کم مجھے تو کچھ اور نہیں چاہیے تھا..

یکدم شام گہری ہو گئی..

نالے کے پار ہسپاں کی پُر جھوم بستی کے خیمے تاریکی میں چلے گئے اور وہاں کچھ لالٹینیں روشن ہو گئیں..

شام گہری ہوئی تو بے حد سرد بھی ہو گئی..

اس کی سردی ہمیں بے آرام کرنے لگی..

ہم ٹھٹھرنے لگے..

ہم بدستور پکڑے کھاتے جاتے تھے اور ٹھٹھرتے جاتے تھے..

نالے کے پار ہسپاں کی خیمہ گاہ میں کچھ اور لالٹینیں روشن ہونے لگیں..

ان کے ٹکس ان پانیوں پر تھے جن میں لیٹے پیک کی برلیں اُتری ہوئی تھیں.. اور جب

ہمارے بدنوں نے دوہائی دے کر ہمیں خبردار کیا کہ اگر تم مزید اسی شام میں.. اور اتنی بلند شام میں

یونہی پکڑے کھاتے رہو گے تو پچھتاؤ گے.. یونہی حنوط ہو جاؤ گے.. ایسی حالت میں اگلی سویر

دریافت ہو گے کہ تمہارے ایک ہاتھ میں پکڑا ہوا گا اور دوسرے ہاتھ میں کچھ بھی نہ ہوگا.. تو ہم اٹھے

اور بمشکل اٹھے.. سردی سے کڑکڑاتے بدنوں کو سنبھالنے اٹھے اور اپنے خیموں میں چلے گئے.. اور

جب ایک بار خیموں میں چلے گئے تو پھر دوبارہ باہر آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا چاہے باہر ہیر

اپنے رانگے چنگ پر لپٹی آمادہ وصال ہی کیوں نہ ہو..

اتنی سردی میں وصال کی خواہش بھی سکڑ جاتی ہے..

ہم نے اپنے خیموں میں ہی رات کھانا کھایا.. سویٹر اور جیکٹیں پہن کر اپنے سلیپنگ بیگز میں سٹ کر.. کپکپاتے ٹھٹھرتے خیموں میں جانے کی کوشش کرنے لگے..

پڑے۔ کہیں مٹانے پر اتنا دباؤ نہ پڑ جائے کہ میں رہ نہ سکوں۔ اپنے آپ پر کنٹرول کرنا ممکن نہ ہو اور خیمے سے باہر جانے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ ہو۔

اور یہی ہوا۔

اگرچہ میں نے پیش بندی تو بہت کی تھی۔ چائے نہیں پی تھی۔ خیمے میں جانے سے پیشتر اپنے آپ کو فارغ کیا تھا لیکن اس سرد مہری کی شب میں ایک لمحہ آ ہی گیا جب تمام تر ضبط کے باوجود اس بے اختیاری نے مجھے بے اختیار کر دیا اور میں اپنے سلیپنگ بیگ میں سے سرکٹا ہوا حسن اور سلمان کے درمیان میں سے بھٹکتا ہوا خیمے سے باہر آ گیا۔

باہر آ کر میں نے ذرا دور جانے کا تردد نہ کیا۔

کہ باہر ایک شدید سرد مہری تھی۔ ایک چُپ مُنمُند برفانی سکوت تھا۔

دو پشتری ابھی تک گھاس پر پڑی تھی اور اس میں بچے ہوئے چند پکڑے سردی سے پتھر بور ہے تھے۔

میں نے دور جانے کا تردد نہ کیا اور ٹھہرتے ہوئے اس پر یشر سے نجات حاصل کی جس نے مجھے باہر آنے پر مجبور کر دیا تھا۔

خیمے کے اندر واپس جانے سے پیشتر جونہی میں نے آس پاس نگاہ کی، تو میں سردی سے نہیں حیرت سے مُنمُند ہو گیا۔ مجھے احساس ہوا کہ رانجھا مجھ سے راضی ہو گیا تھا اور اسی نے پریشور کا یہ بہانہ میرے لیے تخلیق کیا تھا تاکہ میں خیمے سے باہر آؤں اور اسی سردرات میں اس کی سفید قدرت کا مشاہدہ کروں۔ جو کچھ اس نے تخلیق کیا تھا۔ اسے دکھانے کے لیے اس نے مجھے اپنے خیمے سے باہر نکالا تھا۔

اس لیے کہ اس نے۔ میرے رانجھے نے وہ سب کچھ۔ دو بلندیاں، برفیں، سکوت۔

لیلیٰ۔ ندیاں اور یہ رات صرف میرے لیے بنائی تھیں۔

میرے لیے بنائی تھیں تو وہ کیسے مجھے نہ دکھاتا۔

ہسپاں کی خیمہ گاہ کی سب لائٹیں گھپ اندھیرے میں الجھ چکی تھیں۔

لیلیٰ پیک پر ایک ٹاپیٹا تاریکی کا راج تھا اور اس اندھیرے راج میں ستارے اترتے

تھے اور ٹوٹتے تھے۔

اور سامنے بریلی چوٹیوں پر جو آسمان تھا، اس میں ابھی ابھی چند ستاروں نے جنم لیا تھا،

”ہسپاں کی رات۔ اور لیلیٰ پر ستارے گرتے تھے“

اس شب میں بے حد خوفزدہ ہوا۔

میں اگرچہ دوپہر کی ٹاپ پر رات گزار چکا تھا جو ہسپاں سے دو ہزار فٹ زیادہ بلند تھا لیکن وہ گئے زمانوں کے قصے تھے۔

میں خوفزدہ صرف اس خیال سے ہوا کہ کہیں اس بلندی پر دل کے راستے میں کوئی انک نہ آجائے۔ کسی شریان میں کوئی رکاوٹ نہ آجائے کہ سانس بھی رکاوٹ سے انک انک کر آتا تھا۔ نہ کہتا تھا اور اسے کھینچتا پڑتا تھا۔ اور میں پوری شب اپنے آپ کو تسلی دیتا رہا کہ نہیں۔ جو کچھ ہونا ہے اس بلندی پر۔ ایک نامعلوم دڑے کی وادی میں تو نہیں ہونا۔ اگر دل نے رکنا ہے۔ کچھ نہ کچھ ہونا ہے تو براہ کرم تھوڑا انتظار کرے۔ ذرا مہلت دے اور لاہور واپس پہنچنے پر جو دل کے دل میں آئے بے شک کر لے۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ برمانی بھی اسی کیفیت میں مبتلا ہے اور پوری شب خیمے سے باہر ٹھہتا رہا ہے۔ ورنہ کچھ تسلی ہو جاتی کہ جو میرا حال ہے وہ سب کا حال ہے۔

ویسے بلندی پر اگر بے چینی اور بے اطمینانی کی کیفیت ہو تو لیٹے رہنا مناسب نہیں ہوتا۔ اٹھ کر بیٹھ جائیں یا اس سے بہتر ہے کہ خیمے سے باہر نکل کر ٹھہلنے لگیں تو قدرے افاقہ ہو جاتا ہے۔ طبیعت سنبھل جاتی ہے۔

میں نے وہ شب شدید زور و موت کی قربت کے خوف میں گزاری۔

ایک اور خدشہ تھا۔

نہایت عامیانا اور انسانی خدشہ۔ کہیں اس مُنمُند رات میں مجھے مجبوراً خیمے سے باہر نہ لکھنا

روشنی حاصل کی تھی اور ابھی ابھی ٹوٹے ٹم ہوتے تھے۔

بریلی بلند سیاہ رات میں مجھے گھیرے ہوئے اور ان پر ابھی ابھی جنم لینے والے ستاروں کی روشنی۔

سرد۔ بلند۔ ستاروں سے اُنی رات۔ جو سردی کے باوجود بجھتے نہ تھے، بھڑکتے تھے اور ان میں سے کوئی ایک ٹوٹا تھا اور راکھ ہوتا تھا۔

یہ درست کہ میں ہائی کیپ تک نہیں جاسکا تھا۔ گندوگور کی چوٹی پر نہیں پہنچ سکا تھا لیکن یہ بھی تو درست کہ آسمانوں میں اتنے ستارے دیکھنا اور ان میں سے کچھ کو لیلے پیک پر گرتے دیکھنا۔ اس کی برقوں میں گم ہوتے دیکھنا۔ ایک خوش بختی ہے۔

لیلے پیک کے عین اوپر ایک ستارہ بکھرا ایک روشن لکیر تار یک آسمان میں چھیدا راکھ ہو گیا۔

میں نے اس رات میں خیمے کے باہر کھڑے ہسپاں کی رات میں اپنے آپ کو اس ستارے میں محسوس کیا۔ کہ میں اگرچہ آسمانوں میں چھیدا نہیں کر پایا تھا لیکن دژہ گندوگور کی اس رات کے خُسن کی تاب نہ لا کر۔ بہر طور راکھ ہو گیا تھا۔ اور اس راکھ کو میں نے ایک عمر گریڈ بنا تھا۔ کہ کہیں اس میں ایک چنگاری لیلے کی مل جائے۔

میں نے ایک عمر اس راکھ کو گریڈ بنا تھا۔

لیلے پیک کے اوپر ستارے یوں گرنے لگے جیسے پروانے بھسم ہو کر گرتے ہیں۔

میں ابھی ایک ستارہ تھا اور ابھی وہ پروانہ تھا جو لیلے پر گرتا راکھ ہوتا تھا۔

”لاہور کی سویر۔ اور باقی رہ گیا ایک۔ میں!“

وگین فیروز پور روڈ کے شور میں تھی۔

لاہور کی نہر میں گرمی کے مارے ہوئے ٹھک دھڑنگ بچے چھلانگیں لگا رہے تھے۔

برمانی گم تھا۔

اُس کے ذہن میں جانے کوئی فلم چل رہی تھی۔ وہ اپنی سیاہ آنکھیں اور بھرمانہ بھویں اگرچہ لاہور کی بے ہنگم ٹریفک پر رکھتا تھا لیکن وہ اسے دیکھ نہیں رہا تھا۔ اپنے ذہن کے پردے پر جو فلم چل رہی تھی، اُسے دیکھ رہا تھا۔

ہم بھی جو وگین میں رہ گئے تھے، وگین میں نہیں تھے کہیں اور تھے۔ ہمارے ذہن کی سکرین پر بھی دژہ گندوگور کے سفر کی ایک ڈاکو منٹری چل رہی تھی۔

کلمہ چوک میں ایک پتھر بڑا ہاتھ اٹھا ہوا تھا۔ اسے کسی مغنیہ کے ہاتھ سے تشبیہ دی جاتی تھی۔ ہمیں اس میں سے لیلے پیک اُبھرتی دکھائی دینے لگی۔

برمانی لاہور کی نہر میں بہتا تھا اور بہتا جاتا لیلے کے گلے جا لگتا تھا۔ ہم سب کی آنکھیں کھلی تھیں اور جو کچھ سامنے تھا، اسے نہیں دیکھ رہی تھیں، دل کے بھیتر میں جو فلم چل رہی تھی، اسے دیکھ رہی تھیں۔ بلند چٹان پر براجمان سُرخ جوڑے میں ملبوس ایک جمل پری۔

شاد وہ خود بھی پتھر کی تھی لیکن اس کا سُرخ چہرہ ان ہوا میں پھڑپھڑاتا جا رہا تھا۔

شائی چوکی رات۔ رات میں رقص۔

دل سنگ پا کے ستارے۔ مشاہیر سے باتیں۔

لمتان جانے والی بس کی روانگی میں ابھی کچھ دیر تھی۔

”تارڑ صاحب.. برہانی کو میرے ہاں ڈراپ کر دیں.. یہ کچھ تازہ دم ہوئے.. ذرا نازل ہو جائے تو پھر میں اسے یہاں چھوڑ دوں گا..“
 عامر کے گھر کے آگے بلند بوتل پام کے درختوں کے عقب میں سے کچھ گن میں اور پہریدار نکلے اور عامر اور برہانی کا سامان ونگین میں سے اتارنے لگے..
 شاید بھی اپنے گھر کے گیٹ کے سامنے خاموشی سے اتر گیا..
 باقی رہ گیا ایک..
 وہی ایک جو اس سارے فساد کی جڑ تھا... میں!

”گندوگورو کے میراثی.. ہائے اوئے!“

وہ بھی ایک عجیب سویر تھی..
 ہسپاں میں دڑہ گندوگورو کی واوی میں جو سویر تھی.. عجیب تھی..
 میں اس سویر کو دیکھ نہیں رہا تھا، اپنے خیمے میں سلپنگ بیگ میں لیٹا اس سویر کو نہیں رہا تھا.. ایک سویر کیسے بول سکتی ہے؟
 اگر سویر نہیں تو اسے دیکھنے والے تو بول سکتے ہیں..
 اور وہ بول رہے تھے..
 سب سے بلند بولی سلمان کی تھی.. ہائے اوئے...
 اور یاد رہے کہ جیسے مسٹر گیس والا یوسف کسی منظر یا چہرے کو دیکھ کر بے قرار ہو کر ”یہ تو ندر ہے“ کا نعرہ لگاتا تھا، اسی طور سلمان ایسے موقعوں پر دل پر ہاتھ رکھ کر ایک شدید لاہوری ”ہائے اوئے“ کرتا تھا..
 چنانچہ یہ اس سویر میں سلمان کی پہلی ”ہائے اوئے“ تھی..
 ”اوئے بھالو.. کیوں شور مچا رہے ہو؟“ میں سلپنگ بیگ کی بگ میں سے بولا..
 ”تارڑ صاحب ہائے اوئے.. لیلے پیک پر ابھی ابھی سویر کی کرنیں اترتی ہیں اور اس پر سویر کے سنہرے پن کا اثر ہو رہا ہے.. سر جی سستی اور نامردی کو ترک کر کے باہر آ کر تو دیکھیں کہ لیلے کیسے ہولے ہولے سنہری ہو رہی ہے.. ہائے اوئے..“
 ”بچے تم اپنی رنگ کو مسڑی جاری رکھو..“ میں نے اپنے سلپنگ بیگ میں مزید سکڑتے ہوئے پکارا کہ سردی ابھی پورے جوہن پر تھی.. بیگ میں سے ہاتھ نکالتا تھا تو برف ہو جاتا تھا.. ”میں من رہا ہوں..“

”سرجی.. میں کیمرے کے لینز کو لیلے پیک پر زوم ان کرتا ہوں تو یوں لگتا ہے کہ یہ لینز لیلے کا بوسہ لینے کو ہے.. ہائے اوئے..“

”بیان جاری رہے..“

”سرجی آپ نے نور جہاں کا وہ گیت تو سنا ہوگا کہ.. سونے دی تو تیزی... جے میں ہوندی ڈھولنا ہوندی ڈھولنا سونے دی تو تیزی.. تو سرجی میرا دل بھی یہی چاہ رہا ہے کہ میں اگر یہ زوم لینز ہوتا تو لیلے پیک کی سنہری ہوتی برفوں کے بوسے لے رہا ہوتا بقلقم خود..“

”بے چاری لیلے پیک“

”ہائے اوئے..“

میاں صاحب کے چپکنے کی آوازیں بھی مجھ تک آرہی تھیں.. یقیناً وہ اسی اوجھار شدہ وڈیو کیمرے کو گندو گورو کی سویر کے منظر پر بے دریغ گھما رہے تھے اور اس کے ساتھ آپس بھی بھرتے جاتے تھے.. ”ہائے ہائے تارڑ صاحب باہر بڑا نامہ نیم منظر ہے.. نظارہ کرنا ہے تو آ جاؤ..“

شاہد کی آواز بہت دیر بعد آئی کیونکہ وہ اپنے کیمرے کا پرچہ اور سپیڈ سیٹ کرنے میں جتنی دیر لگاتا تھا اتنی دیر میں وہ منظر اکٹا ہٹ سے پہلو بدلنے لگتا تھا کہ میاں اب تصویر اتار بھی چکو مجھے دنیا میں کچھ اور کام بھی ہیں.. تو اس کی آواز دیر آید نادرست آید ”مائی لیڈر.. رب سونے کی شان دیکھنی ہے تو باہر قدم رنج فرمائیں..“

البتہ برمانی کی آواز نہیں آرہی تھی.. شانندہ بھی میری طرح پچھلی شب کی بے خوابی کی کسر نکال رہا تھا..

لیکن وہ وہاں تھا..

یہ اطلاع پھر سلمان کی جانب سے آئی.. ”ڈاکٹر جی آپ.. آپ بھی تو کچھ بولو..“ تو ہلا خروہ بولا.. ”ہم کیا پولیس سائیں.. ہم تو مرشد کے آگے گونگے ہو کر بیٹھتے ہیں.. محبوب کے سامنے کام کرنے کی جرأت نہیں رکھتے.. لیلے سامنے ہے تو گفتار کیسے کریں..“

”ہائے اوئے..“ سلمان نے پھر نعرہ لگایا..

”اب کیا ہائے اوئے؟“ یہ سب لوگ مجھے ہی باہر نکالنے پر کیوں تلے ہوئے ہیں.. ”سرجی کم از کم اپنے خیمے کی چلن اٹھا کر ایک نظر لیلے پر ہی ڈال لو.. دڑہ گندو گورو کی اس برف پٹی کو ہی دیکھ لو جس پر سے کچھ کو نور درتوں سے لٹکتے نیچے آ رہے ہوں گے.. یاد ہے

سکر دو میں ہمیں بتایا گیا تھا کہ صبح سویرے اگر آپ کے پاس دور بین ہو تو یہاں سے ان خوش نصیبوں کو دیکھا جاسکتا ہے جو گندو گورو چوٹی سر کر کے نیچے آ رہے ہوتے ہیں.. رتوں سے لٹکتے.. ایک جھانکی باہر بھی مار لو سرجی.. ہائے اوئے..“

میں نے اپنے برابر میں نیم خوابیدہ حسن صاحب کے کھلے منہ کو دیکھا اور ہونہ.. ان کی آنکھیں ابھی نہیں کھلی تھیں، اس لیے ان کے منہ سے مخاطب ہو کر کہا.. ”حسن صاحب.. شاہ جی..“

”ہاں جی..“ وہ نیند میں ہی مسکراتے ہوئے معصومیت سے بولے..

”سید بادشاہ باہر حشر برپا ہے.. ہسپاں میں سویر ہو رہی ہے اور برف بلندیاں آہستہ آہستہ سنہری ہو رہی ہیں.. اور جتنے بھی بین الاقوامی شہرت کے حامل فنوگرافر حضرات ہیں، وہ اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دھڑا دھڑا تصویریں اتار رہے ہیں آپ بھی تو ایک نئے نگور کیمرے کے مالک ہیں.. باہر لٹکیے اور تصویریں اتار بیٹے..“

”میں لاہور پہنچ کر شاہد کی کچھنی ہوئی تصویریں دیکھ لوں گا..“ انہوں نے آنکھیں کھولے بغیر کہا.. ”سونے دیں سر..“

”شاہد کی کچھنی ہوئی تصویروں کا کچھ پتہ نہیں چلتا.. جب تک کہ وہ خود نشاندہی نہ کریں کہ جناب یہ پیڑ ہے اور یہ برف ہے کچھ پتہ نہیں چلتا.. آپ یہ رسک نہ لیں باہر جائیں..“

”تو پھر میں سلمان کی تصویریں دیکھ لوں گا اس سویر کی.. وہ تو آسٹریلیا سے کیمبرہ لے کر آیا ہے..“ ایک طویل جھانکی ان کے کھلے منہ سے برآمد ہوتی گئی..

”شاہ جی آسٹریلیا میں صرف کنگر و اور کوالا رینچہ ہوتے ہیں یا پھر فضول سے آسٹریلیا میں ہوتے ہیں جن کے آباؤ اجداد مجرم تھے تو وہ کیمبرہ کرافٹ کیا جائیں.. آپ خود باہر نکلیں..“

حسن اونگھ رہے تھے.. ”میں جی.. میں.. میاں صاحب کی اتاری ہوئی مووی دیکھ لوں گا.. سونے دیں..“

”وہ تو پہلی بار ایک مووی کیمبرہ آپریٹ کر رہے ہیں.. کیا پتہ کیا نتائج برآمد ہوں..“

”آپ چپ کیوں نہیں کرتے چودھری صاحب..“ حسن صاحب اس ٹریک میں پہلی بار ذرا تاتاؤ میں آ کر بولے اور ایک آنکھ کھول کر بولے.. ”آپ مجھے بلاشیری دیئے چلے جاتے ہیں کہ باہر جاؤ، باہر جاؤ، خود کیوں نہیں جاتے..“

”دراصل..“ میں نے کھسیانے ہو کر کہا.. ”مجھے تو سلمان اور دیگر تصویر کش حضرات

”پندرہ ہزار فٹ بلند برفانی کارواں سرائے سے گوج“

ہم خیموں سے باہر آئے تو ہمارے اوپر ڈھلوان پر جو پگھلندی تھی اس پر سے پور ٹر اتر رہے تھے۔

یہ پور ٹران کو دو نور دوں کی ایڈوانس پارٹی تھے جو چوٹی سر کرنے کے بعد نیچے ہسپاں میں آ رہے تھے۔

ان پور ٹروں کو دیکھ کر ایک مرتبہ پھر ہم میں یہ خواہش بیدار ہوئی کہ ہم یہیں ہسپاں میں ٹھہر جائیں۔ آج واپس جانے کی بجائے ہائی کیپ تک پہنچیں اور کل اپنی جان کی بازی لگا کر چوٹی پر پہنچنے کی کوشش کریں۔

لیکن ہم سب کی مجموعی صحت اس لائق نہ تھی۔ ہم جان کی بازی لگانے سے بھی جھپکتے تھے اور چپو میں جس وین کو چھوڑ آئے تھے، اُس کے میٹر پر ڈھائی ہزار روپے روزانہ کا کرایہ بڑھتا جاتا تھا۔ چنانچہ اقتصادی پابندیاں بھی عائد تھیں۔ ویسے بھی یہ ایک برفانی خودکشی ہوتی۔

”سرجی اب باہر آئے ہو تو کیا فائدہ؟“ سلمان کچھ خفا سا تھا۔ ”یہ سامنے والی ندی میں جو سنہری سائے تھے وہ تو دھوپ اترنے سے بہہ گئے۔ سویرے سویرے یہ سامنے والی ساری کی ساری برف پوش چوٹیاں شرمیلی سنہری ہو رہی تھیں اور اب عیاں اور برہنہ ہو گئی ہیں۔ کیا فائدہ؟ آپ دونوں حضرات اب خیموں کی ملک آفر کریں، ہم ان ندیوں کے پار جو پتھروں کا علاقہ ہے وہاں کوئی پانی پیس تلاش کرتے ہیں کیونکہ پریشہر بڑھ رہا ہے۔“

ناشتے کے دوران... ڈھیلے اور چھیلے پراٹھوں کے ساتھ فرائی انڈوں کا ناشتہ کرتے ہوئے آج کہاں پہنچنا ہے۔ واپسی پر رات کہاں کریں گے۔ کے بارے میں گفتگو ہونے لگی۔

پراختیار ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”ایک کافر ادا اور فن موسیقی میں تاک مغنیہ گاتی چلی جاتی تھی اور ایک میرا جیسا کور ذوق سامنے بیٹھا اونگھتا جاتا تھا تو مغنیہ نے اسے جھنجھوڑ کر نہایت غصے سے کہا۔ ”چوہدری صاحب میں غزل گارہی ہوں اور آپ سو رہے ہیں۔“ تو چوہدری صاحب نے ایک طویل جمائی لے کر کہا۔ ”بی بی تم گاتی رہو۔ مجھے تم پر اعتبار ہے۔“

”یقیناً یہ چوہدری صاحب آپ ہی تھے۔“ حسن نے بیزار ہو کر کہا۔ ”اب چپ کر کے لیٹے رہیں یا باہر نکل جائیں، مجھے ڈسٹرب نہ کریں۔“

”ہائے اوئے۔“ سلمان کا ایک اور نعرہ ہائے اوئے بلند ہوا۔

اس کے بعد میں اور حسن صاحب مشترکہ طور پر میراثی ہو گئے اور اونگھتے اونگھتے سو گئے اور جب بیدار ہوئے۔ اور تب بیدار ہوئے جب بیس کیپ وز و گند و گورو پر تیز دھوپ اتر چکی تھی۔ بچپن میں.. گاؤں میں گزارے ہوئے بچپن میں.. جب ہم دیر تک.. دن چڑھے تک چھت پر سوتے رہتے تھے تو میری امی ہمیشہ ڈانٹتی تھیں کہ مستنصر کیا میرا شیوں کی طرح دھوپ چڑھنے تک سوتے رہتے ہو۔ کیونکہ ان زمانوں میں گاؤں کے گوشوں پر.. اپنے کچے گھروں کی چھتوں پر سونے والے کسان مندانہ صرے اٹھ کر بل جوتنے کے لیے کھیتوں کو چلے جاتے تھے اور پورے گاؤں میں صرف میرا شیوں کے دو چار کوٹھے ایسے ہوتے تھے جن پر بھی چار پائیوں پر یہ فنکار حضرات اور ان کے خاندان دھوپ چڑھنے کے باوجود کھیں اور مڑے مڑے سے سو رہے ہوتے تھے۔ اس لیے کہ انہوں نے کہیں نہیں جانا ہوتا تھا۔ اپنا رزق محض باتوں سے کمانا ہوتا تھا۔

یہ الگ بات کہ ایک ایسا زمانہ آیا جب میرے جیسے نجیب الحرفین کسان اور چوہدری حضرات ٹیلی ویژن پر اداکاری اور میزبانی کرتے کرتے کسی حد تک میراثی ہو گئے اور اپنا رزق باتوں سے کمانے لگے۔

تو جناب میں اور حسن صاحب بھی اس سویرے میراثی ہو گئے۔ دیر تک سوتے رہے اور بھری دھوپ میں اٹھے۔

ویسے گند و گورو کے مناظر میں اگر انسان سید اور چوہدری سے میراثی ہو جائے تو بھی یہ گھائے کا سودا نہ تھا۔

مسلمان کسی بے راہ رو قوم کو فنا کی خبریں سناتے والا بیٹا مبرا لگتا تھا۔
چنانچہ فیصلہ یہ ہوا کہ ٹھیک ہے سفر کا آغاز کرتے ہیں۔ اور جب دل سنگ پا پہنچیں گے
تب یہ فیصلہ کریں گے کہ ہم میں مزید آگے جانے کی سکت ہے یا نہیں۔
ایک ایک کر کے جب ہمارے خیمے ایک چھرا شوٹ کی مانند زمین پر گرے تو ہمیں
بے حد قلق ہوا۔

ایک قلق تو یہی ہوا کہ یہ ہماری کوہ نور کی آخری منزل تھی اور اب ہمیں اگلے پاؤں
اُنہی راستوں پر چل کر واپس ہونا تھا جہاں سے ہم آئے تھے۔ وہی منظر۔ وہی بلندیاں۔ وہی
پتھر۔ دوبارہ نظروں کے سامنے آئیں گے۔ ان میں کوئی اجنبیت کوئی سحر کوئی سسپنس نہیں ہوگا۔
اگرچہ واپسی پر ہمیشہ منظر بدلتے ہیں۔ جن کی جانب آپ کی پشت ہوتی ہے، آتے
ہوئے تو وہ سامنے ہوتے ہیں جاتے ہوئے۔ لیکن سب کچھ جانا پہچانا ہوتا ہے۔ اس میں کوئی تھرل
نہیں ہوتا۔

لیکن زیادہ قلق اس بات پر ہوا کہ... ہائے اوئے ہم یہ سپاٹ... گند و گور کی یہ دواہی اور
لپٹے پیک کا آنا سا منہ آج خالی کر دیں گے تو آج شام یا کل کوئی اور ہوگا جو یہاں خیمہ زن ہو
جائے گا۔ جیسے ایک صحرا نور و ادیب کے بارے میں اس کے حاسدوں نے۔ ادبی مافیائے یہ
روایت گھڑ رکھی تھی کہ ایک قومی اعزاز ملنے پر اس نے کہا تھا کہ مجھے یہ اعزاز ملنے پر بے حد مسرت
ہوئی ہے لیکن مجھے یہ دکھ ہے کہ اگلے برس یہی اعزاز کسی اور کو مل جائے گا۔

اور یہ ایسے حاسد اور بانجھ ادیب ہیں جو ہر برس کوئی نڈ کوئی اعزاز حاصل کرنے کے
لیے سر دھڑکی بازی لگا دیتے ہیں اور حکام بالا کے تلوے چاٹ چاٹ کر انہیں رام کر لیتے
ہیں۔ ایسے گدھ جو دوسروں کا رزق کھا جاتے ہیں۔

ذہلوان پر پتھر ملی آماجگا ہوں کے آس پاس جو نیلے ڈرم سبز تھے، اب دو وہاں
نہیں تھے۔

ہسپاں کی خیمہ بستی میں جو خیموں کی رونق تھی، وہ اُڑ چکی تھی اور اس کی ریت پر ان کی
کچھ نشانیاں تھیں۔ خالی ڈبے۔ پیکٹ۔ آلودہ ٹائلٹ پیپر۔ پلاسٹک کے لفافے۔ ٹین۔ کوئی ایک میخ
کسی خیمے کی بستی ویران ہو چکی تھی۔

یقیناً سُرُخ بالوں والی لڑکی بھی کوچ کر گئی ہوگی۔

اصولی طور پر تو دل سنگ پا۔ اور کہاں۔
لیکن مسلمان نے ایک آئیڈیا پیش کیا۔ ”تمام گائیڈ تھس یہ کہتی ہیں کہ ہسپاں سے
واپسی پر چونکہ اُترائی ہے، اس لیے آسانی سے دو منزلیں ملے گی جاسکتی ہیں یعنی دل سنگ پا سے
گزر کر آگے شاکی چو میں پہنچا جاسکتا ہے۔“

”اس مارا ماری مسافت کا فائدہ؟“
”ایک تو یہ کہ ویگن کا ایک دن کا کرایہ مبلغ ڈھائی ہزار روپے بچ جائے گا اور دوسرے یہ
کہ ہم ایک روز پہلے اپنے اپنے گھروں میں پہنچ جائیں گے۔“
”ہم میں جو شادی شدہ ہیں، انہیں اپنے اپنے گھروں میں ایک روز پہلے پہنچنے کی کوئی
جلدی نہیں۔“ یہ سب کے دل کی آواز تھی۔

”اگر ہم ایک روز پہلے پہنچ جاتے ہیں تو ہو سکتا ہے کہ میں اپنے چھوٹے بھائی کو خدا
حافظ کہہ سکوں جو امریکہ جا رہا ہے۔ کوشش کرو دیکھتے ہیں ورنہ دل سنگ پا سے آگے بھی تو ایک کیپ
سائٹ ہے، وہاں رات گزار لیں گے اور کل ہوشے پہنچ جائیں گے۔“
”پابندی کوئی نہیں ہے۔“ یہ میاں صاحب نے کہا۔ ”ہسپاں سے سیدھا شاکی چو جانا تو
قتل و غارت ہے۔ دیکھتے ہیں کہ کہاں تک پہنچتے ہیں۔“

چونکہ میں کل ایک گھوڑا تھا، اس لیے آج بھی مجھے توقع تھی کہ میں گھوڑا ہی رہوں
گا۔ چنانچہ مجھے کوئی اعتراض نہ تھا۔

تب مسلمان نے خطرے کا ایک ہگل بھایا۔ ”سرجی۔ دل سنگ پا سے آگے جو پہلے
چڑھائی تھی اور اب اُترائی ہوگی تو وہاں سے بھی تو اُترنا ہوگا۔“

”اُتر جائیں گے۔“ حسن صاحب نے سر ہلایا۔

”اور آج ذرا آسمان پر نظر کیجیے کہ جگہ جگہ بادل ہیں تو وہاں اس اُترائی کے دوران
اگر بارش ہوگی تو ہم کیسے نیچے اُتریں گے۔ لڑھکتے ہوئے پتھروں کے شکار ہو جائیں گے۔ ہم پر
حدود آؤ نہیں لگ جائے گا اور سنگسار ہو جائیں گے۔ وہاں سے نکلیں گے تو گند و گور و گلیشیر کے
کناروں پر جو راستہ ہے۔ جس کے اوپر مٹی میں پھنسی سینکڑوں چٹانیں ہیں وہ بھی تو بارش کی وجہ
سے ڈی لوکیٹ ہو سکتی ہیں۔ ہم پر گر سکتی ہیں۔ اگر بارش ہوگئی تو کیا یہ بہتر نہیں کہ وہ اُترائی اور وہ
راستہ آج ہی سیٹ دیا جائے۔“

جس جھیل میں لیے عکس ہوتی تھی، اُس کے پانیوں میں کوئی سرخ ہال نہ تھے۔
ہمارے پورے کندھوں پر ہمارا سامان بوجھ کئے۔ اس الگ تھلگ وادی میں سے نکلنے لگے۔
ہم غمزدہ دیکھتے تھے۔ اور بار بار اس سپاٹ کو دیکھتے تھے جس پر ابھی ابھی ہماری حکومت
تھی۔ اور جسے دور سے جو کوئی بھی دیکھتا تھا تو یہی کہتا تھا کہ یہ کیسے لگی ہاسٹرڈ ہیں جن کے خیمے ان
برفانی منظروں میں تنہا لگے ہیں۔ ہم نے وہاں سے سب کچھ سمیٹ لیا۔ اپنے خیمے، سامان، طشت
میں اکڑے چند پکڑے۔ کچھ لفافے، فلم کی خالی ریلیں۔ سب کچھ سمیٹ لیا لیکن ہم اپنی ایک
شب کی موجودگی کو نہ سمیٹ سکے۔

جہاں ہمارے خیمے نصب تھے۔ اور جہاں جہاں ہم اُن کے آگے چلے تھے وہاں
ہمارے بوٹوں کے نشان گیلی زمین پر ثبت تھے جو ہم نہ سمیٹ سکے۔ یہاں تک کہ لیے پیک کے
برف چہرے پر بھی ہماری حریف نظروں کے نشان باقی تھے۔

یہ سب نشان۔ دھیرے دھیرے۔ وقت کے گزرنے سے۔ موسموں کے بدلنے
سے۔ برفوں کے پڑنے سے۔ ہواؤں کے چلنے سے۔ یکسر معدوم ہو جائیں گے۔ مٹ جائیں
گے۔ اور پھر آنے والے زمانوں میں کسی کو خبر نہ ہوگی کہ یہاں اس ہسپاں کی پندرہ ہزار فٹ بلند
برفانی کارواں سرائے میں کچھ مسافر آئے تھے۔ آئے تھے اور ایک شب گزار کر چلے گئے
تھے۔ لیکن۔ اپنی لیلے کو ساتھ لے کر چلے گئے تھے۔ اپنے بدنوں اور روحوں میں اتار کر ساتھ لے
گئے تھے۔ اور اب یہ جو لیلے پیک نظر آتی ہے تو یہ موجود نہیں۔ یہ محض ایک دکھاوا ہے۔ دھوکا
ہے۔ اصل لیلے جو تھی اسے تو اس کے مجنوں لے گئے تھے۔

”پہاڑوں کی رات میں بھٹکتے اندھے فقیر“

آج میں نے پھر نہانے کی سعی تو کھکھیا کر رہ گیا۔ تیز چلنے کی کوشش کی تو ٹانگوں نے
جواب دے دیا۔ اپنی ہمت کو جمع کرنے کا چارہ کیا تو بدن نے دو ہائی دی کہ میاں اس بوسیدگی کی عمر
میں میں تمہاری حرص کا ساتھ نہیں دے سکتا۔

چنانچہ کھلا کہ میں آج گھوڑا نہیں تھا بلکہ بھر سے مستنصر حسین تارڑ ہو چکا تھا۔ اور یہ بھی
کھلا کہ روزانہ گھوڑا نہیں ہوا جاسکتا۔ یہ محض ایک فلوک تھا جو کل لگ گیا تھا۔ میں محض ایک دن کا
گھوڑا تھا۔

ہم انہی راستوں پر۔ گزرے تھے ہم جہاں سے۔ وہاں سے سر جھکائے چلتے ہانپتے
چلتے رہے۔ ابدہ ہندی کم ہوتی چاری تھی اس لیے سانس اتنا بے ربط نہیں ہوتا تھا۔

جب ہم ہسپاں کو جانے والے سفید گلیشیر اور اونچی نیچی پہاڑیوں پر اونچے ہو کر
اور نیچے ہو کر بالا خرمند و گور و گلیشیر پر اترے۔ اسی مقام پر اترے جہاں ایک بڑی دراڑ تھی اور
برف کا کنواں تھا اور پھر اس کی برفیں ناپتے ہوئے اس کی مسافت تمام کر کے اس سے جدا ہونے
کے لیے اس کے بلند کنارے پر چڑھے تو وہاں ایک سانحہ ہو گیا۔

لیلے پیک ہمیشہ کے لیے نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

”سائیں ادھر دو بارہ آنا ہے اور پھر لیلے کے دامن میں۔ اس کے بیس کمپ تک جانا
ہے۔ اس کے چرن چھوئے۔“ یہ برمانی نے کہا۔

اور یہ سائیں نے کہا۔ ”ڈاکٹر یہ تمنا کہ ہم دوبارہ یہاں آئیں گے، کبھی پوری ہونے
والی نہیں ہے۔ آپ کبھی برالدو کے پار اس گاؤں میں نہیں جاتے۔ جو آپ پر سحر طاری کر دیتا

دل سنگ پا سے ہم شتابی سے نکلے.. گند و گورو کے بلند کناروں پر چلتے.. پھولوں کے سوکھے ہوئے کھیتوں میں سے چلتے.. خشک ہو چکی ندیوں کے نشاںوں پر سے گزرتے جب ہم وہاں پہنچے جہاں جھانکنے سے وہ اُترائی نظر آتی تھی تو جھانکا ہے تو ٹھنک گئے.. اگرچہ ہم ذہنی طور پر اس اُترائی کے لیے کل سے اپنے آپ کو تیار کر رہے تھے لیکن اس کے باوجود اس کی پاتال گہرائی اور ناممکن گہرائی کو دیکھ کر ٹھنک گئے کہ ہم اس کے لیے تو قطعی طور پر تیار نہ تھے..

اور اس پر طرہ یہ کہ جانے کہاں سے ایک گھنا بادل نمودار ہوا.. خالی آسمان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور پمپ پمپ بارش اُترنے لگی.. یہ صرف مسلمان کا ڈرتا جس نے بارش برساتی تھی.. ورنہ تو کوئی امکان نہ تھا..

سب لوگ سرا سیمہ ہو گئے اور مسلمان کا رنگ تو باقاعدہ فق ہو گیا.. ہم چونکہ اپنے رنگ نہ دیکھتے تھے.. اگر دیکھتے تو بھی وہ فق تھے کہ اب کیا ہوگا..

بارش باقاعدہ نہیں ہوئی تھی.. بس کبھی کبھار ایک آدھ بوند گرتی لیکن وہ ایک آدھ بوند بھی ہمارا خون آدھا کر دیتی..

پورٹروں نے ہمیں اس بندی سے ایسے نیچے دھکیلا جیسے اناڑی پیراٹرو پر زکو پہلی بار زبردستی جہاز سے دھکیلا جاتا ہے..

اور ایک ایک کر کے دھکیلا..

ان چند بوندوں نے بھی اپنا کام دکھایا اور خشک مٹی کو پھسلن میں بدل دیا.. مجھے وہ پورٹریچے لے جا رہے تھے.. مجھے کسی بھی تعین پر اختیار نہیں.. اُس اُترائی کے دوران یہ نہیں کہ ہم اُترے اور اُترتے ہی چلے گئے.. بلکہ متعدد مقامات پر میرا سانس پیچھے رہ جاتا اور میں آگے نکل جاتا اور آپ اس حقیقت سے بخوبی واقف ہوں گے کہ سانس کے بغیر جینے میں کچھ دشواری ہوتی ہے.. چنانچہ میں ایک حالت مردنی میں کہیں کوئی جھاڑی پتھر تھام کر پیچھے رہ جانے والے سانس کا انتظار کرتا اور جب وہ مجھ تک پہنچ جاتا تو پھر پورٹروں کی ہانپوں میں جھونتا نیچے جانے لگتا..

ہم باری باری نیچے آ رہے تھے..

مسلمان بھی لڑھکتا ہوا نیچے آیا اور ایک ڈری ڈری سی.. ”ہائے اوئے“ کر کے کہنے لگا.. ”لو سرجی یہاں سے بچ گئے ہیں ناں تو اب انشاء اللہ لاہور تک ہمیں سات کی سات خیریں ہیں..“

ہے.. پیپر گلیشیر کی بندی پر اس سرسبز قطعے تک نہیں جاتے جہاں آپ کو خبر ملتی ہے کہ ایسے ہرن ہیں جنہوں نے آج تک انسانی شکل نہیں دیکھی اور وہ آپ کو بھی اپنے جیسا سمجھ کر تھو تھنیاں اٹھائے آپ کے قریب آ جاتے ہیں.. بیافو کی چٹانوں میں گھدے شکاری جھونپڑے میں رات بسر نہیں کرتے.. تو ایسی خواہشیں کبھی پوری نہیں ہوتیں.. لیٹل پیک کے دامن میں پہنچنے والی خواہش بھی ایسی ہے.. اسے تم آخری بار دیکھ چکے.. دوبارہ یہاں کون آئے گا.. کس نے آنا ہے..“

”نہیں بھی آنا سائیں تو ایک مجنوں کا دل رکھنے کی خاطر کہہ دیں کہ ہاں ہم آئیں گے.. اس جدائی کے پہلے بسے میں کچھ تو ڈھارس بندھائیں.. دو بول امید کے بول دیں..“ برمانی واقعی اس بر فانی لیٹل کا اسیر ہو چکا تھا..

”میں تو اپنے لیے کہہ رہا تھا کہ میں تو نہیں کہ میرے پاس عمر کی جو گھڑی ہے، اُس میں گنجائش کم رہ گئی ہے.. مسلسل تک تک کر رہی ہے اور سانسیں کم کر رہی ہے.. سانس تھکڑے کوچ کا باجست ہے دن رین.. اور کسی روز گھڑیاں منادی کر دے گا.. اور پھر لوگ پوچھیں گے FOR WHOM THE BELL TOLLS.. لیکن تم دوبارہ آؤ گے، مجھے یقین ہے.. تم میں جو بلوچ ہٹ ہے وہ تمہیں یہاں لے آئے گی اور تم اس کے دامن میں پہنچ کر اس کے وصال سے سرشار ہوتے ہوئے تب مجھے یاد کرو گے.. کہ پہلی بار تارڑ مجھے لیٹل تک لایا تھا..“

تقریباً دو بج رہے تھے جب ہم دل سنگ پا کی ویرانی میں اُترے..

دل سنگ پا خالی اور بے روح تھا.. تیز دھوپ اس کے رنگ نچوڑ چکی تھی.. جھیل کے پانیوں تلے اس کی کچھڑ بھری تہہ دکھائی دے رہی تھی.. اس میں مشاہیرم کا کوئی عکس نہ تھا..

ہم نے دھوپ میں جھٹے ہوئے کچھ بد مزہ قسم کی چیزیں خوراک کے طور پر نگلیں اور فیصلہ کیا کہ ابھی کچھ وقت ہے، کچھ ہمت ہے اس لیے سفر جاری رکھا جائے.. اگر ممکن ہو تو شائی ٹیو تک ورنہ راستے میں رات بسر کریں گے.. اگر ہمت نہ بھی ہوتی تو بھی ہم دل سنگ پا کی نامہرہاں ویران دھوپ میں نہ ٹھہرتے.. اور مسلمان کی دلی آرزو بھی یہی تھی کہ ہم آج ہی اس ہولناک اُترائی کا کاشٹ کاٹ لیں.. اس ایک بڑے ڈر کا سامنا کر کے اس سے فارغ ہو جائیں..

”سرجی کچھ پینے نہیں کب بارش آ جائے..“ حالانکہ آسمان بالکل خالی پڑا تھا.. بادلوں کا شائبہ بھی نہ تھا.. ”بارش آگئی تو وہاں پھسلن ہو جائے گی.. پتھر گرنے لگیں گے، آج ہی اُس سے پت لیں..“

یہاں سے چلے ہیں تو کچھ دیر میں اس وسیع میدان کے کناروں پر جونہایت اونچی اور
تھمبیر چٹانیں آسمانوں میں تھیں، اُن کے سائے میں ایک خیمہ گاہ نظر آنے لگی۔ اور وہاں وحشی
دو پہر میں چٹانوں کے بڑھتے سائے میں بہت رونق تھی۔ بہت سے خیمے لگے تھے اور ان کے
قریب چٹانوں میں سے اُترتے ایک چشمے میں ان خیموں کے غیر ملکی کمین اُشان کرتے تھے، چھینٹے
اڑاتے تھے۔ ہم نے انہیں اس لیے بھی حسرت سے دیکھا کہ ان میں کچھ ایسی خواتین بھی تھیں جو
کچھ زیادہ حیا دار نہیں تھیں۔ طالبان کے فلسفے سے بالکل مخالف کنارے پر تھیں اور بے دریغ
تھیں۔ انہیں دیکھ کر کچھ ساتھیوں کے ایمان ڈولے کہ سر جی بہنیں ٹینٹ لگا لیتے ہیں لیکن فیصلہ یہی
ہوا کہ شائی چوڑا دھند نہیں، تھوڑی سی ہمت کریں تو وہاں تک پہنچ سکتے ہیں۔

اور کم از کم میں نہیں جانتا تھا کہ شائی چوہا بھی بہت ہی ڈور ہے۔۔۔
ہمیں اصولی طور پر وہیں اسی خیمہ گاہ میں رک جانا چاہیے تھا۔ لیکن ہم اپنی اس انا کے
اسیر ہو چکے تھے جو یہ کہتی تھی کہ اگر فلاں گا نیڈ ہک میں یہ درج ہے کہ ہسپاں سے شائی چونگ دو
منزلیں طے کی جاسکتی ہیں تو ہم بھی کریں گے۔۔۔ ورنہ یہ نئی خیمہ گاہ ہمارے لیے ایک اور منظر
ہوتی۔ ایک نیا تجربہ ہوتی۔ ان چٹانوں تلے جو رات ہوتی، وہ پتہ نہیں کہ کسی نادر کیفیت کی ہوتی۔
ہماری انا نے ہمیں ایک احقانہ فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا اور ہم آگے بڑھ گئے۔

یہاں تک تو ہم سب تقریباً اپنے حواس میں رہے۔۔۔ اور پھر شدید تھکاوٹ اور در ماندگی نے ہمیں
بد حواس کر دیا۔۔۔ ہم سب ایک عجیب دیوانگی اور بیگانگی میں الگ الگ ہو گئے، بھٹکنے لگے۔ کسی کو
کوئی خیال نہ رہا کہ کون کہاں ہے۔ کس حال میں ہے۔۔۔ زندہ بھی ہے یا مر گیا ہے۔۔۔ ہر ایک کا سفر
الگ تھا۔ تنہا اور دوسروں سے کن ہوا تھا۔ پھر میں اس نالے کے کناروں سے اُترا۔ جس کے
دوسرے کنارے پر میں تادیر بٹکا تھا جسے عبور کرنے سے جھجکتا اور جان کے ڈر سے ٹھٹکتا تھا۔ اسے
بھی میں نے ایک عجیب لافعلی اور بیزاری سے بے پروا ہو کر عبور کیا کہ مجھ میں تھکاوٹ ایسی تھی جو
کہتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا۔ میں اس میں ڈوب جاؤں گا۔ بہتا ہوا ہوشے پہنچ جاؤں گا تو
کیا ہوگا۔۔۔

گندہ گور وکا میدان شروع ہوا تو وہ ختم ہونے کو نہ آتا تھا۔
کبھی پتھروں کی دنیا میں لاچارگی اور بے بسی کی تھکن بدن کو مسمار کرنے لگتی اور کبھی
ریتلے علاقوں کی وسعت ایک صحرائے گوبی ہو جاتی جس کا کوئی انت دکھائی نہ دیتا۔

یہ پنجابی کے محاورے ”سنے خیراں“ کا ترجمہ تھا۔

آگے وہی کبری اُترائی والا راستہ تھا اور راستے کے بعد نالہ تھا اور نالے کے بعد
گندہ گور و کے برابر میں وہ چمکند ٹی تھی جس کے عین اوپر مٹی میں پھنسی سیکنڈوں چٹانیں ہم پر
جھانکتی تھیں کہ اس پر گریں یا اس پر گریں لیکن ہم کچھ زیادہ فکر مند نہ ہوئے کہ اگر مرنا ہوتا تو وہ
اُترائی اس کام کے لیے بے حد آئینڈیل تھی۔ یہاں سے بچ نکلیں گے۔

اس چمکند ٹی کے اختتام پر اوپر کنارے کی بالائی سطح پر پہنچنے کے لیے ایک وہی آسانی
چڑھائی جو آتے ہوئے پاتال اُترائی تھی۔ اور جب آپ بھٹکتے، بڑھکنے سے بال بال بچتے۔ سانس
سنجالتے۔ اپنے پورے بدن میں پسینے کے فوارے چھوٹنے محسوس کرتے۔ بے سکت ہانگوں کو
گھسیٹتے بالآخر اوپر پہنچتے ہیں۔ آپ کا سر بلند ہوتا ہے تو اس پر لگی ہوئی دو آنکھیں یکدم اپنے سامنے
ایک وسیع گھاس بھرا میدان دکھاتی ہیں اور جب آپ دونوں ہاتھوں سے پتھروں کو تھامتے اوپر اُٹھ
کر اس میدان کے کنارے پر دھڑام سے جا گرتے ہیں تو آپ کے کچھ سابق ساتھی وہاں پہنچ چکے
ہیں اور گھاس پر لیٹے پتھروں سے ٹیک لگائے استراحت فرما رہے ہیں اور استراحت فرماتے
ہوئے آپ کے دھڑام سے اونٹھے گرتے ہی دانت نکال کر کہتے ہیں ”ہاں جی۔ لیڈر صاحب۔۔۔
پہنچ گئے ہو۔“

اور آپ میں جواب دینے کے لیے ایک سانس بھی نہیں ہوتا۔ منہ کھلا ہوا ہے۔ ٹانگیں
لرزش میں ہیں جہاں گرے ہیں وہاں بس گرے ہیں اور اس حالت میں وہ مسخرے سوال کرتے
ہیں۔ پہنچ گئے ہو۔ اگر بولنے کی سکت ہوتی تو میں انہیں ایسی با معنی اور مردانہ گالیوں سے نوازتا کہ
سکھ حضرات بھی شرم سے سرخ ہو جاتے اور اگر ذرا سی ہمت باقی ہوتی تو گھسٹتا ہوا ان تک جاتا
اور ان کے ٹینٹوں سے دہا دیتا۔

لیکن یہاں کا قصور نہ تھا۔

رسم دنیا یہی تھی۔

میں بھی جب ایک پتھر سے ٹیک لگا کر سانس بحال کر چکا۔ اتنی طاقت آ گئی کہ گھاس پر
باتھ پھیر کر اس کی ہریا دل سے لطف اندوز ہونے لگا تو نیچے سے ہمارے ایک اور ساتھی کا سر نمودار
ہوا تو سب سے پہلے میں نے ہی دانت نکال کر پوچھا ”ہاں جی پہنچ گئے ہو۔“
اور اگر دوسرے مسلمان کا تھا تو اس نے صرف اتنا کہا ”ہائے اوئے“ اور ڈھیر ہو گیا۔

ہم نے حماقت کی تھی... ہمیں اسی خیمہ گاہ میں ٹھہر جانا چاہیے تھا... ہم وہاں اُس بڑی چٹان کے سائے میں اپنے خیموں کے سامنے میٹرس پر آرام کرتے چکن کارن سوپ پی رہے ہوتے... اور اس سے پیشتر ہم غیر ملکی گوری مخلوق کے ہمراہ ایک اشان کر چکے ہوتے... ہم نے حماقت کی تھی لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا..

اور شائی پو کہاں تھا؟..

اللہ جانے کہاں تھا..

کہیں تھا بھی یا نہیں..

لیکن پورٹو ہارڈس بندھاتے تھے کہ اس گندو گورو میدان کے پار.. دور افتح کے آس پاس جو سبزہ ہے، اس کے دامن میں وہیں کہیں ہے..

اور سورج بھی طوطا چشم ہوتا اپنی روشن آنکھ بند کر رہا تھا اور شام ہوتی تھی..

اس طویل.. اور انسانی برداشت سے باہر.. یعنی میری برداشت سے باہر کے سفر کا بیان طولانی ہے اور اس پر آسانی سے ایک الگ کتاب تحریر کی جاسکتی ہے لیکن یہ قصہ مختصر کر دوں تو بہتر ہے..

تو مختصر یہ کہ جب بالآخر گندو گورو کے گوبی صحرا کے پار ہم گلشیر کے اونچے کناروں کے آس پاس اور دامن میں جھاڑیوں اور درختوں کے اندر پہنچے تو شام رخصت ہو کر رات کی سیاہ چادر میں روپوش ہو رہی تھی... راستے کے پتھر معدوم ہوتے جاتے تھے.. جھاڑیاں شجر تارکی میں کھلتے جاتے تھے.. نظر کام کرنے سے انکار کرتی تھی.. پاؤں تو کب کے اٹھنے سے انکاری ہو چکے تھے لیکن جانے کیسے اٹھتے جاتے تھے..

ہمارے ساتھی آگے نکل چکے تھے..

صرف میں.. حسن اور شاہد پیچھے رہ گئے تھے..

ہم تینوں اندھے فقیر ہو چکے تھے... اپنی واکنگ سنکس دیکھتے.. کبھی اس پتھر سے ٹھوکر کھاتے.. کبھی اُس جھاڑی میں گرتے اپنے بدن زخمی کرتے.. راستہ ٹٹولتے اپنی قسمت کو کوستے ٹھپ.. ٹھپ.. چلتے جاتے تھے..

جب تاریکی بڑی ہو گئی.. نایمانی کی سلطنت وسیع ہو گئی.. سوائے اندھیروں کے اور کوئی ساتھی نہ رہا تو کہیں نیچے سے دو پورٹو پر چڑھتے آئے اور ان کے ہاتھوں میں ٹارچیں تھیں..

انہیں ہمارے ساتھیوں نے شائی پو پہنچ کر ہماری مدد کے لیے بھیجا تھا..

وہ ہماری رہنمائی کرنا چاہتے تھے.. ہمیں راستہ دکھانا چاہتے تھے لیکن ہمیں کچھ بھی دکھائی نہ دیتا تھا.. وہ بھی نظر نہ آتے تھے..

ایک ہاتھ میں اُن کی عطا کردہ ٹارچ اور دوسرے میں واکنگ سنک اور اندھیرے اور خوف کی غار میں اُترتے جانا.. ٹارچوں کی ناکافی روشنی میں.. راستے کا تعین کرتے کہ کہیں اس بلند کنارے سے نیچے گندو گورو گلشیر میں ہی نہ جا گریں.. کہیں راستے سے ہٹ کر کسی درخت کی ٹہنیوں میں الجھ کر اپنے آپ کو زخمی نہ کر لیں.. ہم لاچار، غریب الہ یا اُترتے رہے..

شائی پو ایسا مقام لعنت تھا جو آسانی نہ تھا..

بدن اور ہمت نے مجھے جواب دے دیا تھا..

کئی کوہ پیما کے نوا یا پورسٹ کی چوٹی تک پہنچنے کے لیے پوری زندگی منصوبہ بندی کرتے ہیں.. وہاں تک پہنچ جانے کی آس میں جیتے ہیں.. ان کے لیے وہاں تک پہنچ جانا خدا تک پہنچ جانے کے برابر ہوتا ہے اور پھر جب وہاں چوٹی سے دس بیس میٹر دور ہوتے ہیں تو یکدم ان کا بدن اور ہمت بھی جواب دے جاتے ہیں.. جانتے ہیں کہ دوبارہ یہ موقع نہیں آ سکے گا.. اس کے باوجود ان میں سکت نہیں ہوتی، ایک اور قدم اٹھانے کی..

مجھے یہ جواب دومرتبہ پہلے بھی ملا تھا..

مجھ پر یہ بیچارگی اور لاچارگی پہلی بار تب وارد ہوئی تھی جب ہم ورتوھ کی مرگ ندیاں پار کر کے ایک گھنے جنگل میں اُترے تھے اور پھر رات گئے خیمہ گاہ میں پہنچے تھے.. اور دوسری بار جب میں بُرجی لاء وڑے سے اُتر کر اپنی منزل شتو تک پہنچنے کی خواہش میں دن کے بعد رات کر بیٹھا تھا اور ہمارے آس پاس ریچھوں کے وہم اندھیروں میں سے نمودار ہوتے تھے اور بھوک بدن کو بے جان اور لاغر کرتی تھی اور یہ بھی یقین نہ تھا کہ ہمارا رُخ شتو تک کی جانب ہے یا ہم دیوسائی میں بسکتے پھرتے ہیں اور میں اپنی مدد کے لیے آنے والے پورٹو عباس سے کہنے والا تھا کہ تم مجھے اپنے کندھوں پر اٹھا لو جب شتو تک میں روشن ایک لائٹن دکھائی دی تھی..

کاش آج بھی میرے ہمراہ عباس ہوتا.. ہم نے سکر دو میں اس کا کھوج لگایا تھا لیکن وہ کسی اور مہم کے ساتھ جا چکا تھا..

ٹارچ کی روشنی میں بھی مجھے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا، میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا

تھی کیونکہ مجھے پورا یقین ہے کہ ایسا ہی ہوا ہوگا۔ تحسین اور بے بسی کی وہ کیفیت ایسی تھی جس میں درخت ہی آپ کو راستہ دکھاتے ہیں اور خبردار کرتے ہیں کہ بھاگ جاؤ ورنہ مر جاؤ گے۔ میں نے کے سکس اور کے بیون کی برفوں کی جانب ایک نگاہ بھی نہ کی کہ میری نگاہ میں تو صرف میرا خیمہ تھا جس کی جانب میں لڑکھڑاتا ہوا بڑھتا تھا۔ میں اپنے سلیپنگ بیک پر جہاں گرا۔ اگلی سویر تک وہیں گرا رہا۔

میرے برابر میں.. مجھے سہارا دینے کی کوشش میں ایک پورٹر نے ہاتھ آگے کیا.. ”صاحب! میں آپ کا ہاتھ پکڑتا ہوں۔“

”نہیں..“ میں نے اسے جھڑک دیا.. کیونکہ میں جانتا تھا کہ اگر اس نے مجھے ہاتھ لگایا.. یا کسی درخت کی ٹہنی نے بھی میرے بدن کو چھو لیا تو میں سہارا ہو جاؤں گا.. ایک مرتبہ گر گیا تو اُنھ نہ پاؤں گا..

ایک اور قصہ مختصر..

ہم نیچے شانی چوٹیوں پہنچ گئے..

تارچ کی روشنی میں راستے میں پڑتی ندیوں کے پانی چمکتے تھے اور میں کبھی انہیں پہلاٹک کر پار جاتا تھا اور کبھی نقابت کے عالم میں اپنے بوٹ بھگوتا ان میں چلتا ہوا دوسری جانب پہنچتا تھا.. ایک بے جان پتے کی مانند چلتا جاتا تھا..

ہمارے خیمے اندھیرے میں کہیں تھے... وہیں تھے جہاں ہم نے آج سے کچھ ماؤں پہلے لگائے تھے.. یا چند ہفتے پہلے لگائے تھے.. پتہ نہیں کب لگائے تھے لیکن وہی مقام تھا.. ہم تینوں کی آمد پر کسی نے تالیاں نہیں بھائیں، ہمارا استقبال کرتے ہوئے شاہاش نہیں دی کیونکہ جو ہم سے پہلے پہنچ گئے تھے، ان میں بھی زندگی کی رتی کم تھی.. برمانی خیمے کے باہر اپنی میٹرس پر تقریباً مردہ پڑا تھا اور لاکھ جھوڑے پر بھی بیدار نہ ہوتا تھا..

اس نے اگلی سویر بتایا کہ تارڑ سائیں مجھے بھی راستے میں شام ہو گئی اور میں اکیلا تھا.. تھکاوٹ اور بدن کی لاچارگی اتنی تھی کہ میں ٹھوکریں کھاتا گرتا تھا اور سنبھل جاتا تھا.. تب میں نے ایک بار اپنے آپ کو گرنے سے بچانے کے لیے ایک درخت کے تنے کا سہارا لیا، اسے دونوں بازوؤں میں تھام کر اس پر سر رکھا تو مجھے درخت کے تنے میں سے ایک صدا آئی.. بھاگ جاؤ.. یہاں سے بھاگ جاؤ ورنہ مر جاؤ گے.. مر جاؤ گے.. تو سائیں میں وہاں سے جو اندھاؤں ہند بھاگا ہوں.. کچھ یاد نہیں کہ کس سمت میں کس راستے پر بھاگا ہوں.. میں آسانی سے گیشیر میں بھی اتر کر گرم ہو سکتا تھا لیکن کسی ٹھہری ہاتھ نے میری مدد کی.. مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ میں ندیاں پہلاٹک رہا ہوں.. اور آخر میں کوئی مقام ہے جہاں ایک لائٹن روشن ہے..

مجھے اس سے پوچھنے کی ضرورت نہ تھی کہ کیا واقعی درخت کے تنے میں سے آواز آئی

مڑ کے پودے تلاش کرتے تھے اور ان کی پھلیاں توڑ کر انہیں ناخنوں سے اڑس کر انہیں کھول کر ان میں سے ہرے بھرے دانے نکال کر اپنے منہ میں رکھتے تھے اور اس تازہ سبز دانے کے انوکھے مزے لیتے تھے۔

بچوں میں نا فیاں تقسیم کرتے جب ہم اوپر ہوشے کے پہلے گھر تک گئے اور پھر گاؤں میں داخل ہوئے تو یہاں بھی ہمیں دیکھ کر کسی نے تالیاں نہ بجا کیں۔ ہمیں خوش آمدید نہ کہا۔ کہ اہل ہوشے کے لیے یہ ایک روزانہ کا معمول تھا کہ اوپر دروازہ گندو گورو سے ایسے پریشان حال کوہ نور د اترتے ہی رہتے ہیں۔

سلمان نے سستانے کی بجائے فوری طور پر کاندے جانے والی کسی جیپ کا بندوبست کیا اور یہ وہی حوالدار کی جیپ تھی۔ پھر وہ سامان جو ٹریک سے نکلنے سے پیشتر یہاں سے کرائے پر حاصل کیا گیا تھا۔ کچن ترپال، کچھ دھتے۔ اُسے واپس کیا گیا اور پھر اشرف کی خیمہ گاہ میں پورٹروں کا حساب کتاب کیا گیا۔ حسین، اسحاق اور علی موسیٰ جو ہمارے خیر خواہ نکلے تھے، انہیں ان کی مہربانی کے عوض میں اُن کی اجرت میں کچھ اضافہ کیا گیا۔ کچھ خوراک تقسیم کی گئی۔

اور پھر روانگی سے پیشتر ایک پیالی چائے کے لیے۔ جو نہایت دھواں دار تھی، ہم اشرف کی خیمہ گاہ کے ڈائننگ روم میں چلے گئے۔

اور یہاں پر یوسف سے ملاقات ہو گئی۔

جی ہاں ”سنو لیک“ کے مقدوش۔ جرمی۔ گائیڈ۔ یوسف اوئے یوسف سے۔ جو نہ گائیڈ تھا اور نہ لنگ تھا۔ بس یوسف اوئے یوسف تھا۔

انسانی خصلت میں شامل ہے کہ بے شک ایک اور انسان اُسے تقریباً مار ڈالنے کا باعث بنا ہو لیکن وہ اس کو دوبارہ ملنا چاہتا ہے۔ چنانچہ ہم نے بھی ایک بار سکر دو میں اس کا کھوج لگانے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ وہ دو برطانوی کوہ پیماؤں کو جھانسا دے کر سنو لیک پر لے گیا تھا جہاں ایک کوہ پیما ایک ڈرائیو میں گر کر ہلاک ہو گیا تھا اور اُس کی لاش کو سنو لیک پر چھوڑ کر یوسف سکر دو واپس آ گیا تھا۔ اور ان دنوں وہی کوہ پیما یوسف کے خوابوں میں آتا تھا اور کہتا تھا۔ جو زف تم نے مردہ دیا۔ چنانچہ جو زف یعنی یوسف کو خوف کے مارے بخار ہو گیا تھا اور وہ بستر میں پڑا تھا۔

ہوشے میں معلوم ہوا کہ یوسف دراصل سکر دو کے ہسپتال میں چوکیدار ہے اور وہاں کے ایک ڈاکٹر صاحب نے لاہور سے آنے والے تین نوجوانوں کو اس کے ہمراہ کر دیا تھا تاکہ وہ

”وادی ہوشے پر بچھا گندم کی بالیوں کا تخت“

ہم ہوشے کے قریب ہوئے تو سامنے ایک عجیب نگارہ تھا ہوشے کے باغ میں۔ شائی چو سے ہم صبح سویرے نہیں بھری دوپہر میں چلے۔ کہ ہمارے مردہ بدن سویر تک اس قابل نہ ہوئے کہ انہیں ہلایا بھلایا جاسکے۔ جب ذرا دھوپ پھیلی تو ان میں بھی زندگی کی کچھ حرارت پیدا ہوئی۔

اور جب ہم دو بجے کے قریب ہوشے کے سامنے پہنچے تو وہاں ایک عجیب نگارہ تھا۔ جو ہم نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔

ہم سے دور کھیتوں کے پار ایک بلند سطح پر ہوشے کے گھر دکھائی دیتے تھے اور یہ جو کھیت درمیان میں تھے، یہ سراسر سنہری ہو رہے تھے اور پھر تہہ در تہہ بلند ہوتے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ چٹانوں کی قربت میں پہنچ کر رک جاتے تھے۔ البتہ وہاں تک پہنچ کر وہ سنہری سے ہرے ہو جاتے تھے کیونکہ وہاں ابھی تک گندم کٹی تھی۔

بلندیوں پر جیسے شایہ مار کا ایک تخت بچھا ہوا تھا۔ تختہ بہ تختہ یہ کھیت بلند ہوتے جاتے تھے اور گندم کی بالیوں کے سنہری پن میں رہتے جاتے تھے۔

کسی بھی منزل سے واپسی پر راستے تو یقیناً وہی ہوتے ہیں لیکن منظر سراسر بدل جاتے ہیں۔

پہلے آپ اُن سے نکل رہے ہوتے ہیں اور وہ آپ کی پشت پر ہوتے ہیں اور واپسی پر وہ آپ کے سامنے ہوتے ہیں اور آپ ان میں داخل ہو رہے ہوتے ہیں۔

ہم بھی اپنے راستے سے اتر کر کھیتوں میں چلے جاتے تھے اور گندم کی بالیوں سے اپنے

میں آدھا کرویتا تھا..

ان نوخیز کوہ نوروں نے بتایا کہ مشاہیرم کا میں کیسپ کچھ اتنا دل پذیر نہ تھا اور راستے میں جو دو چار سخت مقام آئے وہاں پر یوسف انہیں ڈھارس دیتا تھا کہ ہم تو تارڑ صاحب کا ٹیم کو دنیا کے طویل ترین برغانی راستے کے پار لے گیا تھا، یہ تو بچہ لوگ کا کھیل ہے.. بہر حال یوسف جیسا بھی تھا، ایک ہدم دیریں تھا اور مجھے اور سلمان کو جو سنولیک کے ویٹرن تھے، اُسے ہوشے میں دیکھ کر پرانی رفاقت کا ایک خوشگوار احساس ہوا تھا..

اسی سموکی ڈاننگ روم میں ایک سخت اور مشقتی چہرے والا بارٹش پورٹر عجیب نظروں سے مجھے دیکھے چلا جا رہا تھا.. پھر وہ اپنی نشست سے اٹھا اور کہنے لگا۔ ”صاحب آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔“

”نہیں۔“

جیسے ایک عام فوجی کی شکل ایک ہی سانچے میں ڈھلی عام سی ہوتی ہے، اسی طور پر پورٹر بھی کوئی خاص انفرادیت نہیں رکھتے.. وقت سے پہلے بوڑھے ہوتے ہوئے مشقت کی جھریوں سے بھرے چہرے.. دو چار دانت گرے ہوئے.. کندھے جھکے ہوئے اور آنکھوں میں غربت کی دھندلاہٹ..

”جب آپ ادھر ہوشے میں پہنچے تو اوپر جانے کے لیے.. تو میں نے تب بھی آپ کو پہچان کر سلام کیا تھا.. میرا نام یگی ہے سر۔“

”یگی؟“

”جی صاحب۔ آپ.. دس برس پہلے کی بات ہے آپ اس سیزن میں کنکور ڈیا گئے تھے.. جب بہت کم پاکستانی ادھر کو جاتا تھا.. آپ کا کلک غلام محمد تھا.. جسے ڈاربا ہو گیا تھا.. اور آپ کو آری کا ہیملی کا پڑاٹھانے آیا تھا اور آپ ہمیں چھوڑ کر اس میں چلا گیا تھا..“

”بالکل صحیح۔“

”تو میں آپ کا پورٹر تھا سر.. آپ کے ساتھ گیا تھا۔“

اس کا چہرہ شناسا لگنے لگا.. لیکن اس چہرے پر دس برس کی مشقت اور مزدوری کا بوجھ تھا.. تنگدستی کی جھریاں اور روزی کے حصول کی دہدہری کی دھول تھی.. وہ محض اس لیے شناسا لگنے لگا کہ اس نے خود بتایا تھا کہ وہ کنکور ڈیا مہم میں میرے ساتھ گیا تھا ورنہ میں اب بھی اسے پہچان

انہیں مشاہیرم میں کیسپ تک لے جائے..

یوسف اور وہ تین مبتدی کوہ نور مشاہیرم کے میں کیسپ سے واپس آ کر اب اشرف کے سموکی ڈاننگ روم میں آنکھیں جھپکتے تھے اور سب کے سب بارٹش تھے اور یہیں پر ان سے ملاقات ہو گئی..

سب سے پہلے تو میں نے ان تین جوانوں کو مبارکباد دی کہ وہ یوسف کی رہنمائی کے باوجود زندہ سلامت لوٹ آئے ہیں اور پھر یوسف سے چہلمیں شروع ہو گئیں..

”یوسف..“ سلمان نے سنولیک سٹائل میں ڈرائنگ کر کہا۔ ”اوئے یوسف..“

”جی صاحب..“ وہ ہمیں دیکھ کر اگرچہ خوش بھی ہوا تھا لیکن کچھ شرمندہ سا بھی نظر آتا تھا..

”یوسف تم تو چال بھی نہیں اُبال سکتے تھے اور پھر بھی ٹنگ تھے اور نملا سے آگے بھی نہیں گئے تھے اور پھر بھی گائیڈ تھے.. تو کیا اب بیا فوسپر کر اس کیا ہے ہمارے بعد؟“

”بیا فوسپر تو میں نے چھ سات بار کر اس کیا ہے صاحب۔“ یوسف اپنی اناڑی ٹیم کے سامنے اپنی عزت نفس کا دفاع کرنا چاہتا تھا.. ”بہت مرتبہ گیا ہے۔“

سلمان.. یوسف کے پول کھولنے پر بخلا ہوا تھا.. ”اور جب گیا ہے تو کتنے کوہ نوروں کو دراڑوں میں دھکیلا ہے یوسف.. یاد ہے تم تارڑ صاحب کو ایک بلندی پر سہارا دے کر لے جا رہے تھے اور پھسل گئے تھے اور تم نے جواباً تارڑ صاحب کو چٹھا مار لیا تھا اور ان کو بھی لے ڈوبنے لگے تھے۔“

”نہیں صاحب..“ وہ بغلیں جھانکنے لگا..

”جھوٹ مت بولو یوسف..“ سلمان نکلنے لگا..

”نہیں نہیں.. وہ تو مگرنا تھا تو صاحب کو پکڑ لیا تھا..“

”اور یوسف تم نے دوسرا شادی بنایا؟“

یوسف نے رب کا شکر کیا کہ موضوع بدلا ہے۔ ”ہاں صاحب.. بنالیا ہے۔“

سنولیک کے دوران یوسف دوسری شادی کے لیے پر تول رہا تھا لیکن عباس کی موجودگی میں یہ قول مول خفیہ رکھتا تھا کیونکہ وہ اس کا سر تھا..

اس کی داڑھی کے بہت سے بال سفید ہو چکے تھے لیکن وہ اب بھی سگریٹ کو ایک کش

نہیں پار ہاتھا۔

اسی طور سٹولیک کے سفر کے دوران اشکو لے سے چلتے ہوئے وحید پور ٹر بھی میرے سامنے آ گیا تھا۔ اسے میں نے پہچان لیا تھا کہ وہ کے نوکبانی کے دوران مسلسل میرے ساتھ رہا تھا اور مددگار رہا تھا۔

شمال بہت بڑا ہے اور بہت مختصر بھی۔ اتنا مختصر کہ گئے برسوں کے چہرے کہیں نہ کہیں سامنے آ جاتے ہیں اور کہتے ہیں۔ ”صاحب آپ نے مجھے پہچانا؟“

اشرف کی کیمپنگ سائٹ کے پچانک کے باہر ہوشے کی گلی میں حوالدار کی جیب پر ہمارے ٹک سیک اور دیگر سامان لوڈ ہو رہا تھا۔

میں اصولی طور پر تو آج کی شب یہیں ہوشے میں قیام کرنا چاہیے تھا۔ لیکن ٹیم کے ہر فرد کو اب کوئی نہ کوئی انتہائی ایمر جنسی والا کام یاد آ رہا تھا جو اس نے فوری طور پر لاہور چھوڑنے ہی سرانجام دینا تھا۔ ایسے انتہائی اہم کام ہمیشہ کوہ نور دی سے واپسی کے آخری دن ہی یاد آتے ہیں۔ سلمان نے ہسپاں میں کہا تھا کہ اس کا بھائی امریکہ جا رہا ہے اور اسے لاہور ایئر پورٹ پر خدا حافظ کہنا ہے۔ ضروری تھا وہ نہ بھائیوں میں دراڑ پڑ سکتی تھی۔ میاں صاحب اپنی بیگم کی صحت کے بارے میں فکر مند تھے۔ حسن صاحب اپنی بیگم کے لیے فکر مند نہیں بلکہ اداس ہو گئے تھے اور وہ خوبانی چہرے والی چلو کی خاتون کو بیکس بھول گئے تھے۔ برمانی کو پہلی بار احساس ہوا کہ وہ ڈاکٹر بھی ہے اور چوٹی زیریں کے علی کینک میں داخل چند مریض جانے کس حال میں ہیں۔ عامر کو بھی کوئی بزنس میٹنگ یاد آ گئی تھی۔ شاہد صاحب کو بھی یقیناً کچھ یاد آ رہا تھا لیکن وہ اقرار نہ کرتے تھے۔

اور مجھے۔۔۔ مجھے گھریا یاد آ رہا تھا۔ پورے کا پورا۔۔۔ یہاں تک کہ فورے کے کافی زدہ پانیوں میں بڑے گھنٹروں والا وہ بوڑھا مینڈک بھی یاد آ رہا تھا جو ساری رات ٹر اٹھا کر کے میری نیند برباد کرتا تھا۔ اپنے بچوں کے دکتے روشن چہرے یاد آ رہے تھے جو پہاڑوں کی پتھراں سے واپسی پر مجھے دیکھ کر مزید دکتے تھے، مزید روشن اور سوہنے ہوتے تھے۔ وہ اگرچہ اب اتنے بچے بھی نہ تھے اور مجھ سے قد میں نکلتے تھے لیکن اس کے باوجود مجھے دیکھ کر وہ بندر ہو جاتے تھے۔ میرے گرد اچھلتے کودتے نعرے لگاتے تھے کہ آؤ آؤ گئے۔ آؤ آؤ گئے۔ اور تو اور میری واپسی پر میوند کے چہرے پر بھی زندگی میں ایک بار نمودار ہونے والی مسکراہٹ کھیلے لگتی تھی۔

چنانچہ ہم ہوشے میں ٹھہرنا نہیں چاہتے تھے۔ یہاں سے نکل جانا چاہتے تھے اور کسی نہ

کسی طور آج شب چلاؤ پہنچ جانا چاہتے تھے۔

بڑے ذیل ڈول کے مالک حوالدار کی پرانی جیب واصلی دوپہر میں ہوشے کی گلیوں میں سے نکل کر یکدم اترائی پر ہمیں بے قابو ہوتے ہوئے محسوس ہوئی لیکن حوالدار نفل کنٹرول میں تھا کیونکہ وہ صرف آج بارہ سو پچیس کے حساب سے کاندے سے ہوشے اور ہوشے سے واپس کاندے کے گیارہ چکر لگا چکا تھا۔ یہ اس کا بار صواں پھیرا تھا۔ اس راتے کو وہ اپنی قبیلہ کی کلبیروں کی طرح جانتا تھا اور آنکھیں بند کر کے بھی اس پر جیب چلا سکتا تھا۔ اور دراصل وہ آنکھیں بند کر کے ہی اس راتے پر جیب چلاتا تھا۔ کیونکہ وہ روڈ کی جانب کم ہی نگاہ کرتا تھا۔ مجھ سے ایک خاص لائقیتی سے باتیں کرتا جاتا تھا۔ اس پاس کی لینڈ سکیپ کو دیکھتے ہوئے خود سے باتیں کرتا جاتا تھا اور سنیئرنگ گھماتا جاتا تھا۔ اتنے وسیع تجربے کے بعد اس کی آنکھیں دراصل سنیئرنگ میں منتقل ہو چکی تھیں۔

اترائی کے خاتمے پر وہی پل آیا جہاں سے ہوشے کا علاقہ ختم ہوتا تھا اور کاندے والوں کی زمین شروع ہو جاتی تھی۔

کاندے تک تو پہنچنے کا بندوبست ہو گیا تھا تو اب وہاں سے آگے چلو تک کسی جیب کے ملنے یا نہ ملنے کی تشویش شروع ہو گئی۔

”صاحب آپ چکر لگا آ یا؟“ حوالدار نے اسی لائقیتی سے پوچھا۔

”ہاں۔۔۔“

”کدھر تک گیا؟“

”دو گندو گورو کے میں کیمپ تک۔“

”اچھا۔ اس کا منہ کھل گیا۔“ پیدل گیا ہے؟“

”تو اور کیا حوالدار صاحب۔ ادھر جیب تو نہیں جاتا۔“

”بہت بہت کیا ہے صاحب اس عمر میں۔“

”آپ تو ادھر گیا ہوگا؟“

”نہیں سر۔ اسی تے ہوشے دے آئے کدی نہیں گئے سوہنیو۔“

”ہیں؟“ میں اس کی ٹھیکہ بھانپتی سن کر ٹھک گیا۔ پھر یاد آ یا کہ ادھر آتے ہوئے اس نے

بتایا تھا کہ اس کی ملازمت کا ایک بڑا حصہ پنجاب میں گزرا ہے۔ کیوں نہیں گئے حوالدار جی۔

”ساڈھا کوئی دماغ خراب اے..“ وہ ہنسنے لگا..

”نہ تے ساڈھا دماغ خراب اے حوالدار جی؟“

”آہو..“ اس نے سر ہلایا اور تہقید مار کر ہنسنے لگا.. ”پنجاب چھوڑ کر ادھر آتے ہو تو دماغ

خراب ہے ناں سوہنیو..“

روڈ ہموار ہو گئی..

ہائیں جانب ہم سے دور ہونے والے کے پار جو چٹانیں تھیں، وہ ڈھلتی دھوپ میں رنگ بدلتی تھیں.. ان کے اندر عجیب سرمئی سی وادیاں نظر آتیں جن پر سفید پانیوں کی خاموش آبشاریں اتر رہی تھیں..

کچھ اور فاصلہ طے ہوا..

ہم نے بدن کو اپنی ہمت سے بہت پرے تک دھکیلا تھا.. کل صبح سے رات تک ایک دن میں دو منزلیں طے کی تھیں اور آج بھی مارو مار کرتے چلے جا رہے تھے.. مجھے جیپ کے آس پاس جو منظر گزرتے جاتے تھے، ان میں کوئی دلچسپی نہ تھی اور میں نے جو کچھ دیکھنا تھا.. دیکھ لیا تھا.. یہ میرا خیال تھا کہ میں نے جو کچھ دیکھنا تھا.. دیکھ لیا ہے.. ابھی چند لمحوں میں اس منظر نے نمودار ہونا تھا جو اب تک دیکھے گئے تمام مناظروں پر بھاری ہونے والا تھا.. چند لمحوں میں..

ہائیں ہاتھ پر کاندے کے سیلاب زدہ گھرانوں کی وہ نئی پتھریلی ہستی نظر آنے لگی جو انہوں نے اس بے آب و گیاہ ویرانے میں آ بسائی تھی.. اور پھر جیپ کی کھڑکی میں سے ہستی کے آخر میں ایک بلند تانبے رنگ کی چٹان بلند ہونے لگی..

”چٹان پر ایک لڑکی... اب وہاں نہیں تھی“

چٹان پر ایک لڑکی..

چٹان بلند ہوتی جا رہی ہے اور جب چوٹی پر پہنچتی ہے تو وہاں ایک لڑکی..

چٹان کی چوٹی پر ایک لڑکی.. براجمان!

اور چٹان.. جیسے جیسے جیپ حرکت کرتی تھی ویسے وہ بھی حرکت کرتی جاتی تھی اور اس پر براجمان لڑکی بھی حرکت کرتی جاتی تھی.. جیسے میں ایک تیز رفتار ہیلی کاپٹر میں بیٹھا اس کے قریب سے گزر رہا ہوں..

چٹان پر اطمینان سے بیٹھی لڑکی سرخ لباس میں تھی..

وہ ایک جل پری کی مانند چوٹی پر ٹانگیں سینے بیٹھی تھی..

کاندے کی ”الٹل مرید“ اپنی چٹان پر شامد پیاسی بیٹھی تھی کہ اس نئی ہستی میں پانی نہ تھا اور وہ دور بہتے دریائے شیوک کے پانیوں کو مسرت سے تک رہی تھی اور صرف انہیں دیکھنے کے لیے اتنی بلندی پر.. اپنی جان جو کھوں میں ڈال کر.. آ بیٹھی تھی..

یاشاندہ.. وہ کسی کی منتھرتھی!

اُس کا چہرہ اگر میری جانب ہوتا تو میں اس پر نکھی عبارت پڑھ لیتا اور جان جاتا کہ وہ کس کی منتظر ہے اور کتنے برسوں سے منتظر ہے کہ ہر چہرے پر اپنے عشق خاص کے انتظار کی تحریریں ہوتی ہیں.. وہ پڑھی جاسکتی ہیں اور اگر انتظار طویل ہو جائے تو یہ تحریریں ٹھہریوں میں بدل جاتی ہیں..

چٹان پر بیٹھی لڑکی ایک ہیلی کاپٹر سے فلم بند کئے جانے والے منظر کی مانند تیزی سے

گزر رہی تھی۔ اور اس کے پس منظر میں جو نیلا آسمان تھا وہ بھی اتنی ہی تیزی سے جیب کی کھڑکی کے فریم میں سے گزرتا جاتا تھا۔

یہ وہی سکہ تھا جو زمانے اور منظر کی نکسال میں ڈھل گیا تھا اور اس پر اس چٹائی جل پری کی شبیہ۔ کسی سکندر.. اشوک یا مند ر کی مانند ثبت ہو چکی تھی اور اس سکہ نے جب ہزاروں برس بعد کسی کھنڈر میں سے برآمد ہونا تھا تب بھی کھرا رہنا تھا کہ وصتی شام کے سونے میں ڈھلنے والا ایسا سکہ کبھی رنگ آلود نہیں ہوتا۔ ہاں اس نادر سکہ کو ڈھلتے دیکھنے والی میری بھوری آنکھیں خاک اندر خاک ہو جاتی تھیں۔ لیکن اسی خاک میں سے تو یہ سکہ دستیاب ہونا تھا ہزاروں برس بعد! وہ چٹان.. اس پر براہمان سرخ پیراہن والی وہ لڑکی لمحوں میں گزر گئی لیکن اس کی شبیہ وہیں موجود رہی.. کھڑکی کے فریم میں جڑی رہی..

یہ کیسی عجیب بات ہے کہ وہ نور دی کی اس برس کی بائبل میں اگر چہ شائی چو.. دل سنگ پا.. ہسپاں اور لیلے پیک ایسے مقدس مقام آتے ہیں لیکن جب یاد کی نکسال میں کوئی ایک سکہ ڈھلتا ہے تو اس پر چٹان پر براہمان ایک سرخ پیراہن والی جل پری کی شبیہ ابھرتی ہے..

چٹان کی چوٹی پر کوئی نہ تھا؟

چٹان خالی پڑی تھی اور جیب کی کھڑکی میں سے گزر گئی تھی..

تو میں نے اسے کب دیکھا تھا؟

ہوشے کی جانب جاتے ہوئے یا اپنی کوہ نور دی سے لوٹتے ہوئے؟

دیکھا بھی تھا یا نہیں؟

بس یہی عجیب بات تھی..

اور یہ بھی تو کیسی عجیب بات ہے کہ ہم ہوشے سے کاندے پہنچے ہیں.. کاندے کے نالے پر رکھے ان شہتروں پر سے بے خطر پار جاتے ہیں جن پر ہماری ٹانگیں اور حواس جواب دیتے تھے اور اس کے پار ہمیں فوراً ایک نئی نویلی آرام دہ جیب مل جاتی ہے جو ہمیں رات اترنے سے پہلے چلو لے جاتی ہے.. اور ہم ایک مرتبہ پھر اس کے شاندار شایمار طرز کے موٹوں میں موج کرتے ہیں.. ابھی سے شائی چو اور ہسپاں کے لیے اداس ہو کر ان کا تذکرہ کرتے ہیں.. اس شایمار میں ہم شاہ جہاں ہو جاتے ہیں.. لیکن کسی ممتاز محل کے بغیر.. لیکن ہمیں اس کی خواہش نہیں تھی کیونکہ ہمارے پاس لیلے پیک تھی جو خود ایک برفانی تاج محل تھی..

اگلی سویر ہم سکرو و پینچے ہیں..

پھر شام تک ٹگٹ میں ہوتے ہیں..

پھر بشام، ماںسہرہ، ایتھ آباد، حسن ابدال، راولپنڈی.. اور موٹروے پر.. کھر کھار..

بھیرو.. یعنی وہی ایکشن ری پلے چلتا جاتا ہے..

اور آخر کار ہم موٹروے کو چھوڑ کر کالاشاہ کا کوئیں اتر کر جی ٹی روڈ پر آ جاتے ہیں..

اور لاہور میں داخل ہو جاتے ہیں..

زیر تربیت بیورو کریم ہے۔ اس کی پوسٹنگ جانے کہاں ہوتی ہے۔ میں ابھی تک اس خیال سے غافل رہا تھا۔

اور اب.. موٹروے سے اتر کر کالاشاد کا کوئٹہ میں داخل ہوتے ہوئے ٹریفک کی بے پناہ بھیڑ میں داخل ہوتے ہوئے مجھے پہلی بار یہ خیال آیا کہ پرندے تو گھونسل چھوڑ چکے ہیں.. ایک شدید پریشر نے مجھے شکار کر لیا.. میں اب ونگن میں تھا تھا..

حکیم بے چین تھا کہ کب یہ صاحب بھی اترے اور میں اپنے گھر جاؤں..

فردوس مارکیٹ.. گلبرگ نمبر تین.. پائیس ہے..

وینگن میرے گھر کے سامنے رُک گئی.. میں نے اپنا سامان.. رُک سیک.. اتارا.. مونگلیائی رنگ کا آئینی گیٹ بند تھا جسے میں نے دھکیلا تو اندر خاموشی تھی.. کوئی بھی نہیں تھا..

ہاں پورچ کے اوپر دو ٹیل تھی جو ان موسموں میں پورچ کے اوپر بندھی رستیاں پر پھیلتی انہیں اپنی گرفت میں لیتی، دن رات پتے نکالتی بڑھتی جاتی تھی.. اور ہمیشہ سے ایسا ہوتا چلا آیا تھا کہ جب میں کوہ نور دی کے لیے گھر سے نکلتا تھا تو اس ٹیل کے گھنے اور سرسبز ہونے کے دن ہوتے تھے.. ہر بارش کے بعد یہ راتوں رات دو گنی گھنی ہو جاتی تھی اور پورچ کے فرش پر دھوپ کم سے کم ہوتی سائے میں بدل جاتی تھی.. اور پھر ہمیشہ یہ بھی ایسا ہوتا تھا کہ میں گھر لوٹتا تھا تو جس ٹیل کو میں سبزیتوں میں رستیاں میں لپٹا چھوڑ کر گیا تھا، اب اس میں سے تیز گلابی رنگ کے پھولوں کی لڑیاں نکلتی تھیں.. پھولوں کی لڑیاں جن کا پتوں میں سے نکلنے کا انداز چینی لالٹینوں کی طرح تھا.. املتانس کے پھولوں کی مانند تھا.. صرف یہ کہ وہ زرد لالٹینیں تھیں اور یہ آتش گلابی.. ہمیشہ!

ان لڑیوں میں سے گرتے چھوٹے چھوٹے گلابی شگوفے پورچ کے سرخ فرش پر پڑے ہوئے تھے.. کاری چھت پر گرے ہوئے تھے..

نیمبر بھی موجود نہ تھا.. اسے علم نہ تھا کہ میں شیڈ یول سے ایک روز پہلے پہنچ جاؤں گا اور وہ سول سروس اکیڈمی کے چند دستوں کے ہمراہ کسی چٹک پر جا چکا تھا تو اندر خاموشی تھی.. پھولوں سے دھکی تیل تھی.. گلابی لڑیاں نکلتی تھیں اور شگوفے گرتے تھے نتیجے کے دانوں کی طرح.. اور ان کی آواز نہیں تھی گرنے کی اس لیے اندر خاموشی تھی..

چٹک شگوفے.. چھوٹے چھوٹے مٹن سائز کے.. پورچ کے فرش پر گرتے تھے..

”میں کیا جانوں میں کون ہوں.. دروازہ کھولو“

اور تب ایک عجیب سی وحشت مجھے گرفت میں لے لیتی ہے..

میں نے آج تک.. پچھلے تیس برسوں میں شمال کے جتنے بھی سفر کئے تھے.. اپنی سالانہ کوہ نور دی سے جب بھی گھر لوٹا تھا.. تو گھر میں.. ہمیشہ میرے تینوں بچے میرے منتظر ہوتے تھے.. میں پتھروں اور برتنوں کا مارا ہوا مرمجھا ہوا ان کے چہرے دیکھ کر کھل جاتا تھا.. میرے تن بدن میں موسم کے اور بغیر موسم کے جتنے بھی پھول شمار ہو سکتے ہیں، وہ سب کے سب انہیں دیکھ کر کھل جاتے تھے.. کہیں ہار سنگھار مہک دیتا تھا.. کہیں نرمس اور فریز یا.. کہیں پٹو نیا.. زمینیا اور کہیں نیکر کے زرد پھول.. سب کے سب یکبار کھل جاتے تھے..

لیکن جی ٹی روڈ پر اترتے ہی.. ٹریفک کی بھیڑ میں جب ہماری وینگن داخل ہوئی تو مجھے پہلی بار یہ احساس ہوا.. یہ احساس ایک دھماکے کی طرح پھٹا کہ اس برس تو وہاں نہیں ہیں..

سلجوق نہیں ہے.. فارن سروس میں ہے.. پاکستان کونسلیت جدہ میں وہ اس کونسل کے عہدے پر اپنے سفارتی فرائض سرانجام دے رہا ہے.. یعنی.. قرۃ العین نہیں ہے.. رنگ ایڈورڈز کالج سے متعدد گولڈ میڈل حاصل کرتی، اب باقاعدہ ڈاکٹر ہو چکی ہے.. شادی شدہ ہو چکی ہے اور پاکستان میں نہیں ہے.. فلوریڈا کے شہر آرلینڈو میں اپنے بھال کے ساتھ خوش و خرم ہے..

یہ پرندے تو اڑ چکے ہیں..

گھونسل تقریباً ویران ہو چکا ہے..

وہ دن گئے جب وہ اپنی چوتھیں کھولے میرا انتظار کرتے تھے..

صرف نیمبر ہے اور وہ بھی اُڑنے کی تیاری کر رہا ہے.. سول سروس اکیڈمی میں ایک

ان میں سے کوئی ایک شگوفہ ہوشے کی گلیوں کا تھا..
 کسی پرشائی چوک شرب رقص کرتی تھی..
 کہیں دل سنگ پا کی برفیں اتنی سفید ہوتی تھیں کہ شگوفے کی گلابی رنگت بھی ہلکی ہوتی
 تھی.. کسی پر ہسپاں کی پندرہ ہزار فٹ بلندی سانس لیتی تھی..
 ہر شگوفے پر کوئی ایک مقام نقش تھا..

لیکن ایک ایسا مقام تھا جسے کوئی ایک شگوفہ سنبھال نہ سکتا تھا.. جابجا ایسے شگوفے
 بکھرے تھے جو اپنی رنگت کھو چکے تھے اور ان پر لیلے پیک کی سفیدی راج کرتی تھی..
 لعل میر میڈ کا سرخ لباس ایک شگوفے پر بکھرا اُس کے رنگ سے مچھ کر رہا تھا..
 ان سب میں گارڈن لائٹ کے قدموں میں پڑا البتہ ایک شگوفہ ایسا تھا جس پر کوئی
 مقام تصویر نہ ہوتا تھا.. صرف ایک سوالیہ نشان تھا جو سرگوشی کرتا تھا.. اگلے برس تم کہاں جاؤ گے؟..
 کہاں جاؤ گے؟..

اگلے برس؟... کل کس نے دیکھا ہے.. ہاں اگر زندگی رہی، ہمت رہی تو کہیں نہ کہیں تو
 جاؤں گا.. شائد ہر اموش کی وادی میں.. شائد بتورہ گلشیئر کے پار.. شائد ایک مرتبہ پھر رتی گلی کی
 جھیلوں کو تلاش کرنے کے لیے.. اگر زندگی رہی اور ہمت رہی... اور اگر میرا رانجھا مجھ سے راضی
 رہا تو.. جاؤں گا!

میں نے اپنی بڑھی ہوئی داڑھی کو انگلیوں کی پوروں سے محسوس کیا.. بوٹوں کو ایک نظر
 دیکھا کہ ابھی انہوں نے ایک برس کے لیے رُک سیک کے کسج تنہائی میں چلے جانا تھا اور سفید
 دروازے سے لٹکے ہوئے شیر بہر کے مہاند رے والے ناکر کو اٹھا کر دستک دی..
 ”کون ہے؟“ اندر سے میمونہ کی آواز آئی..

”میں ہوں..“

”میں کون؟“

”میں کیا جانوں، میں کون ہوں.. دروازہ کھولو..“